تصوف اور کشمیری صوفیہ

غوث سیوانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوف
اور
کشمیری صوفیہ

غوث سیوانی

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

نام کتاب: .... تصوف اور کشمیری صوفیہ

مصنف وناشر: .... غوث سیوانی

کمپیوٹر تزئین: .... محمد مکرم ظہیر

اشاعت: ۲۰۱۲ء

مطبع: .... ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

تعداد: .... پانچ سو

قیمت: 275/روپے

ISBN 978-93-81029-41-1

TASAWUF AUR KASHMIRI SUFIA

by

Ghaus Siwani

ڈسٹری بیوٹر:

عرشیہ پبلیکیشنز

A-170, Groun Floor-3, Surya Apartment, Dilshd Colony, Delhi-95

Mobile: 09899706640, 09971775969

E-mail: arshiapublicationspvt@gmail.com

صبر وہ ہے جو مصیبت کی پہلی ٹھوکر لگنے پر کیا جاتا ہے۔

(حدیث)

انتساب

ہر اُس انسان

کے نام جو

محبت

کے لفظ میں

یقین رکھتا ہے۔

مورا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سب تور
تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگت ہے مور

غوث سیوانی

جس قدر کسی کا دل تقویٰ سے قریب ہوگا اسی قدر اس کو یقین بھی حاصل ہوگا۔

(ابن عطا)

فہرست مضامین

پیش لفظ .... (پروفیسر غلام نبی انجم) 21
بہ نام جہاندار 31
تصوف کیا ہے؟ 41
تصوف اور صوفی
صوف
پہلا صوفی
تحریکِ تصوف
صوفی کون؟
تصوف اور فقر 53
فقر کی پانچ حالتیں
فقر کی فضیلت
فقر اربابِ تصوف کی نظر میں
فقر منزل نہیں
تصوف اور مجاہدہ 65
چلہ کشی
نفس کشی
نفس کشی احادیث میں

صوفیہ کے اقوال
نفس پر لگام
مجاہدے کی اہمیت
فاقہ کشی کی فضیلت
مجاہدے کا حاصل
تصوف اور یادِ الٰہی 85
عبادت کا حکم قرآن میں
عبادت حکمِ رسول
عبادت اور صوفیہ
چشتی صوفیہ اور کثرت عبادت
تصوف اور توکّل 101
توکّل قرآن میں
توکّل حدیث میں
توکل صوفیہ کی نظر میں
جنید بغدادی اور ترکِ تدبیر
حضرت عمر اور ترکِ تدبیر
اہلِ تصوف اور ترکِ اسباب
کچھ سوالات
توکّل کے درجات
بابا فرید اور توکّل
محبوبِ الٰہی اور توکّل
علاج اور توکّل

تصوف کی اساس محبت 123

محبت کی تعریف

عشق

صوفیہ کی نظر میں محبت

خالق کی صفات مخلوق میں

محبت آئینہ ہے

محبوب بندے

محبوبیت کی انتہا

محبت اور آخرت

محبت کا انعام

دیدارِ یار

دیدارِ جمالِ خداوندی

صوفیاء اور عشق

محبت کی علامت

تصوف اور بیعت وخلافت 149

بیعت کیا ہے؟

خلافت کیا ہے؟

پیر کی حیثیت

سلاسل طریقت

مشہور سلاسل

سلوک کے فوائد

تصوف کی اصطلاحیں 159

وقت
حال
مقام
تمکین
قبض وبسط
ہیبت وانس
وجد، وجود اور تواجد
جمع اور فرق
فنا اور بقا
غیبت اور حضور
صحو اور سکر
ذوق اور شرب
محو اور ثبات
سر اور تجلّی
محاضرہ، مکاشفہ، مشاہدہ
لوائح، طوالع، لوامع
بوادہ اور ہجوم
تلوین وتمکین
قُرب وبُعد
شریعت وحقیقت
نفس
خواطر

علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین

وارد

شاہد

روح

کشمیر وادئ تصوف

کشمیر (نظم) 203

یہ وادیاں یہ فضائیں 207

وادئ گل ولالہ

پھل اور میوے

چرند و پرند

خلدزار کے مرغزار

برف پوش چوٹیاں

گلپوش وادیاں

دریا، جھیلیں اور چشمے

فردوس برروئے زمیں یا وادئ محبت 219

کشمیری اقوام تاریخ کے آئینے میں 223

کشمیر میں طلوع اسلام اور تصوف کی ابتدائی کرنیں 235

کشمیر میں اسلام

کشمیر میں اسلامی سلطنت

راجہ رنجن کا قبولِ اسلام

پہلا صوفی

تہذیبی انقلاب

شاہ میر کی تاج پوشی

شاہ میر افغانستان سے کشمیر تک

شاہ ہمدان: جنھوں نے کشمیر کو وادیٔ تصوف بنادیا 247

شاہ ہمدان کون؟

مصلح کشمیر

اقتصادی رہنما

امام تصوف

ادیب وشاعر

عظمتِ تصوف کی نشانی، میر سید محمد ہمدانی 259

نفاذِ شریعت

مذہب میں جبر نہیں

علمی کارنامے

وادی کے رشی بزرگ اور شیخ نورالدین رشی 265

مسلمان رشی

للہ عارفہ

رشیوں کی کثرت

شہیدِ کشمیر بابا اویسؒ 273

شاہی گدا

شہادت

محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ 281

ولادت

خاندانی پس منظر

بچپن اور تربیت
خانقاہ شمسی چک میں
روحانیت کی تکمیل
عبادت وریاضت
سوزِ عشق
خدمات
تصنیف
حیاتِ ابدی
محبوب العالم کے ہمعصر صوفیہ 295
میر سید احمد کرمانی
مخدوم حاجی احمد قاری
میر میرک اندرابی
خواجہ طاہر رفیقی
ملا فیروز گنائی
ملا شمس الدین پال
خواجہ عطار گنائی
خواجہ عثمان کول
سید مبارک خاں بیہقی
بابا علی دیگ شو
دیگر مریدین وعقیدت مند
محبوب العالم کے چند باکمال خلفاء 313
حضرت میر بابا حیدر تولہ مولی

امام اعظمِ ثانی بابا دوؤ دخا کی

ماہرِ قرأتِ سبعہ خواجہ حسن قاری

امام العارفین خواجہ اسحٰق قاری

خواجہ میرم بزاز سکندر پوری

مولوی شیخ احمد چاگلی

دو با کمال رشی بزرگ، روپی رشی وہردی رشی 329

عمدۃ الصلحاء بابا محمد علی رینہ 335

ماہرِ علم ظاہر و باطن شیخ یعقوب صرفی 341

صاحبِ مقاماتِ عالی حضرت بابا علی والی 349

صوفی اور غازی

کشمیر میں طریقتِ نقشبندیہ کی ابتدائی کرنیں 355

عبدالاحد فاروقی کشمیر میں

سلسلہ نقشبندیہ کی خصوصیات

طریقتِ نقشبندیہ اور حضرتِ ایشان 365

حضرتِ ایشان کشمیر میں

اصلاحی کام

حضرتِ ایشان کے خلفاء 371

خواجہ عبداللہ بانڈے

ملا یوسف ترکی

ملّا مشربی

معین شریعت و طریقت 377

فیضان

حضرت معین الدین نقشبندی کے فیض یافتگان.......................................383

اخوند ملا طیب

ملا عبد الرحیم

خواجہ حیدر ٹنٹو

خواجہ ابوالفتح کلو

مولانا عبد الحکیم

نوربخشیہ سلسلہ اور شیخ شمس الدین.......................................389

غریق توحید الٰہ آخوند ملاّ شاہ.......................................395

داراشکوہ و ملاّ شاہ

طریقۂ اصلاح

ولی رام اور ملاّ شاہ

نظریۂ وحدت الوجود اور ملاّ شاہ

صلح کل کا رویہ

سیاسی اثرات

میدانِ تصوف کے تین شہسوار.......................................403

مولانا جوہر نانت

بابا نصیب الدین غازی

بابا داؤد مشکوتی

صوفیٔ باکمال خواجہ شاہ نیاز نقشبندی.......................................409

شاعری کا انداز

عارفِ خالق شاہ محمد صادق.......................................415

شعر گوئی

کشمیری معاشرے پر تصوف کے اثرات 421

افکارِ اقبال پر تصوف کے اثرات 439

شاعری کی ابتدا

شاعری کی شہرت

اقبال اور تصوف

اقبآل کا تصوف

عشق اور اقبآل

اقبآل اور رومؔی

کشمیری برہمن شعراء کے کلام میں رنگِ تصوف 449

برہمؔن

نسیمؔ

کیفؔی

زارؔ

چکبستؔ

ملاؔ

□❖□

جس طرح انسان عافیت کے ہوتے ہوئے اپنی حالت پر ثابت قدم رہتا ہے
اسی طرح اچھے آداب کے ساتھ مصیبت پر ثابت قدم رہنا صبر کہلاتا ہے۔

(قشیری)

مثالِ پرتوِ مے طوف جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح وشام کرتے ہیں
خصوصیت نہیں اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

اقبالؔ

پیش لفظ

پروفیسر غلام یحیٰ انجم

صدر شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

ہندستان صوفی سنتوں اور رشیوں، منیوں کا ملک ہے۔ بنگال کی کھاڑی سے لے کر کنیا کماری تک، ہندستان کی ایک سرحد سے لے کر دوسری سرحد تک جتنے صوفیاء ومشائخ، اولیاء کرام اور بزرگان دین آسودۂ خواب ہیں انکی تفصیل کہیں دستیاب نہیں۔ اہل قلم نے زمانے اور علاقے کی سطح پر ان مشائخ کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ بعض قلم کاروں نے ان مشائخ کے سلاسل کو موضوع قلم بنایا ہے۔ اس تعلق سے کتابیں لائبریریوں اور کتب خانوں میں مل جاتی ہیں۔ صوفی کسی علاقے کا ہو، کوئی سی زبان بولنے والا ہو اور کسی بھی سلسلے سے وابستہ ہو، ایک چیز جو سب میں

قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے، وہ بندوں سے خدا کا رشتہ استوار کرنا، انکے دلوں سے نفرتوں اور کدورتوں کو دور کر کے خدا اور سول کی محبتوں سے شاد وآباد کرنا ہے۔ یہی احسان ہے جس کا ذکر حدیث جبرئیل میں ملتا ہے اور اسی کو تزکیۂ نفس کہتے ہیں، جسے پیغمبر اسلام احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت کے بنیادی مقاصد ویزکیھم کے ذریعہ شمار کرایا گیا ہے۔ اسی نبوی مشن کی ترویج واشاعت میں صوفیاء ومشائخ زندگی بھر لگے رہے اور وابستگان، مریدین، متوسلین کو مزکی ومصفی بنانے کی ہر ممکن جدوجہد کرتے رہے۔ بندگانِ حق کو اوامر کا پابند بنانا اور نواہی سے دور رکھنا ان حضرات کی زندگی کا نصب العین اور جدوجہد کا مقصد اولین تھا۔ اسی مقصد کے فروغ کے لئے پہلے تو ان حضرات نے اپنی اصلاح فرمائی، مجاہدے کئے، ریاضتیں کیں، اور عبادتوں کے ذریعے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ہر ممکن جدوجہد فرمائی۔ ان محاسن سے اپنے آپ کو آراستہ کرنے کے بعد ان مشائخ نے پھر بندگان حق کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ہر اس تعلیم اور فکر سے انھیں وآراستہ کرنے کی کوشش کی، جس سے اخوت اور بھائی چارہ، عدم تشدد، پیار ومحبت، امن وشانتی اور صلح وآشتی کی فضا ہموار ہو۔ یہ ان نفوسِ قدسیہ کی شبانہ روز مساعی اور تعلیمات کا ہی ثمرہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج لوگ انکی بارگاہوں اور خانقاہوں میں نیازمندانہ انداز میں خمیدہ سر نظر آتے ہیں، اور جو کیف وسرور اور اطمینان وسکون انھیں وہاں ملتا ہے، وہ ہزاروں درہم ودینار خرچ کرنے کے بعد بھی انھیں میسر نہیں آتا۔ اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ بندہ وہاں پہونچنے کے بعد ذکر واذکار کے ذریعے اپنے کو خدا کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور قرب الٰہی میں جو سکون ہے اسکی شہادت قرآن کریم 'الا بذکر اللہ تطمئن القلوب' سے دیتا ہے۔ اسی سکون قلب کی خاطر صوفیہ اور مشائخ نے زندگی بھر تصوف کا پرچم بلند رکھا۔ یوں تو تصوف کی تشریحات میں ترک دنیا، خواہشات نفس کی مخالفت، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب، توکل، رواداری، انسان دوستی وغیرہ وغیرہ سب کچھ شامل ہے، لیکن ان سب کا مقصود وہی ہے جو سطور بالا میں بیان ہوا۔ اسی مقصد کی تبلیغ واشاعت کے لئے صوفیہ ومشائخ کے قافلے ہندستان کی سرزمین پر مختلف ممالک سے اترے اور ہندستان کی مرکزی جگہوں کو تبلیغی واشاعتی سرگرمیوں کے لئے منتخب کیا۔ ان صوفیہ ومشائخ

میں قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ ہر سلسلے سے وابستہ افراد تھے۔ خواجہ غریب نواز سیدنا شیخ معین الدین چشتی اجمیری اور فرزند غوثِ اعظم قطب الہند سیدنا سیف الدین عبدالوہاب جیلانی نے راجستھان، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور سیدنا سید محمد امجھری نے بہار، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور قاضی حمید الدین ناگوری نے دہلی، سیدنا سالار مسعود غازی اور سیدنا مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی نے اتر پردیش، داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے پنجاب، بابا تاج الدین ناگپوری اور مخدوم مہائمی نے مہاراشٹر، حضرت جلال الدین بخاری اور حضرت قمیص قادری نے بنگال، حضرت میاں رمضان شاہ اور حضرت میاں راج شاہ نے ہریانہ، حضرت غوث گوالیاری اور خواجہ خانون نے مدھیہ پردیش، حضرت شیخ شرف الدین بلال عرف بلبل شاہ، حضرت میر سید علی ہمدانی، مخدوم العالم مخدوم حمزہ رینہ اور شیخ العالم نورالدین رشی نے خطہ کشمیر کو اپنی جہد مسلسل اور مجاہدانہ تگ ودو سے نہ صرف اسلام کی روشنی سے بقعۂ نور بنادیا بلکہ پیار و محبت اور آپسی بھائی چارہ کا گہوارہ بھی بنایا۔ جب تک یہ حضرات اپنی ظاہری حیات کے ساتھ دنیا میں رہے ایک گھاٹ پر شیر اور بکری کے پانی پینے کا ماحول رہا۔ ان حضرات کے پردہ فرماتے ہی لوگوں کے دل میں محبتوں کی جگہ نفرتوں نے لے لی۔۔ جس طرح زمانے سے دور ہوتے گئے امن وشانتی اور پیار و محبت کا جو پیغام انھوں نے دیا تھا لوگوں نے فراموش کردیا۔ صلح وآشتی کی جگہ دہشت گردی نے لے لی۔ پیار و محبت کو نفرتوں نے دبوچ لیا۔ ایک انسان دوسرے انسان کے لئے کسی زمانے میں مسیحا ہوا کرتا تھا آج وہی انسان عدو مبین (کھلا دشمن) بنا ہوا ہے۔ کہیں ذات پات کا بھید بھاؤ، کہیں مسلکی اختلافات، کہیں خاندانی بالادستی، کہیں باہمی منافرت، کہیں رشوت ستانی، کہیں عیاشی وفحاشی اور کہیں شراب خوری وقمار بازی نے صوفی سنتوں کے ہندستان کو تہس نہس کر ڈالا ہے۔ ہندستان کے معاشرتی حسن کو بحال کرنے کے لئے آج کے دور میں جب کہ مادیت نے انسانوں کو بری طرح اپنے پنجے میں دبوچ رکھا ہے۔ اس صوفیہ اور مشائخ کی روحانی تعلیمات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جناب غوث سیوانی نے اس طرف کوشش کی اور ''تصوف اور کشمیری صوفیہ'' کے عنوان سے صوفیہ ومشائخ کے پیغام کو عام

کرنے کے لئے ہندستان کی خوبصورت ریاست کشمیر جنت نظیر کے صوفیہ ومشائخ کا انتخاب کیا، اورانکا یہ انتخاب قابل ستائش اس لئے ہے کہ یہ ہندستان کی واحد ریاست ہے جسکی خوبصورتی اور رعنائی وزیبائی دنیا بھر میں ضرب المثل ہے۔ بقول شاعر

اگر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

یہ ریاست ہمالیہ کے کوہستانی علاقے میں واقع ہے، جس کے شمال میں تبت، لداخ۔ جنوب میں جموں، پونچھ۔ شرق میں دراس اور غرب میں دراد پھلکی اور ہزارہ آباد ہیں۔ کشمیر دو لفظوں سے مرکب ہے، ایک کس اور دوسرے میر۔ کس اور میر پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یعنی نالوں اور پہاڑوں کا شہر۔ کشمیر کی وجہ تسمیہ کے تعلق سے جتنی روایتیں بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اس ریاست کی وجہ تسمیہ کے تعلق سے کتنے اختلافات کیوں نہ ہوں، لیکن اس ریاست کی سرسبزی وشادابی اور حسن وخوبصورتی پر سب کا اتفاق ہے۔ اسکا اعتراف قدیم زمانے کے اہل علم نے بھی کیا ہے۔ محمد الدین قادری نے اپنی کتاب 'روضۃ الابرار' میں سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت سیدنا شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) سے منسوب ایک قطعہ درج کیا ہے۔

کانت الکشمیر وساکنہا جنات عدن ھی للمومنین

قد کتب اللہ علیٰ بابہا ساکنہا کان من الآمنین

(کشمیر مومنوں کے لئے جنت ہے اور اس کے باشندے مامون ہیں)

اسی خوبصورتی اور سرسبزی وشادابی کے باعث امراء وسلاطین کی نظریں اس ریاست کی طرف اٹھیں۔ مسلم فاتحین بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہے۔ ایک روایت کے مطابق دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی میں ہی کشمیر کے کچھ حصوں پر مسلم سلاطین کا قبضہ ہوگیا تھا۔ روایتوں میں ملتا ہے کہ ہشام بن عمر تغلبی (بعد ۱۵۷ھ / ۷۷۳ء) کو خلیفہ منصور نے جب سندھ کا والی مقرر کیا تو اس نے بھی کشمیر پر حملہ کیا اور کوہستانی ہمالیہ کے جنوبی دامن تک پہنچ گیا نیز

مشہور مورخ البلاذری کے قول کے مطابق اس نے کشمیر فتح کرلیا۔ وہ لکھتا ہے:

وجه الیٰ جنت الهندفافتح قشمیرا

(وہ ہندستان کی جنت کشمیر کی طرف متوجہ ہوا اور اسے فتح کرلیا)

(فتوح البلدان، ص ۴۳۱)

دوسری صدی ہجری میں کس طرح مسلم فاتحین یہاں پہنچے اور کیا کارنامے انجام دیئے، اسکی وضاحت کرتے ہوئے تاریخ مشائخ قادریہ کے مصنف لکھتے ہیں:

''آٹھویں صدی عیسوی میں اگرچہ پورے صوبے پر نہیں لیکن بعض حصوں پر مسلم حکمراں پوری طرح قابض ہو چکے تھے اور انکی اس ریاست میں آمدورفت سے اسلامی قدریں پھیلنی شروع ہوگئی تھیں۔ چونکہ اس دور کے مسلمانوں کو کسی ملک کے سفر میں اپنی اسلامی تہذیب وتمدن کو فروغ دینے کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا، اس لئے مسلمانوں کی آمدورفت سے کشمیر میں اسلامی تہذیب نہ پھیلی ہو یہ یقین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قدیم مسلم سلاطین کی تاریخ رہی ہے کہ جب کوئی مسلم فاتح کسی ملک پر اپنی فتح وکامرانی کا پرچم بلند کرتا تھا تو اس فتح وکامرانی میں اس کی اپنی ذاتی کوششوں کا عمل دخل ضرور ہوتا تھا، لیکن ان فوجوں میں اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے بھی ہوتے تھے، جن کی روحانی برکتوں سے فتح وکامرانی مسلم سلاطین کا مقدر بن جایا کرتی تھی۔ ان اللہ کے برگزیدہ بندوں کی فوجوں میں شمولیت اس لئے ہوتی تھی. تاکہ فتح وکامرانی کے بعد کفر وشرک کے دلدل میں پھنسے اللہ کے بندوں کو توحید الٰہی کے پرچم تلے لائیں۔ اشاعت دین حق سے متعلق ان کا یہ داعیانہ عمل ملک پر فتح وکامرانی کا پرچم بلند کرنے کے بعد شروع ہوجایا کرتا تھا۔''

(تاریخ مشائخ قادریہ، جلد سوم، ص ۴۲۵)

مذکورہ عبارت کی تائید حافظ عماد الدین ابن کثیر (م۱۳۷۲ء) کی اس تحریر سے ہو جاتی ہے۔ وہ اموی افواج اور انکی فوجی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وکان فی عساکرهم وجیوشهم فی الغزو الصالحون والاولیاء والعلماء من کبار التابعین فی کل جیش منهم شرذمة عظیمة ینصر الله بهم دینه''

(امویوں کی افواج وعساکر میں جنگ کے دوران اولیاء صالحین اور علماء ہوتے تھے۔ ہر فوجی دستے میں ان بزرگوں کی ایک بڑی جماعت ہوتی تھی، جن کی بدولت اللہ اپنے دین کو کامیابی عطا کرتا تھا۔)

(البدایہ والنہایہ، جلد۹ ،ص ۸۷)

کشمیر میں مسلم فاتحین کا دخول اور اس کے بعض حصوں پر ان کا تسلط اگر چہ آٹھویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا، لیکن اسلام کو برتری اسے تیزی سے پھیلنے کا موقع اس وقت ملا جب کشمیری غیر مسلم سلطان رینچن نے چودھویں صدی عیسوی میں بطیب خاطر اسلام قبول کرلیا اور اس کے اسلام قبول کرتے ہی کئی اور سلاطین یکے بعد دیگرے مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ رینچن سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ شرف الدین بلال عرف بلبل شاہ کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس بادشاہ کو بدھ مذہب سے تھوڑی بہت ذہنی ہم آہنگی ضرور تھی، لیکن باقاعدہ طور پر کسی دوسرے مذہب کو اپنانے کی فکر میں ہمیشہ رہتا تھا، اسی وجہ سے ہر مذہب کے علماء اور دانشوروں سے ان کے مذہب کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہتا تھا اور اسکی اچھائیاں اور برائیاں جاننے کی کوشش کرتا مگر وقت کا المیہ یہ رہا جتنے لوگ اس سے ملے، وہ اپنے گفتار اور کردار سے اسے مطمئن نہ کر سکے۔ اسی کرب واضطراب میں اس کی روح بے چین رہتی۔ صراط مستقیم کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتا۔ مختلف مذاہب کے لوگوں سے گفت وشنید کے بعد جب کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اس نے بالآخر:

''اس شخص کا مذہب ماننے کا فیصلہ کرلیا جسے صبح کو وہ دیکھے گا پہلا شخص

جو اس کے سامنے آیا وہ بلبل شاہ تھا، جو عبادت میں مصروف تھا۔ وہ فوراً
اس کے پاس گیا اور اس کے مذہب کے خالص اصول دریافت کئے اور
پھر انھیں قبول کرلیا۔''

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، ص ۵۵)

حضرت بلبل شاہ کے بعد کشمیر میں صوفیہ کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا اور متعدد سلاسل کے مشائخ نے کشمیر کی سرزمین کو اسلام کی نشر واشاعت کے لئے موزوں سمجھا اور اپنے احباب ومتعلقین اور خانوادے کے افراد کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔ سید تاج الدین ہمدانی، انکے فرزند حضرت سید حسن بہادر، حضرت سید حسین سمنانی اور پھر سید میر علی ہمدانی نے آکر کشمیر کو اسلام کی نشر واشاعمت کا مرکز بنادیا۔ اس طرح چودھویں صدی آتے آتے کشمیر کی سرزمین پر چھ سلاسل پائے جانے لگے۔ قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، کبرویہ، نوربخشیہ اور رشی سلسلے۔ اول الذکر پانچ سلاسل تو ایران وترکستان سے یہاں پہنچے، مگر موخر الذکر سلسلہ رشی کشمیر ہی کی پیداوار ہے۔ اس سلسلے کا خمیر یہیں تیار ہوا اور یہیں پروان چڑھا اور بچپن کے مراحل سے گزر کر یہیں جوان ہوا، پھر تناور درخت کی شکل اختیار کر کے برگ وبار لانے لگا۔

لفظ رشی 'رکھی' سے ماخوذ ہے۔ رکھی سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنیٰ تارک الدنیا اور یاد خدا میں مشغول رہنے کے ہیں۔ رشی سے مراد وہ شخص ہے جو اپنا گھر بار چھور کر کسی غار میں بیٹھ کر عبادت الٰہی میں مصروف رہے۔ ریشیان کشمیر کی طویل فہرست ہے، جن میں شیخ نورالدین رشی، بابا پیام الدین رشی اور للہ عارفہ قابل ذکر ہیں۔ اس طرح رشی مشائخ اور دوسرے سلاسل سے وابستہ افراد نے خلوص ومحبت اور بھائی چارہ، امن وشانتی، صلح وآشتی اور انسانیت وہمدردی کا جو پیغام اللہ کے بندوں کو دیا۔ اس کا اثر کافی دنوں تک رہا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری مسلمانوں کو ان مشائخ واولیاء کرام سے جو عقیدت ومحبت ہے اس کا صحیح اندازہ آج بھی ان اللہ والوں کی زیارت گاہوں پر عقیدت مندوں کے ہجوم سے لگایا جاسکتا ہے۔

میں مبارکباد دیتا ہوں جناب غوث سیوانی کو کہ انھوں نے اس مادیت کے دور میں

روحانیت کا پرچم بلند کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ''تصوف وکشمیری صوفیہ'' کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھ کر کشمیری صوفیہ اور رشیوں کی جناب میں جو خراج تحسین پیش کیا ہے وہ قابل ستائش اور لائق تقلید ہے۔ یہ کتاب کئی لحاظ سے انتہائی اہم ہے۔ کتاب کے نصف اول میں تصوف کی حقیقت اور اس کی بنیادی باتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، جو عام فہم اور تصوف کی ماہیت کو سمجھنے میں مددگار ہے۔ تصوف کے دقیق مسائل کو سمجھنے میں عوام کو مشکل ہوتی ہے مگر اس کتاب کے ذریعے تصوف کی ان باتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جو عام لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور اگر انھیں اپنی زندگی میں اپنالیں تو تعمیر سیرت میں مدد ملے۔ مصنف نے سب سے پہلے تو اسی بات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تصوف کیا ہے؟ اور تصوف کے بارے میں خود صوفیہ کیا سوچتے ہیں؟ اسکے بعد تصوف کی بنیادی باتوں کو اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ عام آدمی کی سمجھ میں آسکے۔ مثال کے طور پر فقر، مجاہدہ، توکل، یادالٰہی کے موضوع پر مدلل اور مفصل مضامین ہیں۔ اسی طرح ایک مضمون میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ محبتِ الٰہی تصوف کی اساس ہے اور ہر جدوجہد کا سبب یہی محبت ہے۔ علاوہ ازیں بیعت وخلافت کے سلسلوں کی کیا حقیقت ہے؟ نیز صوفیہ کی محفلوں میں سماع کا رواج رہا ہے، اس کے بارے میں خود صوفیہ کا کیا خیال ہے؟ کئی بار عام قارئین کو تصوف کی اصطلاحات سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اس مشکل کو آسان کرتے ہوئے معتبر کتب کے حوالوں کے ساتھ صوفیانہ اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے۔ کتاب کے نصف ثانی میں کشمیر میں اسلام اور تصوف کے بارے میں تفصیلات ہیں، جو دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ اسی کے ساتھ اس بات کو بھی سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہاں صوفیہ نے صرف اسلام اور تصوف کی اشاعت ہی نہیں کی، انھوں نے کشمیر کی تہذیب، زبان، معاشرت اور معیشت کو بھی متاثر کیا اور ہر سطح پر صوفیہ نے اپنے اثرات ڈالے۔ یہاں تک کہ آج جو کشمیر کی پہچان ہے وہ صوفیہ کی عطا کردہ ہے۔ کشمیر کی موجودہ صنعت وحرفت اور تہذیب وتمدن اُن اللہ والوں کی مرہونِ منت ہے جن کی زندگی کا اک اک لمحہ خدمتِ خلق کے لئے وقف تھا۔

آج جب کہ ہر طرف دنیا گردی کا ماحول ہے ارضوت ستانی کا بازار گرم ہے

،انسانیت کا جنازہ نکل رہا ہے،عریانیت وفحاشی کا غلغلہ ہے،چھوٹے بڑے کی تمیز ختم ہو چکی ہے، پیار ومحبت کی جگہ نفرتوں نے لے لیا ہے،نئ تہذیب نے ہر گھر کو محاذ جنگ میں تبدیل کر رکھا ہے۔ایسے ماحول میں ان اللہ والوں کے پیغام اور انکی تعلیمات عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔یہ سلسلہ علاقائی سطح پر جناب غوث سیوانی نے شروع کر دیا ہے۔چراغ سے چراغ جلنے کی روایت بہت قدیم ہے۔مجھے امید ہے کہ اہل قلم اس طرف توجہ فرمائیں گے،اور جنھیں جن علاقوں سے دلچسپی ہے ان علاقوں کے مشائخ،صوفیاء اور انکی تعلیمات کو عام وتام کرنے کی جدوجہد فرمائیں گے۔اس لئے کہ اس دور میں دیکھا یہ گیا ہے کہ روحانی سکون انھیں خانقاہوں ہی میں ملتا ہے۔اس لئے بلاتفریق مذہب وملت عوام جوق در جوق انھیں آستانوں کی جبیں سائی کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ایک بار پھر میں مصنف کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا بھی کرتا ہوں کہ اللہ مصنف کی کاوش کو قبول عام کا درجہ عطا فرمائے۔آمین بجاہ سید المرسلین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

غلام یحیٰ انجم

مجھے پھونکا ہے سوز قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں
صدائے لن ترانی سن کے اے اقبالؔ میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

اقبالؔ

بہ نامِ جہاندارِ جاں آفریں......

دل کیوں دھڑکتا ہے۔۔شعلہ کیوں بھڑکتا ہے۔۔چوٹ کیوں لگتی ہے۔۔آہ کیوں نکلتی ہے۔۔ جذبات کیوں مچلتے ہیں۔۔آنسو کیوں ابلتے ہیں۔۔ساون کیوں برستا ہے۔۔پھول کیوں مہکتا ہے۔۔ندیاں کیوں گنگناتی ہیں۔۔ہوائیں کیوں سنسناتی ہیں۔۔کلیاں کیوں مسکراتی ہیں ۔۔چڑیاں کیوں چہچہاتی ہیں ۔۔سبزے کیوں لہلہاتے ہیں ۔۔آبشار کیوں گنگناتے ہیں۔۔سورج کیوں ڈھلتا ہے۔۔چاند کیوں نکلتا ہے۔۔ستارے کیوں چمکتے ہیں۔۔سیارے کیوں دمکتے ہیں۔۔صبح کیوں آتی ہے۔۔شام کیوں جاتی ہے۔۔لہریں کیوں اچھلتی ہیں۔۔ نہریں کیوں مچلتی ہیں۔۔؟

کبھی سوچا ہے......................

رنج وغم ہیں کس کی جانب سے خوشی دیتا ہے کون
موت کس کے ہاتھ میں ہے زندگی دیتا ہے کون

کس کے منشا سے تبسم ریز ہوتی ہے کلی
پھول کو دل لوٹنے والی ہنسی دیتا ہے کون
کون پت جھڑ کو بنا دیتا ہے موجِ رنگ و بو
خشک موسم کو قبائے تازگی دیتا ہے کون
آسماں پر کس نے تانی ہے ردائے کہکشاں
کہکشاں کو یوں جمال و دلکشی دیتا ہے کون
؟

جی ہاں! تمام قوتوں کا محور، تمام طاقتوں کا مرکز بس ایک ذات ہے اور اسی کے عرفان کی راہ کو تصوف کہتے ہیں۔ اس ذات وحدہ لاشریک کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، مگر مقصود ایک ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب اسی حقیقتِ منتظر کے عرفان کے لئے وجود میں آئے۔ اس کے بندے اسکی تلاش و جستجو میں ڈگر ڈگر، نگر نگر، صحرا صحرا اور دشت و دمن میں سرگرداں پھرے۔ کسی نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی تو کسی نے ہر ہر مہادیو کے نعرے لگائے، کسی نے حرم کی راہ لی تو کوئی سوئے دیر گیا، کسی نے احرام باندھا تو کسی نے زنار پہنا، کسی نے سیماھم فی وجوھھم کا نور چہرے پہ سجایا تو کسی نے قشقہ کھینچا۔ جام حقیقت کے متوالوں نے دنیا و مافیہ ہی نہیں بلکہ خود اپنے وجود سے بھی بیگانگی اختیار کر لی اور خود کو مست مئے الست کر لیا۔ بحرِ عشق کے ان سیاحوں کی منزل ساحل نہیں گرداب تھی، کنارہ نہیں طوفان تھی۔

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

فنا کی اس کیفیت نے انھیں عشق میں توحید کے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں ہر طرف جلوۂ وحدت نظر آتا ہے۔ اسی مغلوبیت نے بعض سے انا الحق کہلوایا تو بعض کو دار پر کھینچا۔ کسی کی کھال کھینچوائی تو کسی کی آبرو کو سرِ بازار اچھالا۔ فنا کی انتہا سالک کا مقصود ہے لہٰذا ان صعوبتوں نے ان کے جذبے کو مہمیز کیا اور آخر کار وہ اس مقام پر پہنچے جس کے لئے کہا جاسکتا ہے۔

ہم تم سامی ایک ہیں، کہن سنن کو دوے
من کو من سے تولئے، دومن کبھی نہ ہوئے

عرفانِ حقیقت کا خواب انسان مختلف رنگوں میں دیکھتا رہا ہے۔اس کی جھلک مذہب ہی نہیں، شاعری، آرٹ، فلسفہ وسائنس ہر جگہ دیکھنے کوملتی ہے۔سب نے اپنی بساط کے مطابق اس حقیقت کوسمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، مگر تصوف اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔فلسفہ جہاں دلیل وحجت، ثبوت وبرہان کی بنیاد پر گفتگوکرتا ہے، وہیں تصوف کواس کے لئے کسی دلیل وحجت کی ضرورت نہیں بلکہ بغیرثبوت وبرہان کے یہاں حقیقت کوتسلیم کرلیا جاتا ہے۔سبب یہ ہے کہ دلیل کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت نظر سے پوشیدہ ہو مگر جب حقیقت کا مشاہدہ ہوجائے تو ثبوت کی کیا ضرورت؟ فلسفہ کے لئے دماغ کی حاجت ہے مگر تصوف کے لئے دل کی۔عقل کا استعمال منزل سلوک کے مسافروں کے لئے ممنوع ہے، یہاں دل کی ضرورت ہے۔یہاں عشق کی ضرورت ہے۔یہاں وارفتگیٔ شوق کی ضرورت ہے۔یہ راستہ عقل نہیں عشق کی رہنمائی میں طے ہوسکتا ہے۔

بےخطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوتماشائے لبِ بام ابھی

ادراک حقیقت کی کوشش مختلف مذاہب میں ہوتی رہی ہے۔ترک وتجرد، فقرواختیار، یوگ وسنیاس اور دیگر راستے اس کے لئے اپنائے جاتے رہے ہیں۔اسلام کا مقصد بھی خالق ومخلوق کے درمیان ربط پیدا کرنا ہے اوراس کے لئے جن لوگوں نے روحانی تحریک چلائی انھیں 'صوفی' کہا گیا، جبکہ اس تحریک کو'تصوف' کہتے ہیں۔تصوف کو پوری دنیا میں پذیرائی حاصل ہوئی۔خصوصاً اس لئے بھی کہ اس کے ضابطے سادہ تھے۔اس کی بنیاد محبت، بھائی چارہ، خدمت خلق اورعدم تشدد پر رکھی گئی تھی۔عرب، عراق، شام، ایران، وسط ایشیاء اور ہندستان تک اس کے اثرات پھیلے اوران خطوں میں لاکھوں افراد سلاسل تصوف سے منسلک ہوئے۔بعد کے زمانے میں جہاں جہاں اسلام پہنچا، وہاں وہاں تصوف بھی پہنچا، بلکہ بیشتر علاقوں میں صوفیہ کے ذریعے

ہی اسلام پہنچا۔انڈونیشیا اور ملیشیا کے جزائر نیز تبت و نیپال کے بعض علاقے اسی زمرے میں آتے ہیں۔

عہد حاضر مادہ پرستی کا دور ہے۔دنیاوی جاہ حشمت اور مادی منفعت کے لئے انسان، انسان کا خون چوس رہا ہے۔اخلاقی زوال اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔جن رزیل حرکات کا ارتکاب حیوانات سے بھی ممکن نہیں تھا، وہ انسان کر رہا ہے۔ذہنی آسودگی وسکون کا فقدان ہے۔انسان ایک ایسے ماحول میں جی رہا ہے جہاں کرب ہی کرب ہے۔درد ہی درد ہے۔ایسے میں اگر کوئی تحریک اسے ذہنی آسودگی اور دلی اطمینان فراہم کرسکتی ہے تو وہ تصوف ہے۔مغربی ممالک میں مادہ پرستی کا زور کچھ زیادہ ہے۔اطمینان قلب سے عوام محروم ہیں۔لاکھوں افراد ذہنی سکون کے لئے شراب، منشیات اور دیگر قسم کی دواؤں کا سہارا لیتے ہیں۔اس کربناک ماحول کے سبب ہر روز لاکھوں جرائم ہو رہے ہیں۔ایسے میں تصوف سکون سے محروم دلوں کو قرار فراہم کرسکتا ہے۔اخلاقی طور پر زوال پذیر معاشرے کو دوبارہ حمیدہ صفات سے متصف کرسکتا ہے۔

عہد حاضر کا ایک بڑا مسئلہ تشدد اور ہنسا ہے۔ایک طرف جہاں ایک انسان اپنے ہم جنس کے ساتھ پرتشدد برتاؤ کرتا ہے، وہیں طاقتور ممالک، ترقی پذیر یا پسماندہ ملکوں کے ساتھ پرتشدد رویہ جائز رکھے ہوئے ہیں۔اس تشدد پسندی نے ماضی میں عالم انسانیت کو جس کرب سے دوچار کیا ہے اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔مگر موجودہ دور میں بھی دنیا دیکھ رہی ہے کہ انسانی جانیں کس بے دردی کے ساتھ ضائع ہو رہی ہیں۔ہلاکت خیز حملے گاؤں، قصبات اور شہروں کو قبرستان میں تبدیل کر رہے ہیں۔مجرم اور معصوم کی تفریق کے بغیر ہر کوئی ان حملوں کی زد میں ہے۔ان تمام مسائل کا قابل قبول حل تصوف کے پاس موجود ہے۔آج اگر انسان روحانیت کی طرف چلا آئے تو سماج کو تشدد سے پاک کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔صوفیہ کے ہاں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ انسان ہی نہیں تمام جانداروں کی جانیں بھی قابل احترام ہیں۔وہ بھی اسی خالق کی مخلوق ہیں جس کی مخلوق انسان ہے۔بعض اہل تصوف راستے سے گزرنے کے لئے کتے کو پہلے راستہ دے دیتے تھے اور خود بعد میں گزرتے تھے۔جہاں ایک معمولی جانور کا اس قدر احترام کیا جاتا ہو

،وہاں انسانی جان کی حرمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔صوفیہ کا نظریہ ہے۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

تصوف ماضی میں ایک بڑی تحریک کے طور پر ابھر چکا ہے۔نیل کے ساحل سے خاک کاشغر تک اسکی حکمرانی رہی ہے۔عرب وعجم میں اس کی سطوت کے پرچم بلند رہے ہیں۔وسط ایشیا سے جزائر ملیشیا وادونیشیا تک اس کا دور دورہ رہا ہے۔مشرق ومغرب میں اس کا غلغلہ رہا ہے۔ تصوف، انسانی معاشرے کا حصہ رہا ہے۔ہماری تہذیب وثقافت کا حصہ رہا ہے،اور یہ جزولاینفک کی طرح ہماری زندگی سے جڑا رہا ہے۔یہی سبب ہے کہ آج بھی ہمارے سماج،زندگی،شاعری،آرٹ وکلچر پر کہیں نہ کہیں اس کے اثرات ضرور نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر،قمری مہینوں کے عربی نام کتابوں میں درج ہیں مگر آج بھی گاؤں کی خواتین بعض مہینوں کے نام اس طرح لیتی ہیں،بڑے پیر کا مہینہ،مدار صاحب کا مہینہ،خواجہ صاحب کا مہینہ۔اور شاید سموار کو پیر کا دن بھی ایسی ہی کسی مناسبت سے کہتے ہیں۔غرضیکہ برصغیر ہی نہیں ایشیا کے بیشتر ممالک،افریقہ کے بڑے خطے اور یورپ کے کئی ملکوں پر تصوف نے بڑے گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں،جن پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

برصغیر ہمیشہ سے صوفیہ کا مسکن رہا ہے۔یہاں کے باشندوں کی جبلت میں ہی روحانیت شامل ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب یہاں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی اور تصوف نے برصغیر میں قدم رکھا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ابتدا میں یہاں آنے والے صوفیہ ایران اور وسط ایشیا سے یہاں آئے تھے مگر چراغ سے چراغ روشن ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں لاکھوں افراد نے اس نظریے کو قبول کرلیا۔اس بات کو تصوف کے مخالفین بھی قبول کرتے ہیں کہ اس خطے میں ایمان وایقان کا اجالا انھیں اہل دل کے اثرات کا نتیجہ ہے۔سب سے بڑا کرشمہ تو کشمیر میں دیکھنے کو ملتا ہے،جہاں اسلام وتصوف دونوں تاخیر سے مگر ساتھ ساتھ پہنچے اور یہاں تصوف نے نہ صرف روحانی بلکہ سیاسی،سماجی،ادبی،معاشی اور تہذیبی انقلاب برپا کردیا۔کشمیر کو اگر وادئ تصوف یا خطۂ

روحانیت کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔

کتاب ''تصوف اور کشمیری صوفیہ'' روحانیت اور تصوف کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ راقم الحروف کو ہندستانی تاریخ کے تہذیبی پس منظر میں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، یہ کتاب بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ مجھے کشمیر کی تاریخ کے تعلق سے کچھ عرصہ قبل تک کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر معروف فلم ساز وہدایت کار مظفر علی (امراؤ جان کے فلمساز) نے تصوف اور کشمیر کے موضوع پر کچھ مضامین لکھنے کی فرمائش کی۔ ظاہر ہے لکھنے سے قبل پڑھنا ضروری ہے، للہذا میں نے پڑھنا شروع کیا اور میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کشمیر اور کشمیری صرف ظاہری حسن سے ہی آراستہ نہیں ہیں بلکہ وہ روحانی اعتبار سے بھی حسین وجمیل ہیں۔ ظاہری اور باطنی خوبصورتی کا بہترین امتزاج صرف اس وادیٔ روحانیت میں ہی دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ اس کتاب میں پہلے تو تصوف کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے بعد کشمیری صوفیہ کے حالات زندگی، خدمات اور ان کے اثرات کا اجمالی جائزہ ہے۔ ظاہر ہے اس کتاب میں تمام کشمیری صوفیہ کے حالاتِ زندگی کو پیش کرنا ممکن نہیں تھا، اس کے لئے تو ایک دفتر کی ضرورت ہے للہذا جن اہل تصوف اور رشیوں کی خدمات نمایاں ہیں صرف انھیں کا تذکرہ ہو پایا ہے۔ ساتھ ہی اس جنت ارضی کا مختصر تعارف اور تاریخی پس منظر بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ کتاب کے اخیر میں علامہ اقبال اور ہندو کشمیری شعراء کی شاعری پر مضامین شامل ہیں۔ یہ اس لئے کہ انکی شاعری پر تصوف کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو کشمیری ہونے کے باوجود کشمیر سے دور دور رہے مگر اثرات اتنے گہرے تھے کہ بُعد زمانی ومکانی بھی انھیں دھندلا نہ کرسکا۔

''تصوف اور کشمیری صوفیہ'' کی ابتدا میں تصوف کو صوفیہ کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں تو تصوف کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر خود صوفیہ، تصوف کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اس سوال پر کم ہی دھیان دیا گیا ہے۔ یہاں ہم نے تصوف کو اسی پہلو سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ تصوف کیا ہے؟ تصوف میں توکل، مجاہدہ، فقر اور ریاضت کی کیا اہمیت ہے؟ اہل تصوف احترام انسانیت اور خدمتِ خلق کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ محبت الٰہی اور

دیدار محبوب کا تصوف میں کیا مقام ہے؟ انھیں سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش ہے یہ کتاب۔تصوف کو سمجھنے اور کشمیری صوفیہ کی خدمات کو سامنے لانے کی یہ ایک ادنیٰ کوشش ہے جو ''تصوف اور کشمیری صوفیہ'' کی صورت میں اس وقت آپ کے زیر مطالعہ ہے۔اصل میں اس کتاب کو عوام کے سامنے پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ تصوف کی اہمیت کو سمجھیں اور سماج کی تعمیر میں اس کا رول کتنا اہم ہے اسے اپنی نظروں میں لائیں۔جس طرح صوفیانہ نظریات نے کل سماج میں انقلاب برپا کیا تھا اسی طرح کا رول یہ آج بھی نبھا سکتا ہے۔تصوف نے کشمیر میں ایک ہمہ جہتی انقلاب برپا کیا تھا۔یہ کسی ایک سطح پر نہیں تھا بلکہ ہر سطح پر تھا۔یہاں تک کہ آج جو لباس کشمیر میں پہنا جاتا ہے یا جس قسم کا کھانا کھایا جاتا ہے وہ بھی وسط ایشیائی اثرات سے خالی نہیں ہے۔ظاہر ہے یہ وسط ایشیا یا ایران بزرگ سے آنے والے صوفیہ کے سبب ہے۔کشمیر کی معیشت کو سہارا دینے والی دستکاریاں،اون اور پشمینے کے کپڑے اور یہاں کی دیگر چھوٹی صنعتیں انھیں صوفیہ کی دین ہیں جنھوں نے وادی کشمیر میں اسلام کا پیغام پھیلایا۔صوفیہ کے اثرات یہیں تک محدود نہیں یہاں کی نقاشی،مصوری اور موسیقی پر بھی وسط ایشیائی رنگ بہت واضح نظر آتا ہے۔یہ سب انھیں صوفیہ کے سبب ہے جنھوں نے اس حسین وادی کو محبت و بھائی چارہ کے پیغام کے لئے منتخب کیا تھا۔صوفیہ نے کشمیر میں تصوف کے اتنے گہرے اثرات چھوڑے کہ یہ لوگوں کے دل پر مرتسم ہو گئے۔کشمیری جہاں گئے اسے ساتھ لیتے گئے اور یہ ساری دنیا میں پھیلے۔اس کتاب کے اخیر میں ان صوفیانہ اثرات کا ذکر ہے جو شعراء کے کلام پر پڑے۔یہاں تک کہ وادی کے غیر مسلم شاعروں نے بھی اس رنگ کو اپنی شاعری کے لئے پسند کیا اور کشمیر سے باہر نکلنے کے بعد بھی کئی پشتوں تک وہ اسی رنگ میں رنگے نظر آئے۔

اس کتاب کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کا ذکر جگہ بہ جگہ کر دیا گیا ہے۔حوالے کی کتابوں کے لئے مرکزی مکتبہ اسلامی کی لائبریری سے بہت مدد ملی جس کے لئے لائبریری کے ذمہ داران تنویر عالم آفاقی،مشتاق اور مصطفیٰ کا شکر گزار ہوں اور اس کتاب پر ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم (صدر شعبہ علوم اسلامیہ،ہمدرد یونیورسیٹی،نئی دہلی) نے پیش لفظ لکھ کر اس کی

اہمیت میں اضافہ کیا میں انکا بھی بے حد شکر گزار ہوں۔ حسن طباعت کا کام اظہار احمد ندیم نے خوش اسلوبی سے انجام دیا جس کے لئے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔ اسی کے ساتھ ہمارے بہت بہت شکریہ کا حقدار ہے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جس نے اس کتاب کی اشاعت کے اخراجات کے لئے ایک بڑی رقم دی، اوراس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ جو بے حد لگن کے ساتھ اردو زبان وادب کے تحفظ و بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کو یہ کوشش پسند آئیگی۔ ہمیں ان کے تاثرات کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔

غوث سیوانی، نئی دہلی
Mob.09312976216
E-mail: ghaussiwani@gmail.com
GHAUS SIWANI/facebook

تصوف کیا ہے؟

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من وتو

پلا کہ مجھ کو مئے لاالٰہ الاہو

نہ مئے نہ شعر نہ ساقی نہ شور چنگ ورباب

سکوتِ کوہ ولب جوے ولالۂ خودرو

اقبالؔ

تصوف کیا ہے؟

اللہ ہے، وہ ایک ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ کسی قسم کے جسم و بدن سے پاک ہے۔ یہ دنیا کے بیشتر انسانوں کا عقیدہ ہے۔ اللہ کے وجود پر یقین کے ساتھ ہی مذہب کی بنیاد پڑتی ہے لہٰذا دنیا کے سبھی مذاہب خالق کا تصور پیش کرتے ہیں۔ اس کے لئے الگ الگ ناموں کا استعمال کرتے ہیں مگر مسمّیٰ ایک ہے۔ انسان کو اول روز سے ہی اپنے پیدا کرنے والے مالک کی تلاش رہی ہے۔ وہ خدا کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ اس نے اپنے خالق کی کھوج میں تن من دھن کی بازی لگادی۔ شہروں اور آبادیوں سے نکل کر صحراؤں، جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا رہا، پہاڑوں کو اپنا مسکن بنایا اور ویرانوں میں حق ہو' کی صدائیں بلند کرتا رہا۔ عین حقیقت کے متلاشی دنیا کے سبھی مذاہب میں ہوئے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ اسی عین حقیقت کے عرفان کا نام تصوف ہے، اور اس راستے پر چلنے والوں کو صوفی کہتے ہیں۔

وہ کیا ہے ترا جس میں جلوہ نہیں
نہ دیکھے تجھے کوئی اندھا نہیں

تصوف اور صوفی:

تصوف اور صوفی کے الفاظ کی تحقیق میں علماء تصوف نے بہت کچھ کہا اور لکھا ہے، لیکن ہم یہاں عہدِ وسطیٰ کے ایک معروف صوفی حضرت سید علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کشف المحجوب سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں، جن سے واضح ہو جائے گا کہ بلند پایہ صوفیہ خود تصوف اور صوفی کے تعلق سے کیا خیالات رکھتے ہیں:

"کلمۂ تصوف باب تفعل سے ہے جس کا خاصہ ہے بہ تکلف فعل کا متقاضی ہو اور یہ اصل کی فرع ہے۔ لغوی حکم اور ظاہری معنیٰ میں اس لفظ کی تعریف کا فرق موجود ہے۔

صفا ولایت کی منزل ہے اور اسکی آیت و روایت ہے اور تصوف صفا کی ایسی حکایت و تعبیر ہے جس میں شکوہ و شکایت نہ ہو۔"

(اردو ترجمہ کشف المحجوب، صفحہ ۶۹)

"اہل علم کی ایک جماعت کہتی ہے کہ صوفی کو صوفی اس لئے کہا جاتا ہیکہ وہ صوف کے کپڑے پہنتے ہیں، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ وہ اول صف میں ہوتے ہیں اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ اصحاب صفہ کی نیابت کرتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ نام صفا سے ماخوذ ہے۔ غرض کہ ہر وجہ تسمیہ میں طریقت کے بہ کثرت لطائف ہیں۔" (ایضا، ص ۶۳)

"میں کہتا ہوں کہ صفا، کدورت کی ضد ہے اور کدورت صفات بشری میں سے ہے۔ حقیقتاً صوفی وہ ہے جو بشری کدورتوں سے گزر جائے۔"

(ایضا، ص ۶۶)

تصوف اور صوفی کے الفاظ کو لے کر علماء میں زبردست بحث رہی ہے۔ اسے صوف، صفہ، صفا اور صوفہ کے الفاظ سے مشتق مانا جاتا رہا ہے۔ درست خواہ جو ہولیکن دوسری حقیقت یہ ہے کہ ان سبھی الفاظ سے اہل تصوف کا بڑا گہرا معنوی تعلق رہا ہے۔ ایک صوفی کی اگر مکمل زندگی پر نظر ڈالیں تو صرف اس ایک لفظ سے اس کا مکمل احاطہ نہیں ہوتا، بلکہ اس طرح کا کوئی لفظ دکھائی نہیں پڑتا، جسے ادا کر کے اہل تصوف کے حالات کی تعبیر کماحقہٗ ہو سکے۔

صوف:

''صوف یعنی اون صوفیہ کا پسندیدہ لباس رہا ہے۔ وہ اسے انبیاء، اولیاء، صلحاء اور صدیقین کا لباس قرار دیتے رہے ہیں۔ ان کے مطابق اس لباس کے پہننے سے خشوع وخضوع اور گداز قلب پیدا ہوتا ہے۔ انسان کے اندر عجز وانکسار کی خصلتیں آتی ہیں اور غرور وتکبر دور ہوتا ہے۔ اہل تصوف کا ماننا ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ و تابعین نے اس لباس کو پہنا۔ نیز حضرت عیسیٰ وموسیٰ علیہما السلام نے بھی اسے اپنایا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے شرف ہم کلامی حاصل کرنے گئے تو اونی لباس میں ملبوس تھے۔ عوارف المعارف (اول) کے مطابق ہمیشہ سے زاہدین وعابدین اور صالحین ومتقین کو اونی لباس مرغوب رہا ہے۔ شیخ علی ہجویری اپنی کتاب کشف المحجوب میں اسے وفا کی قمیص قرار دیتے ہیں، جسے پہن کر اہل صفا دونوں جہان سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ صوفیہ اور زہاد کا ایک بڑا طبقہ ایسا بھی گزرا ہے جس نے اونی لباس اختیار نہیں کیا اور بعض نے اسکی مخالفت بھی کی۔ جن میں حضرت سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک اور محمد بن سیرین رحمہم اللہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ باوجودیکہ بعض حضرات صوفیہ نے اسے اختیار نہیں کیا مگر اکثر نے اسے اپنایا اور یہ ان کا شعار بن گیا۔ انکی پہچان اس لباس سے ہونے لگی۔ اس میں عموماً پیوند بھی لگے ہوتے تھے جسے گدڑی کہا جاتا تھا۔ صوفیہ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں اس کا تھوڑا سا اندازہ کشف المحجوب کی درج ذیل عبارتوں سے ہوتا ہے۔

''پشم اور اون وصوف کا مخصوص وضع قطع کا لباس جسے گدڑی کہتے ہیں صوفیہ

کرام کا شعار ہے اور یہ لباس سنت کے موافق ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ پشمینی لباس اختیار کرو کیونکہ اس سے دلوں میں ایمان کی شیرینی پاؤ گے۔"

رسول اکرم ﷺ کے ایک صحابی کا ارشاد ہے کہ آپ صوف کا لباس زیب تن فرماتے اور دراز گوش پر سواری فرمایا کرتے تھے، نیز رسول اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کپڑے کو ضائع نہ کرو جب تک کہ پیوند لگانے کی گنجائش ہو۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ کا لباس ایک گدڑی تھی کہ جس میں تیس پیوند لگے ہوئے تھے۔ نیز منقول ہے کہ سب سے بہتر لباس وہ ہے جس میں آسانی سے محنت کی جا سکے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سات بدری صحابیوں کو دیکھا ہے جو پشمینہ کا لباس پہنتے تھے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلوت میں صوف کا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ایک گدڑی پیوند لگی پہنے دیکھا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب وعلی مرتضیٰ اور ہرم بن حیان رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو پشمینہ کا لباس پہنے ہوئے دیکھا، جس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔" (صفحہ ۷۹۔۸۰)

جہاں اہل صفا صوف اختیار کرنا پسند کرتے ہیں وہیں نا اہلوں کے صوف پہننے کو وہ ناپسند بھی کرتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ اس سے تصوف کی بدنامی ہوتی ہے اور نا اہلوں کا اس سے مقصد محض دنیا کی نظر میں عزت اور دولت حاصل کرنا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اس کی مذمت کرتے ہیں اور دیگر صوفیہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ایسے عناصر تصوف کی بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔

پہلا صوفی:

صوفیہ کے نظریات دنیا میں عہد قدیم سے چلے آرہے ہیں۔ ترک دنیا اور تجرد ہر دور

میں موجود رہا ہے۔کوہ بیابان میں عابدوں کی عبادت گزاری اور زہاد کی چلہ کشی ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ احادیث وسیرت کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ رسول محترم ﷺ کئی کئی دن کے لئے غار حرا میں چلے جاتے اور عبادت وریاضت میں مصروف رہتے۔حتیٰ کہ پہلی وحی کا نزول بھی اسی مقام پر ہوا۔اصحاب رسول میں بھی ایسے لوگوں کی کثرت تھی جو فقر کی زندگی گزارتے تھے۔دنیا کے اسباب میں سے صرف اتنا ہی لیتے تھے جتنے سے کم پر گزارا ممکن نہ تھا۔جو کچھ مال ملتا اسے اللہ کے راستے میں صدقہ کردیتے تھے۔بندگان خدا کی خدمت اور انکے دکھ درد میں کام آنا ان کا مشغلہ تھا۔ان میں خلفاء راشدین اور اہل بیت نبوت رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔اس دور میں اکثر وہ اعمال وافعال موجود تھے، جو اہل تصوف کا شعار رہے ہیں، مگر لفظ تصوف موجود نہ تھا۔کسی کو صوفی کے نام سے نہیں جانا جاتا تھا۔یہ الفاظ بعد میں رائج ہوئے۔حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے 'عوارف المعارف' کے مطابق یہ الفاظ زمانۂ نبوت میں رائج نہ تھے۔'الرسا لۃ القشیر یہ' کے مطابق صوفی کا لفظ دوسری صدی ہجری کے اخیر میں رائج ہوا مگر 'کتاب اللمع' کے مطابق شیخ ابونصر سراج طوسی علیہ الرحمہ اسے دوسری صدی ہجری کی ابتدا میں بھی رائج بتاتے ہیں یعنی حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ کے دور میں، جو تابعی تھے اور ۱۱۰ھ میں انتقال ہوا۔بیشتر محققین کا ماننا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے نصف اخیر میں صوفی لفظ کا چلن شروع ہوا اور سب سے پہلے ابوالہاشم کوفی اور جابر بن حیان کوفی کو صوفی کہا گیا۔ان دونوں کا انتقال ۱۶۰ھ کے آس پاس ہوا۔یہ دونوں کوفہ کے رہنے والے تھے۔مولانا عبدالرحمٰن جامی اور امام سیوطی سمیت کچھ دیگر اہل علم نے ابوالہاشم کوفی کی اولیت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے علم قلوب پر گفتگو کی۔ڈاکٹر عبیداللہ فراہی نے اپنی کتاب 'تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ' میں کئی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"تصوف کا آغاز عالم اسلام کے انھیں دونوں شہروں یعنی کوفہ اور بصرہ سے ہوا۔کوفہ یونانی کی فکر کا اثر تھا اور بصرہ ہندوستانی علم وفکر کا۔مانی

کے مذہب میں عشقِ خداوندی کے عناصر پائے جاتے ہیں جب کہ
ہندستانی فلسفہ میں ساراز ورترک وتیاگ پر ہے۔"

تحریک تصوف:

دوسری صدی ہجری تصوف کے لئے بے حد اہم رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ممالک اسلامیہ میں انتشار پھیلا ہوا تھا اندرونی اور بیرونی سازشیں اپنے عروج پر تھیں۔ مسلمان فرقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو رہے تھے۔ نئے نئے مسائل سر اٹھا رہے تھے ایسے میں عابدوں اور زاہدوں کا ایک بڑا طبقہ دینداری اور تحفظ ایمان کے تعلق سے فکر مند تھا۔ حکومت وقت کے خلاف اٹھنے والی کئی آوازیں خاموش کی جا چکی تھیں۔ ایسے میں کوئی مسلح جدوجہد مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتی تھی۔ اب حالات اور حکمت کا تقاضہ تھا کہ تحفظ دین کے لئے کوئی پرامن، غیر مسلح تحریک شروع کی جائے، جس سے عام لوگوں کی اصلاح کی راہیں ہموار ہوں اور بندگان خدا کو خدا کی طرف موڑا جا سکے۔ انھیں حالات میں عالم اسلام کے دو مشہور شہروں کوفہ اور بصرہ میں اللہ والوں نے عام لوگوں کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ ان کا زور باطنی اصلاح پر زیادہ ہوتا تھا، کیونکہ اگر باطن کی اصلاح ہوگئی تو ظاہر کی خود بخود ہو جاتی ہے۔ اسی طریقے کو بعد میں تصوف کہا جانے لگا اور اس طریقے پر چلنے والوں کو صوفی کہا گیا۔ اس کی اشاعت ایران اور عراق سے نکل کر پورے عرب وعجم میں ہوگئی اور آج دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جہاں تصوف کے سلاسل نہ پائے جاتے ہوں۔ ڈاکٹر عبیداللہ فراہی لکھتے ہیں:

"تصوف میں ایک ساحرانہ جذب اور کشش ہے۔ اس نے ناآسودہ ذہنوں کو بالخصوص متاثر کیا ہے۔ دوسرے عرفانِ حقیقت کا شوق اور ایک نئی راہ چلنے کا جذبہ، جو کچھ کم لذت آگیں نہیں ہوتا، بہتوں کو اس راہ پر کھینچ لایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اسے پذیرائی حاصل ہوتی رہی اور وارفتگان شوق برابر اس کی طرف لپکتے رہے۔ اگرچہ

اس کا دائرہ محدود اور مخصوص تھا لیکن تاریخ کا کوئی بھی دور اس سے خالی نہیں رہا۔''

(تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ، صفحہ۔۸)

تصوف نے جب تحریک کی شکل اختیار کرلی تو بڑے بڑے صوفیہ پیدا ہوئے جو عالم شریعت کے ساتھ ساتھ راہی طریقت بھی تھے۔ان صوفیہ میں حضرت حسن بصری، جنید بغدادی، ذوالنون مصری، ابراہیم ادہم، عبدالقادر جیلانی، بایزید بسطامی، حبیب عجمی، مالک بن دینار، حبیب بن اسلم راعی، بشر بن حافی، حارث محاسبی، سری سقطی، حاتم بن اصم، ابوالحسن کے نام بے حد مشہور ہیں۔تصوف کی تحریک جب ہندستان پہنچی تو اسے یہاں بھی خوب پذیرائی حاصل ہوئی ۔شاہ وگدا، خاص وعام سبھی صوفیوں سے متاثر ہوئے۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دائرہ پورے ملک میں پھیل گیا۔یہاں خاص بات یہ ہوئی کہ تصوف کے دلدادگان میں صرف مسلمان ہی نہیں شامل تھے، بلکہ بڑی تعداد میں غیر مسلم بھی شامل ہوگئے، اور ان میں بھی اس کے اثرات سے صوفیانہ تحریکیں شروع ہوگئیں۔ہندستان میں تصوف کی اشاعت میں جن صوفیہ نے زیادہ اہم رول نبھایا ان میں قابل ذکر نام ہیں، داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، بابا فریدالدین شکرگنج، نظام الدین اولیاء، نصیرالدین چراغ دہلی، خواجہ بندہ نواز گیسودراز، اشرف جہانگیر سمنانی، شرف الدین یحیٰ منیری، علاء الحق پنڈوی، خواجہ باقی باللہ، شیخ احمد سرہندی (رحمہم اللہ) وغیرہ۔آخری عہد کے صوفیہ میں دلی کا ولی اللہی خاندان، حاجی وارث علی شاہ اور اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں نے تصوف کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا اور ان کے سلاسل پورے برصغیر میں پھیلے۔ان بزرگوں سے لاکھوں تشنگان عرفان سیراب ہوئے۔سچ تو یہ ہے کہ ہندستان صوفیوں کی ہی سرزمین ہے اور یہاں جن صوفیوں نے اپنے سلاسل پھیلائے اور عوام میں محبت وبھائی چارہ کے پیغامات کو عام کیا انکی فہرست بہت طویل ہے۔انکے حالات زندگی کو جمع کرنا ایک چیلنج بھرا کام ہے۔اگر ان صوفیہ کی صرف فہرست ہی تیار کی جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔

صوفی کون؟:

جز فنا عشق میں تدبیر مقدر نہ ہوئی
زندگی موت سے آخر کبھی جانبر نہ ہوئی

حقیقتاً صوفی کون ہے اور اسکے اندر کون کون سی باتیں موجود ہونی چاہئیں، اور کن کن باتوں سے بچنا چاہئے؟ ان سوالوں کے جواب خود صوفیہ نے دیا ہے۔ انھوں نے خود اپنے لئے جو سخت شرائط مقرر کی ہیں ان پر عمل مشکل ہے۔ صوفیہ خود اپنے فرقے سے عمل کی جس انتہا کا مطالبہ کرتے ہیں، انھیں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب میں بیان فرمایا ہے:

حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے کہ جب بات کرے تو اس کا بیان حقائق کے اظہار میں ہو۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تصوف ایسی خوبی ہے جس میں بندے کو قائم کیا گیا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ یہ حق کی صفت ہے یا بندے کی؟ آپ نے فرمایا اسکی حقیقت حق کی صفت ہے اور اسکی ظاہری رسم و حالت بندے کی صفت ہے۔

حضرت ابوالحسن نوری فرماتے ہیں کہ تصوف تمام نفسانی لذات و حظوظ سے دستکشی کا نام ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ صوفیہ کرام کا گروہ وہ ہے جن کی زندگیاں کدورتِ بشری سے آزاد اور آفت نفسانیہ سے پاک وصاف ہو کر آرزو اور تمناؤں سے بے نیاز ہیں۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے حضور بلند درجے اور صف اول میں آرام گستر ہیں اور ماسوا اللہ کے سب سے قطعاً کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا، صوفی وہ ہے جس کے قبضہ میں کچھ نہ ہو اور نہ وہ خود کسی کے اختیار میں ہو۔

حضرت ابو محمد مرتعش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے کہ اس کا باطن اس کے قدم کے برابر ہو۔ (یعنی دل مکمل حاضر ہو)

حضرت حصری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ صوفی معدوم ہونے کے بعد ہستی کی تمنا نہیں کرتا اور موجود ہونے کے بعد معدوم ہونے کی خواہش نہیں کرتا۔

حضرت علی بن پندار علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ تصوف یہ ہے کہ صوفی اپنے ظاہر و باطن میں حق کی خاطر خود کو نہ دیکھے۔

حضرت محمد عمر بن مقری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ احوال کی استقامت کا نام تصوف ہے۔

(صفحہ۔۷۰۔۷۶)

اہل تصوف نے اپنے لئے خود جو شرائط مقرر کی ہیں ان کا تعلق ظاہر سے کم اور باطن سے زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ اصل باطن ہے۔انسان جو کچھ دل میں سوچتا ہے اسے عمل میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور باطن کا ہی اظہار خارج میں ہوتا ہے لہٰذا سب سے پہلے اسے اندرونی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے،اور اس اصلاح کا طریقہ تزکیۂ قلب ،عبادت کی کثرت ،توحید وتوکل، فقر ورضا اور مجاہدے کی کثرت ہے۔ان مرحلوں سے گزر کر ہی اسے مشاہدہ حق حاصل ہوتا ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ کشف المحجوب

۲۔ عوارف المعارف

۳۔ کتاب اللمع

۴۔ نفحات الانس

۵۔ الرسالۃ القشیریہ

۶۔ تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ

جب منصور حلاج کو قید میں اٹھارہ دن گزر گئے تو جناب شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے پاس جا کر دریافت کیا۔ اے منصور! محبت کیا ہے؟ منصور نے جواب دیا آج نہیں کل یہ سوال پوچھنا، جب دوسرا دن ہوا اور ان کو قید سے نکال کر مقتل کی طرف لے گئے تو وہاں منصور نے شبلی کو دیکھ کر کہا شبلی! محبت کی ابتداء جلنا اور انتہاء قتل ہو جانا ہے۔

(مکاشفۃ القلوب)

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

اقبالؔ

تصوف اور فقر

میں جو الزامِ محبت میں گرفتار ہوا
قیدئ سلسلۂ حیدر کرار ہوا

اپنی روز مرہ کی زندگی میں انسان کو روپے پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے بغیر کاروبار حیات نہیں چل سکتے مگر ضرورت سے زیادہ دولت اور عیش وعشرت کی ہوس اسے مادہ پرست بنادیتی ہے۔وہ آخرت سے بیزار اور دنیا سے محبت کرنے والا ہوجاتا ہے۔اس دولت کو جمع کرنے کے لئے وہ نہ جانے کیا کیا صحیح اور غلط طریقے اپناتا ہے۔دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے، جھوٹ اور فریب کا سہارا لیتا ہے۔نتیجہ کے طور پر وہ حقوق العباد میں خیانت کا گنہگار ہوکر بارگاہ خداوندی میں قابل گرفت قرار پاتا ہے۔یہ مال انسان کو اسکے خالق اور آخرت سے دور کردیتا ہے،یہی سبب ہے کہ صوفیہ اپنی زندگی فقر میں گزارتے ہیں۔وہ اسے پسند کرتے ہیں،

دوسروں کواس کی ترغیب دیتے ہیں اور مال جمع کرنا ان کے مزاج کے خلاف ہوتا ہے۔حالانکہ بعض اہل تصوف ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے خوب دولت کمائی، بڑی تجارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنی دولت سے ایک دنیا کو مستفید و مستفیض کیا مگر ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی۔جن صوفیہ نے دنیا کے مال سے احتراز کیا انکی نظر میں مال کے منفی پہلو تھے اور اس کی وجہ سے حب دنیا پیدا ہونے کے اندیشے تھے،اور جن صوفیہ نے مال و دولت کمایا انکے یہاں اس کا مقصد بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچانا تھا۔جن کے پاس دولت تھی وہ اسے صدقہ وخیرات پر خرچ کرتے تھے۔فقراء ومساکین کی دستگیری کرتے تھے۔علماء اور طلباء کی کفالت کرتے تھے اور مال ہوتے ہوئے بھی مال کی محبت اور مادہ پرستی سے سینکڑوں میل دور تھے۔

فقر کا مطلب:

اہل تصوف کا مزاج ہمیشہ الفقر فخری والا رہا ہے۔امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ فقر کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''فقر کا مطلب اس چیز کا نہ ہونا ہے جسکی حاجت ہو،لیکن جسکی حاجت نہ ہو اس کا نہ ہونا فقر نہیں کہلاتا اور اگر وہ چیز جسکی حاجت ہے موجود بھی ہو اور انسان کے بس میں بھی ہو تو وہ فقیر نہیں کہلاتا۔''

(ترجمہ احیاء العلوم، صفحہ ۴۲۶)

فقیر کا مفہوم کیا ہے اور ایک صوفی کو فقیر کیوں ہونا چاہئے؟اس تعلق سے سید علی ہجویری علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''فقیر و درویش وہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو اور کوئی چیز اسے خلل انداز نہ کرے۔نہ وہ اسباب دنیا کی موجودگی سے غنی ہو اور نہ اسکے نہ ہونے سے محتاج ہو۔اسباب کا ہونا اور نہ ہونا دونوں اس کے فقر میں یکساں ہیں، بلکہ اسباب کی غیر موجودگی میں زیادہ خوش وخرم رہتا ہو۔جواز کی ایک حالت یہ

ہے، اس لئے مشائخ نے فرمایا ہے کہ درویش جس قدر تنگدست ہوگا اسکا حال اتنا ہی کشادہ ہوگا، کیونکہ درویش کے نزدیک اسباب دنیاوی کا ظاہری وجود بھی تنگ دلی کا موجب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ کسی چیز کا دروازہ بندنہیں کرتا۔ اگر بند کرے تو اتنا ہی اس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کے اولیاء اور اس کے محبوبوں کی زندگیاں الطاف خفی میں چھپی ہوتی ہیں اور حق تعالیٰ کے ساتھ روشن اسرار بہتر ہوتے ہیں نہ کہ دنیا کے غدار کی مصاحبت۔ چونکہ یہ دنیا نافرمانوں کی جگہ ہے۔ اس کے اسباب سے تعلق رکھنا صحیح نہیں ہوسکتا ہے اسی لئے یہ حضرات رضائے الٰہی کی راہ میں دنیاوی سازوسامان سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتے ہیں۔"

(کشف المجوب، صفحہ۔۵۱)

صوفیہ ترک مال اور تجرد کو اللہ کی قربت کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، اسی لئے اس پر زور دیتے ہیں اور دنیا کی محبت کی ایک قسم وہ حب مال کو سمجھتے ہیں لہٰذا وہ اس سے دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔

فقر کی پانچ حالتیں:

صوفیہ کے نزدیک اصل فقر یہ ہے کہ مال کا ہونا اور نہ ہونا انسان کے لئے برابر ہو جائے، بلکہ مال کے نہ ہونے میں اسے زیادہ خوشی اور مسرت کا احساس ہو۔ امام محمد غزالی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں فقر پر پورا باب رکھا ہے، وہ اسے پانچ حالتوں میں تقسیم کرتے ہیں:

"پہلی حالت: جو سب سے بلند ہے یعنی جب اس کے پاس مال آئے تو وہ اسے ناپسند کرے اور اس سے اذیت محسوس کرے اور اسے قبول کرنے سے بھاگے، نیز اس کے شر اور اس میں مشغولیت سے بچے، یہ زہد ہے اور ایسے

شخص کوزاہد کہتے ہیں۔

دوسری حالت: مال میں رغبت نہ ہو کہ اس کے ملنے پر خوش ہو اور نہ اس طرح ناپسند کرتا ہو کہ اس سے اذیت حاصل ہو تو چھوڑ دے، ایسی حالت والے کو راضی کہتے ہیں۔

تیسری حالت: مال کے نہ ہونے کے مقابلے میں اس کا پایا جانا اسے پسند ہو کیونکہ وہ اس میں رغبت رکھتا ہے، لیکن اس کی محبت اس حد تک نہیں پہنچتی کہ اس کی طلب میں سرگرمی دکھائے، بلکہ اگر آسانی سے مل جائے تو خوش ہوتا ہے اور اس کی تلاش میں محنت کرنا پڑے تو اس میں مشغول نہیں ہوتا ایسے شخص کو قانع صبر کرنے والا کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس نے موجود پر قناعت کی حتیٰ کہ اس کی طلب کو چھوڑ دیا باوجودیکہ کچھ کمزور سی رغبت بھی تھی۔

چوتھی حالت: عاجزی کی وجہ سے مال کی طلب چھوڑ دے ورنہ اس میں ایسی رغبت رکھتا ہے کہ اگر اسکی طلب تک راستہ ملے اگرچہ تھکاوٹ کے ساتھ ہو تو وہ اسے طلب کرے یا اسکی طلب میں مشغول ہو تو ایسی حالت والے کو حریص کہتے ہیں۔

پانچویں حالت: اسکے پاس جو مال نہیں ہے وہ اس کی طرف مجبور ہو جیسے بھوکا شخص جسکے پاس روٹی نہ ہو اور برہنہ شخص جس کے پاس کپڑا نہ ہو، اسے شخص کو مضطر کہتے ہیں۔" (صفحہ ۴۲۸۔۴۲۷)

اہل تصوف کی نظر میں فقر کی سب سے اعلیٰ قسم زہد ہے، جسے امام غزالی علیہ الرحمہ نے پہلی قسم قرار دیا ہے، مگر اس سے بھی بلند ایک قسم ہے، ایسی حالت والے کو مستغنی کہا جاتا ہے۔ یعنی مال واسباب کا ہونا اور نہ ہونا اس کے لئے برابر ہو۔ امام محمد غزالی علیہ الرحمہ اس کے لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حالت کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں یعنی ان کے پاس ایک لاکھ درہم بہ طور عطیہ آئے تو آپ نے لے لئے اور اسی دن تقسیم کر دیا۔ خادمہ نے عرض کیا اگر ان

میں سے ایک درہم کا گوشت لے لیتیں تو اس سے روزہ افطار کر لیتے۔آپ نے فرمایا اگر پہلے یاد دلاتیں تو ایسا ہی کرتی۔

فقر کی فضیلت:

صوفیہ اپنے فقر اختیاری کے لئے قرآن اور احادیث سے دلیلیں لاتے ہیں۔وہ اس کے لئے خاص طور پر اصحاب صفہ کی زندگی کو پیش کرتے ہیں، جو مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترے پر رہا کرتے تھے۔ان کا کام رسول پاک ﷺ کی خدمت سے فائدہ حاصل کرنا اور صبر و توکل سے فقر کی حالت میں رہنا تھا۔کچھ ایسے اصحاب بھی تھے جو صفہ میں نہیں رہتے تھے مگر انکی زندگی اصحاب صفہ کی طرح ہی فقر و زہد کی تھی۔اہل تصوف اپنے فقر اختیاری کے لئے مختلف قرآنی آیات پیش کرتے ہیں جیسے امام محمد غزالی نے احیاء العلوم اور داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری نے کشف المحجوب میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۳ کو پیش کیا ہے۔

''ان فقراء کے لئے جن کو راستے میں روکا گیا وہ زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

امام محمد غزالی اس فقر کی فضیلت میں کئی احادیث نبویہ پیش کرتے ہیں۔ایک حدیث جو کنز العمال کی ہے وہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ سے فقر کی حالت میں ملاقات کرنا، غنی ہونے کی حالت میں نہیں۔'' (اردو ترجمہ احیاء العلوم، صفحہ ۴۳۴)

دوسری حدیث:

''بیشک اللہ تعالیٰ اس فقیر کو پسند کرتا ہے جو عیالدار ہونے کے باوجود اپنا دامن بچاتا ہے۔'' (ایضاً)

تیسری حدیث جو مسند امام احمد بن حنبل کی ہے:

''میری امت کے فقراء مالداروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائینگے۔'' (ایضا)

اسی طرح داتا گنج بخش سید علی ہجویری علیہ الرحمہ نے بھی فقر کی فضیلت میں کئی حدیثیں نقل کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ،میرے محبوبوں کو میرے پاس لاؤ۔ فرشتے عرض کریں گے ،کون تیرے محبوب ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، وہ مسکین وفقراء ہیں۔'' (صفحہ ۴۹)

اہل تصوف میں بیشتر حضرات نے پہلے فقر اختیار کیا اور پھر اسی پر صبر و توکل کے ساتھ قائم رہے۔ حالانکہ اصحاب رسول میں جس طرح بعض حضرات تنگدست اور بعض تونگر تھے اسی طرح صوفیہ میں بھی تھے اور یہاں جو تونگر تھے وہ بھی تونگر صحابہ کی طرح ہی سخی اور فراخ دل تھے ۔انکی دولت کے دروازے ضرورت مندوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ بعض اصحاب تصوف تو ایسے بھی گزرے ہیں جن کے پاس حکومت اور سرداری تھی ،مگر جب انھوں نے خود کو خدا کے لئے وقف کردیا تو حکومت اور دنیاوی جاہ وحشم کو خیر آباد کہہ دیا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی ایسے ہی صوفیہ میں شامل تھے ۔ایسے ارباب تصوف کی بھی کمی نہیں جن کے دروازوں پر ارباب حکومت کی قطاریں لگی ہوتی تھیں ،جیسے حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی، شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی وغیرہ، مگر انھوں نے کبھی دولت دنیا کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

فقر ارباب تصوف کی نظر میں:

ارباب تصوف کی نظر میں فقر کا بلند مقام ہے اور اس پر صبر و توکل کو وہ مستحسن سمجھتے ہیں۔

وہ اس شخص کو راہ سلوک کا راہی تصور ہی نہیں کرتے جس میں فقر نہ ہو یا فقر پر صبر و رضا نہ اختیار کرے۔ ہندستان میں تصوف کے بانیوں میں سے ایک شیخ علی ہجویری علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں:

> ''بارگاہ احدیت میں فقراء کا بڑا مقام و درجہ ہے۔ خدا نے ان کو خاص منزلت و مرحمت سے نوازا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسباب ظاہری و باطنی سے ترک تعلق کر کے مکمل طور پر مسبب الاسباب پر قناعت کر کے رہ گئے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی ملازمت اور اسکی بندگی کیلئے وقف کر دیا ہے۔ ان کا فقر ان کے لئے موجب فخر بن گیا ہے اور فقر کی دوری پر آہ وزاری اور اسکی آمد پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ حضرات فقر و مسکینی سے ہمکنار رہتے ہیں اور اس کے سوا ہر چیز کو ذلیل وخوار جانتے ہیں۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۰)

حضرت ابراہیم بن احمد خواص علیہ الرحمہ نے فقر کی فضیلت میں جو الفاظ کہے ہیں وہ تصوف کی کتابوں میں بہت نمایاں ہیں اور ان الفاظ کو پڑھ کر لگتا ہے کہ دنیا میں سب سے افضل واعلیٰ کام فقر اختیار کرنا ہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''فقر صاحبِ مجد و شرف کی چادر، پیغمبروں کا لباس، صالحین کی پوشش اور پرہیزگاروں کا تاج ہے۔ مومنین کی زینت، عارفین کی کمائی اور مریدین کی آرزو ہے۔ اطاعت گزاروں کا قلعہ اور گنہگاروں کا قید خانہ ہے۔ یہ گناہوں کو دور کرنے والا، نیکیوں کو بڑھانے والا، درجات کو بلند کرنے والا اور مقصود تک پہنچانے والا ہے۔ خدائے جبار کی رضا ہے اور اس کے نیک ولیوں کی ایک کرامت ہے۔''

(کتاب اللمع، صفحہ ۴۸۔۴۷)

امام قشیری بھی صوفیہ کو اللہ کے برگزیدہ بندوں میں شمار کرتے ہیں۔ وہ فقراء کا تذکرہ انبیاء کے ساتھ کرتے ہیں اور الرسالۃ القشیریہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں کے ذریعے مخلوق

کی حفاظت کرتا ہے اور انھیں کی برکت سے انھیں رزق دیتا ہے۔اسی طرح دیگر اہل تصوف بھی فقر کو ایک صوفی کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔اس کے بغیر تصوف اور روحانیت کو نامکمل تصور کرتے ہیں۔دراصل تصوف میں انسان کو مکمل طور پر روحانی بنایا جاتا ہے۔اسکی توجہ کو کائنات کی طرف سے پھیر کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول کیا جاتا ہے۔اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ تصوف کے راستے پر چلنے والا مال سے قطع تعلق کر لے اور دنیا سے بالکل بے رغبت ہو جائے۔اگر انسان کے اندر دنیا کی اشیاء اور مادیت سے محبت باقی ہوگی تو وہ خود کو پوری طرح خدا کی یاد میں محو نہیں کر پائے گا لہٰذا پہلے اسے فقر و تجرد کا سبق دیا جاتا ہے، پھر وہ صبر و توکل کے راستے پر چلتا ہے اور اسے اس بات کا یقین کامل ہونے لگتا ہے کہ رازق صرف اور صرف اللہ ہے۔ربوبیت بس اسی کی ہے۔ جو مالک زمین کی تہوں کے اندر اپنی مخلوقات کو رزق پہنچاتا ہے، جو سمندر کی گہرائی میں ربوبیت کا مظاہرہ کرتا ہے اور پہاڑوں کی چٹانوں میں جاندار پیدا کرتا ہے، انھیں پالتا پوستا ہے اور رزق دیتا ہے وہ انسان کو کیوں نہیں دے گا؟ اب ایک صوفی کا یقین خدا کی ذات میں پختہ ہونے لگتا ہے۔

فقر منزل نہیں:

فقر دراصل منزل نہیں بلکہ یہ صوفیہ کے لئے منزل تک پہنچنے کا راستہ ہے۔یہ خدا سے تعلق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔یہ انسان کو روحانی سکون عطا کرتا ہے اور کم سے کم اسباب دنیا کے ساتھ اسے جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔صوفیہ دنیا کے اسباب میں سے صرف اتنا ہی لیتے ہیں جس سے کم لیا جانا جائز نہیں۔صوفیہ فقر و مسکینی میں ہی انسان کی عظمت دیکھتے ہیں۔حضرت سید علی ہجویری علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں:

> ''فقر و مسکینی کی نرالی شان ہے اور اسکی رسم عجیب ہے اضطرار ہے۔اسکی حقیقت اقبال اختیاری یعنی بخندہ پیشانی افلاس و اضطرار کو قبول کرنا ہے۔
> جس نے اس مسلک و طریق کو دیکھا اور سمجھا اس نے اس سے آرام پایا۔

جب مراد پائی تو حقیقت سے ہمکنار ہو گئے اور جو حقیقت سے ہمکنار ہو گیا وہ موجودات سے دست کش ہو گیا۔ رویت کل میں فنائے کلی حاصل کر کے بقائے کلی سے سرفراز ہو گیا۔"

(اردو ترجمہ کشف المحجوب، صفحہ-۵۰)

اہل تصوف کے لئے جہاں فقر و درویشی خدا تک رسائی کا ذریعہ ہے، روحانی سکون کے حصول کا سبب ہے وہیں اس سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور اس سے ظاہری و باطنی روحانیت حاصل کرتا ہے۔ کشف المحجوب کی ایک عبارت یہاں نقل کرنا بیجا نہ ہوگا:

"فقیر کی عزت اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل حرکتوں سے بچائے رکھے اور اپنے حال کو خلل سے محفوظ رکھے۔ نہ بدن معصیت و ذلت میں مبتلا ہو نہ جان پر خلل و آفت کا گزر ہو۔ درویش کی ظاہری حالت، ظاہری نعمتوں میں مستغرق اور باطنی حالت، باطنی نعمتوں سے آراستہ ہوتی ہے، تاکہ اس کا جسم روحانیت اور اس کا دل ربانی انوار کا منبع بن جائے۔ نہ خلق سے اس کا تعلق ہو اور نہ آدمیت سے اس کی باطنی نسبت۔ یہاں تک کہ وہ خلق سے تعلق اور آدمیت کی نسبت سے بے نیاز ہو جائے اور اس جہان کی ملکیت اور آخرت کے درجات کی خواہش سے دل کو تونگری حاصل نہ ہو، اور یہ جانے کہ اس کے فقر کے ترازو کے پلڑے میں دونوں جہاں مچھر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ درویش کی ایسی حالت کے بعد اس کا ایک سانس بھی دونوں جہان میں نہ سما سکے گا۔"

(صفحہ-۵۲)

داتا گنج بخش علیہ الرحمہ نے مندرجہ بالا عبارت میں جس کیفیت کا ذکر کیا ہے اسی کو صوفیہ استغنا کی حالت کہتے ہیں کہ انسان ساری خدائی سے بے نیاز ہو جائے اور صرف خدا سے لو لگائے۔ اس حالت میں اسے نہ دنیا کی کسی چیز سے تعلق ہو اور نہ آخرت کی نعمتوں کو خاطر

میں لائے، وہ بس رضائے الہٰی کے لئے سب کچھ تج دے۔

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا

اوراس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں کے حوالے شامل ہیں:

۱۔ قرآن مجید

۲۔ مسند امام احمد بن حنبل

۳۔ کنز العمال

۴۔ کشف المحجوب

۵۔ احیاء العلوم

۶۔ کتاب اللمع

۷۔ الرسالۃ القشیریہ

۸۔ تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں
میں ان کی محفلِ عشرت میں کانپ اٹھتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

اقبالؔ

تصوف اور مجاہدہ

''مجاہدہ'' جہد سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے کوشش، سعی، جانفشانی، مگر اہل تصوف کی اصطلاح میں نفس کشی اور ریاضت کو مجاہدہ کہتے ہیں۔ زندگی ہے تو ضروریاتِ زندگی بھی ہیں۔ دنیا کی اس ہماہمی میں نفس کے کچھ مطالبات بھی ہیں۔ تصوف ان مطالباتِ زندگی اور ضروریات حیات کو کم کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ نفس کی مخالفت کی جائے اور وہ جس چیز کا تقاضہ کرے وہ اسے نہ دیا جائے۔ اگر نفس کے مطالبات کو تسلیم کرلیا گیا تو اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا لہٰذا اس پر قابو پانے کا بہترین طریقہ صوفیہ کے ہاں یہی ہے کہ جائز خواہشات پر بھی کنٹرول رکھا جائے۔ اس طرح نفس کشی ہوسکتی ہے اور یہی مجاہدہ ہے۔ مجاہدے کے مختلف طریقے اہل تصوف کے ہاں رائج ہیں۔ تصوف کی معروف کتاب رسالہ قشیریہ میں مجاہدے سے متعلق یوں درج ہے:

''مجاہدہ کی اصل اور اس کی بقا نفس کو اس کی مرغوبات اور پسندیدہ چیزوں سے علاحدہ کرنا اور خواہشات کی خلاف ورزی پر ہمہ وقت اسے ابھارنا ہے۔'' (صفحہ-۶۲)

یہاں دو باتیں بالخصوص قابل غور ہیں۔ اول نفس کو پسندیدہ اور مرغوب چیزوں سے محروم رکھنا اور دوئم خواہشات کی مخالفت پر اسے تیار کرنا۔ نفس کو اگر پسندیدہ چیزوں سے محروم رکھا جائے تو اس سے تہذیبِ نفس ہوگا اور خواہشات کی مخالفت سے تزکیۂ نفس ہوگا یہاں مجاہدے کا اصل مقصود تزکیۂ نفس ہی ہے۔ راہ سلوک پر پہلا قدم رکھنے والا سب سے پہلے تہذیبِ نفس کرتا ہے، تاکہ وہ تزکیہ کے مقام تک پہنچ سکے۔ یہاں مجاہدے کے بغیر راہ سلوک پر چلنے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کے بغیر راہ سلوک کی کوئی چیز صوفی پر نہیں کھل سکتی۔ اہل تصوف مجاہدے کے دوران ایک لمبی مدت تک روزے رکھتے ہیں اور افطار برائے نام کرتے ہیں۔ شب و روز عبادت میں گزارتے ہیں مسجد، حجرہ یا جنگل و بیابان میں چلہ کشی کرتے ہیں۔ اس دوران عموماً دنیا کی ہماہمی اور عائلی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں۔ دنیا و اہل دنیا سے الگ رہ کر عبادت و ریاضت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنی پوری توجہ اپنے خالق و مالک کے گیان، دھیان پر لگاتے ہیں۔

چلہ کشی:

مجاہدہ اور چلہ کشی اہل تصوف کی نظر میں انبیاء کرام کی سنت ہے۔ رسول محترم ﷺ بعثت سے قبل عموماً غار حرا میں چلے جاتے تھے اور کئی کئی دن عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان اللہ سے ہم کلام ہونے سے قبل چالیس دن روزے رکھے اور چلہ کشی فرمائی جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے:

''اور ہم نے موسیٰ سے تین راتوں کا وعدہ کیا اور اس کا تتمہ بنایا دس راتوں کو، تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔'' (سورہ اعراف)

اہل تصوف مجاہدہ نفس کے لئے اس کے علاوہ بھی کچھ قرآنی آیتیں اور احادیث کو بہ طور دلیل پیش کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، کشف المحجوب درج ذیل آیت کو مجاہدہ نفس کی فضیلت میں پیش کرتے ہیں:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

(جنھوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا یقیناً انھیں ہم نے اپنا راستہ دکھایا۔)

(صفحہ-۲۹۳)

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآنیہ میں مفسرین مجاہدہ کو مقاتلہ کے مفہوم میں لیتے ہیں، مگر اہل تصوف اس سے مراد مجاہدہ نفس لیتے ہیں۔اس قسم کی کئی دوسری آیات بھی اہل تصوف کے حلقے میں مجاہدۂ نفس کی دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

نفس کشی:

مجاہدے کے مختلف طریقے ہیں، جن میں سب سے اہم مخالفت نفس ہے۔ یہ تمام مجاہدوں کی اصل اور تمام عبادتوں کی بنیاد ہے۔ چلہ کشی، روزے رکھنا اور عبادت کرنا مجاہدے کا حصہ ضرور ہیں مگر اسکی ابتدا مخالفت نفس سے ہوتی ہے۔نفس کبھی اچھائیوں کی طرف مائل ہوتا ہے تو کبھی برائیوں کی طرف۔ اگر یہ اچھائیوں کی طرف مائل ہوتو بہت خوب اور اگر اس کا میلان برائیوں کی طرف ہوا تو ہلاکت میں ڈالتا ہے، لہٰذا نفس پر قابو پانا ضروری ہے۔ نفس کو بری باتوں کی طرف راغب ہونے سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ انسان کے قابو میں رہے اور قابو کرنے ایک طریقہ اہل تصوف کے نزدیک یہ ہے کہ اس کے جائز مطالبات بھی پورے نہ کئے جائیں۔قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

''جس نے نفس کو خواہش سے روکا، بیشک جنت اس کا مسکن ہے۔'' (سورہ والنجم)

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جب تمہارے پاس رسول وہ چیز لے کر آئے جو تمہارے جی کو پسند نہیں تھی

تو تم نے اس سے تکبر کیا۔'' (قرآن مجید)

ایک جگہ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول، اللہ نے بیان فرمایا ہے:

''میں اپنے نفس کی پاکی نہیں بیان کرتا کیونکہ نفس تو بہت زیادہ برائی کا حکم کرنے والا ہے، مگر جو خدا نے مجھ پر رحم فرمایا۔''

نفس کشی احادیث کی روشنی میں:

نفس اگرچہ اچھے اور برے میلان رکھتا ہے، کبھی نیکیوں کی طرف مائل ہوتا ہے تو کبھی برائیوں کی طرف۔ کبھی خیر کی طرف کھینچتا ہے تو کبھی شر کی طرف۔ مگر اس کا اکثر رجحان برائیوں کی طرف ہی رہتا ہے۔ چونکہ برائی اکثر ہی پرکشش دکھائی دیتی ہے لہٰذا نفس اسی میں لطف محسوس کرتا ہے۔ مخالفت نفس کے لئے صوفیہ احادیث سے بھی بہ کثرت دلائل لاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ نفس کو پہچاننے پر بھی زور دیتے ہیں، جیسا کہ سید علی ہجویری کشف المحجوب میں اقوال رسول پیش کرتے ہیں:

''جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔''

''اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی جانب وحی فرمائی، اے داؤد تم اپنے نفس کو دشمن جانو کیونکہ میری محبت اسکی دشمنی میں ہے۔''

''اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتا ہے۔'' (صفحہ-۲۸۶)

''تمہارا سب سے برا دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔''

''اس لئے کہ نفس آزاد کتا ہے، سکھانے کے بعد باندھنا مباح ہے۔'' (صفحہ-۳۰۱)

''میری امت پر سب سے زیادہ خوفناک خواہشات کی پیروی اور امیدوں کی درازی ہے۔'' (صفحہ-۳۰۲)

ظاہر ہے نفسانی خواہشات انسان کو عیش پسندی، مادہ پرستی، بیزاری، ناانصافی، کوتاہ

فہمی اور ظلم و بربریت کی جانب لے جاتی ہیں، اس لئے ان پر قابو رکھنا ضروری ہے۔ مجاہدے میں اسی نفس پر قابو رکھنے اور اسکی مخالفت کی کوشش ہوتی ہے۔ یہاں عقل کا استعمال ضروری ہے۔ عقل ہی یہ فیصلہ کرتی ہے نفس کے کس حکم پر عمل کیا جائے اور کس کی مخالفت کی جائے۔ یہاں اس شخص کو قابل افسوس سمجھا جاتا ہے جو خواہشات نفس کی پیروی کرتا ہے اور عقل کو استعمال کر کے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ کونسی نفسانی خواہشات ہلاکت خیز ہیں۔

صوفیہ کے اقوال:

صوفیہ کی نظر میں انسانی خواہشات انسان کو ہلاکت میں ڈالتی ہیں۔ اسی طرح نفس کی مخالفت اسے سربلند کرتی ہے اور سرفرازی کے مقام تک پہنچاتی ہے۔ بارگاہ خداوندی میں سرخروئی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ نفس کی مخالفت بھی ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ معروف صوفی ہیں ان سے پوچھا گیا کہ ''وصل کیا ہے؟ فرمایا، خواہش کے ارتکاب کو چھوڑ دینا۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۳۰۵)

یعنی خالق و مالک کے وصال کی جو شخص خواہش رکھتا ہے اسے چاہئے کہ خواہشات کو ترک کر دے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ ابتدائی عہد کے صوفیہ میں شمار کئے جاتے ہیں، وہ بھی خواہشات نفس کو چھوڑنے پر زور دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

''میں نے ایک شخص کو دیکھا جو فضا میں اڑ رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں یہ کمال کیسے حاصل ہوا؟ اس نے کہا میں ہوائے نفس پر قدم رکھ کر ہوا میں اڑتا ہوں۔'' (ایضا)

یعنی صوفیہ ہاں ہوائے نفس کے ترک سے انسان میں بے شمار کمالات پیدا ہوتے ہیں، اگر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اچھی خوبیوں کا حامل بن جائے تو اسے خواہشات کو چھوڑ دینا چاہئے۔ حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کشف المحجوب میں رقم طراز ہیں کہ:

''نفس کی سب سے بڑی ظاہری صفت شہوت ہے اور شہوت کے معنی آدمی

کے تمام اعضا میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ بندے کو ان کے تحفظ کی تکلیف دی گئی ہے۔ قیامت کے دن ہر ایک عضو کے افعال کے بارے میں سوال ہوگا۔ چنانچہ آنکھ کی شہوت دیکھنا، کان کی شہوت سننا، ناک کی شہوت سونگھنا ،زبان کی شہوت بولنا ،تالو کی شہوت چکھنا، جسم کی شہوت چھونا اور سینہ کی شہوت سوچنا ہے۔ لہٰذا طالب پر لازم ہے کہ وہ اپنے وجود کا حاکم ونگہبان بنے اور دن رات اسکی حفاظت کرے۔ یہاں تک کہ خواہش کے ہر داعیہ کو جو اس میں ظاہر ہوا اپنے سے جدا کردے اور اللہ سے دعا مانگے کہ وہ اسے وہ صفت عطا فرمائے تاکہ اس کے باطن سے ہر خواہش دور ہوجائے کیونکہ جو شہوت کے بھنور میں پھنسا رہتا ہے وہ ہر لحاظ سے محجوب رہتا ہے۔''

(صفحہ-۲۸۵)

نفسانی خواہشات اگرچہ دل میں ابھرتی ہیں مگر انھیں عملی جامہ پہنانے کا کام جسم کے مختلف اعضا کرتے ہیں، جیسے دیکھنے کا کام آنکھ کرتی ہے، سننے کا کام کان کرتا ہے، سونگھنے کا کام ناک کرتی ہے، سوچنے کا کام دماغ کرتا ہے اور چھونے کا کام جسم کرتا ہے۔ قیامت کے دن ان سبھی اعضا کے اعمال کے تعلق سے بھی سوال ہونگے ،مگر اس کی بنیاد نفسانی خواہش ہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اہل تصوف ان خواہشات کو لگام لگانے کی بات پر زور دیتے ہیں۔ اگر نفس بے لگام ہوجائے تو انسان بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرسکتا ہے۔

نفس پر لگام:

علماء تصوف اس بات پر متفق ہیں کہ خواہشات نفس پر قابو ضروری ہے، اس کے بغیر مجاہدہ نامکمل رہتا ہے اور سالک اپنے مطلوب تک نہیں پہنچ سکتا۔

''حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندے کے لئے سخت ترین حجاب، نفس کو دیکھنا اور اس کی پیروی کرنا ہے

حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ نفس کی خو ایسی ہے کہ باطل ہی سے چین پاتا ہے۔ حکیم ترمذی حضرت محمد بن علی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ تم چاہتے ہو کہ اپنے نفس کی بقا کے باوجود جو تمہارے اندر ہے، حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ تمہارا نفس اپنے وجود کے باقی رکھنے کی تدبیر سے بھی آشنا نہیں ہے، وہ اپنے غیر کو کیسے پہچان سکے گا؟

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کفر کی بنیاد، اپنے نفس کی آرزو پر تیرا قائم رہنا ہے۔

حضرت ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ کا قول ہے، نفس، امانت میں خیانت کرنے والا اور رضائے الٰہی سے روکنے والا ہے اور سب سے بہتر عمل نفس کشی ہے۔" (ایضا ۲۹۱۔۲۹۰)

نفس کشی، مسلم صوفیہ کی نظر میں خالق تک رسائی کا بہترین ذریعہ ہے، دیگر مذاہب کے عابدوں، زاہدوں کے یہاں بھی یہ روایت رہی ہے وہ بھی نفس کشی کے لئے مختلف قسم کے مجاہدے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بھوکے اور پیاسے رہ کر تو کبھی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے، کبھی حبس دم کرتے ہیں تو کبھی یوگا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقے بھی استعمال کرتے ہیں۔ حضرت سید علی ہجویری علیہ الرحمہ نے معروف صوفی حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کا بیان درج کیا ہے:

"حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے سنا کہ روم میں ایک راہب ہے جو ستر سال سے کنیسہ میں زہد و رہبانیت اختیار کئے ہے۔ میں نے تعجب سے کہا کہ رہبانیت کی شرط تو چالیس سال ہوتی ہے، یہ آدم زاد کس مذہب پر ستر سال سے کنیسہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ میں اس سے ملنے گیا۔ اس نے کھڑکی کھول کر مجھ سے بات چیت کی

اور کہا کہ اے ابراہیم! میں جانتا ہوں کہ تم کس کام کے لئے آئے ہو۔ میں یہاں رہبانیت کی غرض سے ستر سال سے نہیں بیٹھا ہوں، بلکہ میرے پاس ایک کتا ہے جو خواہش میں سرکش ہے، میں اس کتے کی رکھوالی کر رہا ہوں تا کہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں ورنہ میں یہاں نہیں رہتا۔ میں نے جب راہب کی بات سنی تو خدا سے مناجات کی کہ اے خدا تو بڑا قادر ہے، کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے شخص کو بھی صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ پھر راہب نے مجھ سے کہا کہ اے ابراہیم! تم کب تک لوگوں کی طلب میں رہو گے، جاؤ پہلے اپنے آپ کو طلب کرو، جب تم اپنے آپ کو پا جاؤ گے تو اس کی نگہبانی کرو کیونکہ ہر روز یہ ہوا یعنی نفسانی خواہش تین سو ساٹھ قسم کی الوہیت کا لباس پہن کر بندے کو گمراہی کی طرف بلاتی ہے۔'' (ایضا صفحہ-۳۰۳)

اسلام سے قبل دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں بھی نفس کشی کو وصال حق کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ رہبانیت اختیار کرنے والے نفس کشی اور مجاہدے پر خصوصی توجہ دیتے تھے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رہبانیت کو بھی دیگر مذاہب میں نفس کشی کا ایک ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

نفس کشی کے عجیب واقعات:

ہندستان میں جب تصوف پہنچا تو اپنے تمام لوازمات کے ساتھ پہنچا اور یہاں کے اہل تصوف نے بھی ابتدائی عہد کے صوفیہ کی تقلید کی۔ ان کے یہاں مجاہدہ اور نفس کشی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی لہٰذا یہاں بھی اسے اہمیت حاصل ہوئی۔ اہل طریقت شب و روز مجاہدہ اور چلہ کشی کر کے نفس امارہ کو مارنے کی کوشش کرتے رہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مختلف کتابوں میں ملتا ہے کہ ہندستان میں داخل ہونے کے بعد آپ نے لاہور میں حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری علیہ الرحمہ کے مزار مقدس کے قریب چلہ کشی فرمائی اور وہاں سے رخصت

ہوتے وقت یہ شعر پڑھا

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا

ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

اسی طرح آپ نے اجمیر میں بھی ایک مدت تک چلہ کشی اور مجاہدہ فرمایا۔ اناساگر جھیل کے قریب آج بھی ایک مقام 'خواجہ صاحب کی چلہ گاہ' کے نام سے مشہور ہے۔ چشتی سلسلے کے دیگر صوفیہ نے بھی عبادت و ریاضت اور مجاہدے کیئے۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمہ کے ملفوظات راحت القلوب (مرتبہ حضرت نظام الدین اولیاء) میں ہے کہ حضرت گنج شکر نے حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہدے کے متعلق فرمایا:

''عبادت الٰہی میں بیس سال تک نہ سوئے نہ ہی لیٹے۔ پھر فرمایا کہ درویش کے لئے نیند حرام ہے۔'' (مجلس-۱۰)

عبادت اور مجاہدے کے ایسے حیرت انگیز واقعات دیگر صوفیہ کے ہاں بھی ملتے ہیں انھیں پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہم ہر معاملے کو اپنی ناقص عقل کے پیمانے پر ناپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل روحانیت ایک ایسی ماورائی طاقت ہے جسے سمجھ پانا عقل و شعور کے باہر ہے۔ ابھی حال ہی میں (۲۰۱۰ء کے وسط میں) مختلف ٹی وی چینلوں اور اخبارات نے ایک خبر نشر کی ہے کہ ایک عمر رسیدہ یوگی نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے بارہ سال سے نہ کچھ کھایا ہے اور نہ ہی پیا ہے اس کے باوجود اس کا جسم نارمل ہے اور روزمرہ کے کام اپنے ہاتھوں سے بہ خوبی انجام دیتا ہے۔ اس شخص کا دعویٰ ہے کہ اس نے ہمالیہ کے جنگلوں میں برسوں تپسیا کی ہے۔ اس شخص کے دعویٰ کی پول کھولنے کی غرض سے ڈاکٹروں نے اسے ایک ایسے مکان میں رکھا جو چاروں طرف سے بند تھا اور ہر جگہ کیمرے لگے ہوئے تھے۔ اسکی ہر پل نگرانی کی جارہی تھی۔ اس نے پندرہ دن اس گھر میں گزارے، اپنے ہاتھ سے ہی گھر کی صفائی کرتا رہا، مگر ماہرین طب کے لئے یہ حیرت کا مقام تھا کہ کچھ نہ کھانے، پینے کے باوجود اس کی صحت اور توانائی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اب سوال یہ

ہے کہ جولوگ صوفیہ کی غیر معمولی عبادت اور مجاہدے پر یقین کرنے کو تیار نہیں، انکے پاس اس یوگی کے اس کمال کا کیا جواب ہے، جو سائنس اور جدید ذہنوں کیلئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے، یہ شخص ہنوز باحیات ہے۔

ترک طعام:

راہ سلوک کے مسافروں کا خیال ہے کہ کھانا پینا ترک کرنے اور زندگی کے عیش وآرام کو چھوڑنے سے ان پر سلوک کے رازوں کا افشا ہوتا ہے۔ خورد ونوش سے اجتناب حکمت کے دروازے کھولتا ہے اور کشف باطن کے سرچشموں تک پہنچاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ صوفیہ کے تذکروں میں ترک طعام کے عجیب وغریب واقعات کثرت سے ملتے ہیں۔

"اکثر وبیشتر صوفیہ پندرہ سے بیس روز تک کسی غذا کو ہاتھ نہیں لگاتے اور بعض چالیس چالیس دن تک کھانا نہیں کھاتے تھے۔ حضرت سہل بن عبداللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پندرہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے اور رمضان کے مہینے میں کچھ بھی نہیں کھاتے تھے۔ بلکہ روایت کے مطابق ستر دن کھانا کھانے سے باز رہتے تھے۔ شیخ ہجویری نے دو بزرگوں کے متعلق اپنا چشم دید واقعہ نقل کیا ہے جو اسی دن سے بھوکے تھے اور نماز باجماعت ادا کررہے تھے۔ بعض صوفیہ کے یہاں ترک طعام کی مدت اس سے بھی زیادہ طویل رہی ہے۔ ابوعقال المغربی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے چار یا سات سال تک کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسی طرح عیسیٰ بن نجم کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے سترہ سال تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ سوئے۔ شیخ ابونصر سراج طوسی کے متعلق مشہور روایت یہ ہے کہ ایک بار وہ رمضان کے مہینے میں بغداد آئے اور مسجد شونیزیہ کے ایک حجرہ میں معتکف ہوئے۔ درویشوں نے اتفاق سے انھیں نماز میں

امام بنایا۔ ماہ مبارک کی تراویح میں پانچ بار قرآن مجید ختم کیا۔ روزانہ افطار کے وقت خادم ایک روٹی حجرہ میں پہنچا آتا تھا۔ عید کی نماز پڑھا کر بغداد سے روانہ ہو گئے، خادم نے حجرہ میں جا کر دیکھا تو تمام روٹیاں جوں کی توں رکھی ہوئی تھیں۔" (تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ، صفحہ ۵۸ بحوالہ الرسالہ القشیرہ، کشف المحجوب، کتاب اللمع، خیر المجالس، تنبیہ المغترین)

دراصل ترک طعام مجاہدے کا ہی ایک حصہ ہے، اس لئے راہ سلوک پر چلنے والوں کے لئے لازم ہے کہ اس پر عمل کریں۔ ترک طعام سے جہاں جنسی خواہشات پر قدغن لگتی ہے وہیں نفسانی خواہشات بھی قابو میں رہتی ہیں۔ بلکہ بعض تو کہتے ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن بھوکے رہنے کے بعد خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا اسی طرح جو شخص خلوص اور صدق دل کے ساتھ چالیس روز تک ترک طعام کرے اسے علم لدنی حاصل ہوتا ہے اور خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ ویسے بھی اہل تصوف کے نزدیک زندگی کا مقصد کھانے پینے سے لذت حاصل کرنا نہیں ہے۔ وہ زندگی کو کھانے کے لئے نہیں بلکہ کھانے کو زندگی کے لئے سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے خیال میں اگر کبھی کبھی کھا لیا جائے تو جینے کے لئے کافی ہے اور جسم خدا کی عبادت کے لئے توانائی حاصل کر لے گا۔ یہ کھانا بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ صوفی لذت اور حظِ نفس کے لئے نہ کھائے بلکہ اس میں بھی اللہ کی رضا جوئی شامل ہو۔ حضرت بابا فرید گنج شکر فرماتے ہیں:

"جب لوگ کھانا کھائیں تو چاہئے کہ طاعت کو ثابت کریں کیونکہ طاعت کیلئے کھانا بھی طاعت ہے اور ہوائے نفسانی کیلئے کھانا نہیں کھانا چاہئے۔"

اسی کے فوراً بعد راحت الارواح (حمید الدین ناگوری) کے حوالے سے آپ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

"دجلہ کے کنارے ایک درویش کی کٹیا تھی۔ ایک درویش اس کے پاس آیا۔ پہلے درویش نے کھانا تیار کر کے اپنے اہل وعیال سے کہا یہ کھانا اس

درویش کو دو۔ اس کی عورت نے کہا راہ میں کشتی تو ہے نہیں کیسے اس پار جاؤنگی؟ درویش نے کہا کنارے پر پہنچ کر یہ کہنا، اس درویش کی حرمت سے جس نے ان تیس سالوں سے کبھی صحبت نہیں کی، مجھے راہ دے دو، وہ راستہ بنا دے گا۔ عورت سن کر متعجب ہوئی کہ اتنے فرزند تو نے پیدا کئے ایسی بات تو کیوں کہتا ہے؟ عورت کھانا باندھ کر دریا پر گئی جو سمجھایا تھا وہ الفاظ دہرائے۔ دریا پھٹ گیا، راستہ پا کر درویش کے سامنے کھانا رکھا۔ درویش نے کھانا کھا کر کہا جاؤ۔ عورت حیران ہوئی واپس کیسے جاؤں؟ درویش نے پوچھا آئی کس طرح تھی؟ اس نے کہہ سنایا۔ سرویش نے کہا اب دریا کے کنارے جا کر یہ کہنا کہ اس درویش کی حرمت سے جس نے تیس سالوں سے کھانا نہیں کھایا، راہ دے۔ اس عورت نے ایسا ہی کیا، دریا نے راستہ دے دیا۔ پار جا کر اپنے خاوند سے کہا ان دونوں جھوٹ کی وجہ بیان کرو۔ اس نے کہا ہم دونوں نے سچ کہا، اس لئے کہ میں نے خواہش نفسانی کے لئے صحبت نہیں کی بلکہ حق ادائیگی کہ لئے اور درویش نے بھی ہوائے نفسانی کیلئے کھانا نہیں کھایا بلکہ طاعت کی قوت کے لئے۔"

(راحت القلوب، مجلس-۱۰) (فوائد الفواد میں بھی یہ واقعہ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ ہے)

صوفیہ کی یہ سوچ صرف کھانے پینے تک محدود نہیں، وہ زندگی کے ہر معاملے میں طاعت کا خیال رکھتے ہیں۔ تمام شعبۂ حیات میں وہ اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کا عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہو۔ ویسے بھی اسلام نے انسان کی ہر قدم پر رہنمائی کی ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک حیات انسانی کا کوئی ایسا موقع نہیں جہاں رہنمائی نہ ملتی ہو۔ اسی پر خلوص نیت کے ساتھ چلنے کا نام عبادت ہے۔ اہل تصوف اسی پر عمل پیرا نظر آتے ہیں اور انکی زندگی کا لمحہ لمحہ عبادت بن جاتا ہے۔

مجاہدے کی اہمیت:

ابتدائی ایام سے ہی مجاہدہ تصوف کا جز ولاینفک ہے۔نفس کشی اور عبادت وریاضت کی کثرت صوفیہ کی شناخت رہی ہے۔تصوف کی تاریخ میں ایک صوفی ایسا نہیں ملتا جس نے مجاہدہ نفس کشی اور عبادت وریاضت کی کثرت نہ کی ہو۔صوفیہ کے تذکرے مجاہدات کے حیرت انگیز واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمہ خود اپنے مجاہدے کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''میں تیس سال مجاہدے میں رہا۔مجھے دن رات کی کوئی تمیز نہ تھی، البتہ نماز کے وقت نماز ادا کر لیا کرتا تھا اور پھر اسی عالم میں مشغول ہو جاتا۔''

(راحت القلوب، مجلس ۲۲)

بابا صاحب کی نظر میں مجاہدے کو راہ سلوک میں خصوصی اہمیت حاصل ہے وہ خود مجاہدہ کرتے ہیں، اپنے خلفاء اور مریدین کو مجاہدے کا درس دیتے ہیں اور اپنے ماقبل صوفیہ کے مجاہدات کے واقعات بیان کر کے انھیں مجاہدے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔راحت القلوب میں آپ کے مرید خاص اور جانشین محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ آپ کی ایک مجلس کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ مجاہدے کے واقعات بیان کرتے ہوئے آپ کئی بار نعرہ مار کر بیہوش ہو جاتے۔جن صوفیہ کے واقعات مجاہدہ بابا صاحب اپنی مجلس میں بیان کرتے تھے ان میں سب سے اہم حضرت بایزید بسطامی، حضرت ذوالنون مصری اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ہیں۔بابا صاحب ایک مجلس میں فرماتے ہیں:

''خواجہ بایزید سے مجاہدے کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا کہ میں بیس سال تک عالم تفکر میں آسمان کی طرف آنکھیں لگائے کھڑا رہا اور اس بیس سال میں مجھے یاد نہیں کہ میں بیٹھا، اٹھا یا سویا ہوں۔چنانچہ پاؤں میں سے خون بہہ نکلا اور پشت پا پھٹ گئی۔بعد ازاں دو سال عالم محو میں رہا۔ان دو سالوں میں میں نے نفس کو پیٹ بھر پانی نہیں دیا۔ہاں ہفتے یا مہینے بعد دو ورم پانی

دیتا۔ بعدازاں جب اپنا کام کمال کو پہنچا تو دس سال تک پھر پانی پیٹ بھر نہ دیا۔ بعدازاں نفس کو میٹھے انار کی خواہش ہوئی تو میں وعدے میں ٹالتا رہا۔ چنانچہ دس سال تک نفس یہی خواہش کرتا رہا اور فریاد کرتا رہا کہ تو مجھے اور کب تک مارے گا؟ میں نے کہا اپنے آخری دم تک۔ اگر میں اپنا مجاہدہ بیان کروں تو تم میں سننے کی طاقت نہیں۔ جو معاملات میں نے اپنے نفس سے کیے ہیں وہ صرف کہنے سے ٹھیک بیان نہیں ہو سکتے۔'' (ایضا)

حضرت بایزید بسطامی کا یہ مجاہدہ صرف چند ایام کے لئے نہیں تھا بلکہ بابا صاحب کے قول کے مطابق یہی کیفیت ستر سال تک رہی۔ اس کے بعد کشف باطن ہوا، درمیان سے حجابات اٹھنے لگے:

''آواز آئی کہ اندر آجاؤ! تم نے ہمارے کام میں کوتاہی یا کمی نہیں کی اب ہم پر واجب ہے کہ تم پر تجلی کریں۔ جب یہ آواز سنی تو نعرہ مار کر جان یار کے حوالے کی۔'' (ایضا)

در کوئے تو عاشقاں چناں جاں بدہند
کانجا ملک الموت نگنجد ہرگز

اللہ اکبر یہ تھا بایزید کا مجاہدہ، جس کی انتہا وصال پر ہوئی۔

جس کو ہو جان و دل عزیز تیری گلی میں جائے کیوں

حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمہ کے مجاہدے اور نفس کشی کے متعلق بابا صاحب مزید بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن انھوں نے کھجوریں کھالیں، جس سے عبادت میں سستی آگئی اس کے بعد عہد کرلیا کہ کچھ مدت نفس کو کھجوریں نہ دوں گا، چنانچہ پندرہ سال تک انھوں نے کھجوریں نہ کھائیں۔ اسی طرح حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کے مجاہدے کے تعلق سے بھی بابا صاحب بیان فرماتے ہیں:

''خواجہ ذوالنون مصری علیہ الرحمہ سے لوگوں نے پوچھا کہ مجاہدے میں آپ

نے کہاں تک ترقی کی ہے تو فرمایا! یہاں تک کہ دو دو تین تین سال تک نفس
کو پانی نہیں دیتا تھا۔ دس سال گزر گئے ہیں کبھی نفس کو پیٹ بھر پانی نہیں
دیا اور رات کو جب تک دو مرتبہ قرآن مجید ختم نہیں کر لیتا اور کسی کام میں
مشغول نہیں ہوتا۔'

'(ایضا)

مجاہدے کی یہی کیفیت کچھ دوسرے صوفیہ کے ہاں بھی ملتی ہے۔ برسوں کبھی اپنی کروٹ کو خواب گاہ سے جدا رکھنا، کھانے سے اجتناب کرنا، نفس کے مطالبے کو پورا نہ کرنا، عموما صوفیہ کا عمل رہا ہے۔ حضرت شاہ شجاع کرمانی علیہ الرحمہ کے متعلق بابا فرید فرماتے ہیں کہ چالیس سال تک نہ سوئے۔ عبادت میں محویت کا یہ عالم تھا کہ ہزار ہزار رکعت نماز ادا کرتے۔ یہاں تک کہ جس رات انتقال ہوا اس رات بھی ایک ہزار رکعت نماز ادا کی۔ چالیس سال کی شب بیداری کے بعد جب ایک رات سوئے تو قسمت بیدار ہوا ٹھی اور انوار الٰہی کو خواب میں دیکھا۔ اس خواب کے بعد آپ کی یہ کیفیت ہوگئی کہ جہاں جاتے اپنے اسی کپڑے کو لئے جاتے جسے خواب کے وقت پہن رکھا تھا۔ اسے پہن کر سو جاتے تھے کہ مبادا پھر یہ دولت نصیب ہو جائے۔ غیب سے آواز آئی، اے شاہ شجاع! یہ خواب تو چالیس سال کی بیداری کا ثمرہ تھا۔ جیسا پہلے کیا تھا ویسا ہی کرو، پھر تمہیں یہ دولت نصیب ہوگی۔ حضرت بابا فرید، شاہ شجاع کا مجاہدہ بیان کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:

''جب خواجہ شاہ شجاع کرمانی کا آخری وقت نزدیک پہنچا تو جس روز آپ کا
انتقال ہونے والا تھا اس روز ہزار رکعت نماز ادا کی اور مصلیٰ پر سو گئے۔
حضرت ذوالجلال کا دوبارہ دیدار ہوا کہ شاہ شجاع ابھی آنا چاہتے ہو یا کچھ
دن ٹھہرنا چاہتے ہو۔ عرض کی یا الٰہی اب ٹھہرنے کی جگہ نہیں، میں آنا چاہتا
ہوں۔ اسی اثنا میں آنکھ کھلی تو وضو کر کے دوگانہ ادا کیا۔ عشاء کا وقت تھا
، سر سجدے میں رکھ کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔'' (ایضا)

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

حضرت بابا صاحب، حضرت خواجہ یوسف چشتی قدس سرہ کی نفس کشی اور مجاہدے کے تعلق سے بھی بیان فرماتے ہیں کہ بیس سال تک بہت کم پانی پیتے تھے اور دو رکعت میں پورا قرآن ختم کرلیا کرتے تھے۔ بابا صاحب کسی بزرگ کا قول نقل کرتے ہیں کہ مجاہدہ کا مطلب ہے نفس کو بری حالت میں تڑپا تڑپا کر مارنا، یعنی اسکی خواہش پوری نہ کرنا۔

فاقہ کشی کی فضیلت:

فاقہ کشی اور نفس کشی یہ دونوں باتیں مجاہدے کا حصہ ہیں اور انھیں تصوف میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ حضرات صوفیہ ان اعمال پر زور دیتے ہیں اور راہ سلوک پر چلنے والوں کو اس کی تاکید کی جاتی ہے۔ حضرت سید علی ہجویری علیہ الرحمہ نے کشف المحجوب میں بھوک کی فضیلت بیان کرتے ہوئے رسول محترم ﷺ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھوکے کا شکم ستر عاقل عابدوں سے زیادہ محبوب ہے۔'' (صفحہ-۴۶۷)

داتا صاحب چند سطروں کے بعد ایک دوسری حدیث بھی اسی موضوع پر نقل کرتے ہیں:

''تم اپنے شکموں کو بھوکا، اپنے جگروں کو پیاسا اور اپنے جسموں کو غیر آراستہ رکھو تاکہ تمہارے دل اللہ تعالیٰ کو دنیا میں ظاہر طور پر دیکھ سکیں۔''

(ایضا)

بھوک اور پیاس عام لوگوں کے لئے باعث زحمت ہو مگر اسے تصوف کے راستے میں باعثِ رحمت سمجھا گیا ہے۔ اسے جسم کے لئے بلا مگر روح کے لئے جلا قرار دیا جاتا ہے۔ فاقہ کشی کو باطن کی صفائی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ صوفیہ بھوک کو صدیقوں کی غذا، مریدوں کا مسلک اور شیطان کی قید قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قرب الٰہی

سے دور ہونا ایک لقمہ کی وجہ سے ہی تھا لہٰذا غذا محض اتنی لی جائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو۔ حضرت کتانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"مرید کی شرط یہ ہے کہ اس میں تین چیزیں موجود ہوں۔ ایک یہ کہ اس کا سونا غلبہ کے بغیر نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس کا کلام ضرورت کے بغیر نہ ہو، تیسرے یہ کہ اس کا کھانا فاقہ کے بغیر نہ ہو۔"

(ایضا صفحہ-۴۶۸)

اہل تصوف فاقہ کشی پر متفق ہیں مگر کب کھایا جائے، کتنے ایام تک فاقہ کشی کی جائے اس پر اتفاق نہیں۔ بعض صوفیہ کم از کم دو دن بھوکے رہنے کا حکم دیتے ہیں تو بعض تین شب و روز۔ بعض ایک ہفتہ تو بعض چالیس شب و روز فاقہ کشی کو کہتے ہیں۔ مشائخ کا خیال ہے کہ اصل بھوک تو چالیس دن بعد ہی لگتی ہے لہٰذا چالیس دن فاقہ کشی کی جاسکتی ہے۔ ان کے نظریئے کے مطابق فاقہ کشی سے روح طاقت ور اور نفس کمزور ہوتا ہے۔ نفسانی خواہشات کمزور ہو جاتی ہیں اور باطل کے ارادے ٹوٹ جاتے ہیں۔ حضرت ابوالعباس قصاب علیہ الرحمہ ایک صوفی گزرے ہیں، وہ اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ:

"میری اطاعت و معصیت، دو شکلوں میں منقسم ہے۔ جب میں کھاتا ہوں تو معاصی کا خمیر اپنے میں پاتا ہوں اور جب اس سے ہاتھ کھینچ لیتا ہوں تو طاعتوں کی بنیاد اپنے میں پاتا ہوں"

(ایضا)

مجاہدے کا حاصل:

فاقہ کشی، نفس کشی، فقر اختیاری اور مجاہدہ و ریاضت کے مشکل ترین مرحلے سے گزرنا راہ سلوک میں لازم ہے۔ اس کے بغیر اس راستے پر چلنے والا منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان تمام مشقتوں کا مقصد فناء نفس اور تزکیہ باطن ہے۔ جب صوفی کا نفس فنا ہو جائے اور اس کا

باطن پاکیزہ ہو جائے تو اسے مشاہدہء حق حاصل ہوتا ہے اور یہی راہ سلوک کے مسافر کی منزلِ مقصود ہے۔

جنت میں بھیج یا مجھے دوزخ میں ڈال دے
جلوہ دکھا کے پر میری حسرت نکال دے

❖○❖

حوالہ کے لئے درج ذیل کتابوں کی طرف رجوع کریں:

۱۔قرآن مجید

۲۔رسالہ قشیریہ

۳۔کشف المحجوب

۴۔راحت القلوب

۵۔تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ (ڈاکٹر عبیداللہ فراہی)

۶۔راحت الارواح (مرتبہ،حمیدالدین ناگوری)

۷۔فوائدالفواد (مرتبہ خواجہ امیر حسن)

ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں
شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے؟
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے؟

اقبالؔ

تصوف اور یاد الٰہی

عبد اور معبود کے رشتے کو مضبوط کرنے کا بہترین ذریعہ عبادت ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ انسان اور اسکے پیدا کرنے والے کے بیچ کے رشتے کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے رب کی عبادت کرے۔ عبادت آدمی کے وجود کا مقصد اور عبدیت کی معراج ہے۔ یہی سبب ہے کہ اہل تصوف کا بیشتر وقت یاد الٰہی میں گزرتا ہے۔ آج تک ایسا کوئی صوفی نہیں گزرا جس نے عبادت سے کنارہ کشی کی ہو، کیونکہ عبادت ہی تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ صوفیہ نے عبادت و ریاضت کی مثالیں قائم کیں اور خلوت و جلوت میں یاد خدا میں مصروف رہے۔ وہ صائم الدہر اور قائم اللیل رہے۔ ان میں سے بعض کے تعلق سے سوانح کی کتابوں میں ایسی ایسی حیرت انگیز باتیں درج ہیں، جنھیں پڑھ کر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ ایسے اہل تصوف کی کمی نہیں جو عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرنے کے عادی تھے ایسے صوفیہ بھی کم نہیں

جن پر خوف وخشیت الٰہی سے لرزہ طاری رہتا تھا۔ بعض ایسے صوفیہ کا ذکر ملتا ہے جو کلام الٰہی کی تلاوت کرتے تو خشیت سے کانپ اٹھتے اور بیہوش ہو جاتے۔ اہل تصوف کے ان اعمال وافعال کی بنیاد قرآن مجید اور احادیث طیبہ کے اندر ملتی ہے۔

عبادت کا حکم قرآن میں:

قرآن مجید میں بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عبادت کرنے اور اس سے قرب حاصل کرنے کا حکم فرمایا۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''سجدہ کر اور قریب ہو جا۔'' (سورہ علق، آیت-۱۹)

''آپ انھیں دیکھتے ہیں رکوع اور سجدے کی حالت میں کہ وہ اللہ کا فضل اور اسکی رضا ڈھونڈتے ہیں۔''

(الحجرات، آیت-۲۹)

''اللہ کی رضا بہت بڑی چیز ہے۔'' (التوبہ، آیت-۷۲)

''ذکر خدا کی طرف جلدی کرو۔'' (الجمعہ، آیت-۹)

''یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔''

(العنکبوت، آیت-۵)

''نماز قائم کرو۔'' (البقرہ، آیت-۴۳)

''نماز قائم کرو، دن کے دونوں سروں میں اور رات کے کچھ حصوں میں، بے شک نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے۔'' (قرآن)

قرآن مجید سے یہ صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ ایسے سینکڑوں مقامات ہیں جہاں عبادت وریاضت کا حکم دیا گیا ہے۔ اہل تصوف انھیں آیات کے احکام پر عمل کرتے ہوئے دن اور رات کو یاد الٰہی میں بسر کرتے ہیں۔

عبادت حکمِ رسول:

رسول محترم ﷺ نے خود عبادت و ریاضت میں اپنی زندگی بسر کی اور اپنے اصحاب کو بھی خشوع وخضوع کے ساتھ یادِ الٰہی میں مصروف رہنے کا حکم دیا۔آپ سید المعصومین ہیں ،اس کے باوجود پوری پوری رات قیام وقعود اور رکوع وسجود میں گزار دیتے ۔توبہ واستغفار اور دعاء ومناجات میں اس قدر روتے کہ آپ کی مبارک داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی ۔رسول اللہ ﷺ کے یہ اعمال تعلیم امت کے لئے تھے اور اسی سنت پر صوفیہ کا عمل ہے۔ بعثت سے قبل غار حرا میں کئی کئی دن تک یاد الٰہی میں مصروف رہنے کا ذکر سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ حضرات صوفیہ بھی اس طریقے پر عامل نظر آتے ہیں اور ان کا ایک بڑا طبقہ جنگلوں ، بیابانوں اور غاروں میں معتکف نظر آتا ہے۔ دراصل ذکر الٰہی ایک بڑی دولت ہے۔اس سے جہاں ایک طرف اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے، وہیں سکون قلب بھی میسر آتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''نماز دین کا ستون ہے۔'' (طبرانی)

''فرض نماز جان بوجھ کر مت چھوڑنا، جو شخص فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑ دیتا ہے اللہ کا ذمہ اس سے بری ہے۔'' (طبرانی)

''جو شخص نماز کا اہتمام کرے تو نماز اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی اور حساب پیش ہونے کے وقت حجت ہوگی اور نجات کا سبب ہوگی۔''

(بیہقی ، دارمی ابن حبان)

''سات آدمی ہیں ، جن کو اللہ تعالیٰ اپنے (رحمت کے) سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا ، جس دن اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ایک عادل بادشاہ ، دوسرا وہ جوان جو جوانی میں اللہ کی عبادت کرتا ہے، تیسرے وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹک رہے، چوتھے وہ دو شخص جن میں اللہ کے واسطے محبت ہو اور اسی پر ان کا اجتماع ہو اور اسی پر جدائی۔ پانچویں وہ شخص جس کو

کوئی حسین، شریف عورت اپنی طرف متوجہ کرے اور وہ کہہ دے کہ مجھے اللہ کا ڈر منع کرتا ہے۔ چھٹے وہ شخص جو ایسے مخفی طریقے سے صدقہ کرے کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ ساتویں وہ شخص جو اللہ کا ذکر تنہائی میں کرے اور آنسو بہنے لگیں۔'' (بخاری، مسلم)

''قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ عقل مند لوگ کہاں ہیں؟ لوگ پوچھیں گے کہ عقل مندوں سے کون مراد ہیں؟ جواب ملے گا وہ لوگ جو اللہ کا ذکر کرتے تھے، کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے اور آسمانوں زمینوں کی پیدائش میں غور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یا اللہ تو نے یہ سب بے فائدہ تو پیدا نہیں کیا۔ ہم سب تیری تسبیح کرتے ہیں، ہمیں جہنم کی آگ سے بچالے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے لئے ایک جھنڈا بنایا جائے گا، جس کے پیچھے سب جائیں گے، اور ان سے کہا جائے گا کہ ہمیشہ کے لئے جنت میں داخل ہو جاؤ۔'' (ترغیب)

احادیث میں متعدد جگہوں پر ذکر الٰہی کی ترغیب ملتی ہے اور یہی سبب ہے کہ اہل تصوف ذکر وفکر اور یاد الٰہی میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خالق کی یاد انھیں دنیا و مافیہا سے اس قدر بے نیاز کر دیتی ہے کہ وہ حال سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔

عبادت اور صوفیہ:

حضرات صوفیہ، حکم الٰہی پر عمل کرتے ہوئے اس کی عبادت میں گم رہتے ہیں۔ ان کے سامنے رسول محترم کا وہ فرمان عالیشان ہوتا ہے، جس میں آپ نے فرمایا کہ ’ویسی نماز پڑھو جیسا کہ مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو‘ ظاہر ہے اللہ کے رسول کے حکم کا مقصد ہے کہ آپ کے طریقے پر کمال خشوع کے ساتھ نماز ادا کی جائے اور انہماک کے ساتھ اس کی عبادت کی جائے۔ طریق تصوف کو عام طور پر حضرات ابوبکر صدیق اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کی جانب

منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں اصحاب انتہائی دلجمعی کے ساتھ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ حضرت علی کی نماز کے بارے میں داتا گنج بخش لکھتے ہیں:

''امیرالمومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ جب نماز کا ارادہ فرماتے تو ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اور فرماتے کہ اس امانت کے ادا کرنے کا وقت آ گیا جس کا بار زمین و آسمان اٹھانے سے عاجز رہے تھے۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۴۳۲)

صوفیہ کے ہاں نماز کا مطلب محض رکوع و سجود اور قیام و قعود نہیں بلکہ وہ نماز کو اس کے اصل مفہوم میں لیتے ہیں۔ عبادت کا مطلب حق عبادت ادا کرنا ہے۔ جیسا کہ حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق متعدد کتابوں میں درج ہے:

''ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حاتم اصم سے میں نے پوچھا کہ آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ جب اس کا وقت آتا ہے تو ایک ظاہری وضو کرتا ہوں، دوسرا باطنی وضو۔ ظاہری وضو پانی سے اور باطنی وضو توبہ سے۔ پھر جب مسجد میں داخل ہوتا ہوں تو مسجد حرام کے روبرو دونوں ابرو کے درمیان مقام ابراہیم رکھتا ہوں اور اپنی داہنی جانب جنت، بائیں جانب دوزخ کو دیکھتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ میرے قدم پل صراط پر ہیں اور ملک الموت میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اس حال میں کمال عظمت کے ساتھ تکبیر، حرمت کے ساتھ قیام، ہیبت کے ساتھ قرات، تواضع کے ساتھ رکوع، تضرع کے ساتھ سجدہ، حلم و وقار کے ساتھ جلسہ اور شکر و اطمینان کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں۔'' (ایضاً)

ظاہر ہے حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کی جو نماز ہے اسی کا مطالبہ قرآن و احادیث میں ہے، نہ وہ نماز کہ سر سجدے میں ہو اور دل یاد الٰہی سے غافل ہو۔ وہ نماز کامل نہیں ہو سکتی جس میں معبود کا خیال شامل نہ ہو۔ اہل تصوف سے اسی نماز کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جو عین طریق رسول کے مطابق

ہو۔ جس میں خشوع و خضوع، حلم و وقار، عجز و انکسار شامل ہو۔

نماز طریقت:

شرعی اعتبار سے وہ نماز درست ہے جس میں تمام فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات پر عمل کرلیا جائے۔ اگر چہ نماز میں ایک بار بھی اللہ کا خیال نہ آیا ہو لیکن تمام ارکان کی درست ادائیگی ہوگئی تو نماز ہو جاتی ہے، مگر اہل تصوف کی نظر میں وہ عبادت ہی کیا جو معبود کے تصور سے خالی ہو۔ حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ کا قول نقل کرتے ہیں:

> ''نماز پڑھنے والا چار چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔ نفس کی فنا، طبع کا خاتمہ، باطن کی صفائی اور مشاہدہ کا کمال۔'' (ایضاً صفحہ-۴۳۵)

داتا صاحب آگے فرماتے ہیں:

> ''کیونکہ مصلی کے لئے فنائے نفس کے بغیر چارہ نہیں۔ وہ بجز جمع کے ہمت نہیں کرتا اور جب ہمت مجتمع ہو جاتی ہے تو نفس کا اختیار جاتا رہتا ہے کیونکہ اس کا وجود تفرقہ سے ہے۔ جو بیان جمع کے تحت نہیں اور طبع کا خاتمہ اثباتِ جلال الٰہی کے بغیر نہیں ہوتا، کیونکہ جلال حق غیر کو زائل کر دیتا۔ ہے۔ باطن کی صفائی محبت کے بغیر ممکن نہیں اور کمال مشاہدہ باطن کی صفائی کے بغیر متصور نہیں۔'' (ایضاً صفحہ-۴۳۶)

یہ عبادت کا درجۂ کمال ہے کہ عابد نفس کی فنا کے ساتھ عبادت کرے۔ دوران عبادت وہ اپنی ذات کو فراموش کردے اور یہ محویت جب اس درجہ ہوگی تو طبع کا خاتمہ بھی ہو جائیگا۔ باطن کی صفائی بھی عبادت کرنے والے کے لئے ضروری ہے۔ یہ اس لئے بھی لازم ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنے معبود کے نور کا مشاہدہ نہیں کرسکتا، اور فنائے ذات تب ہی ممکن ہے جب عابد نورِ حق کا مشاہدہ کرے۔ جب عبادت درجۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے تو وہ طریقت کے مطابق کہی جاسکتی ہے۔ حالانکہ شریعت میں بھی اسی عبادت کا مطالبہ ہوتا ہے مگر اس کے بغیر بھی ادائیگی بہرحال

ہو جاتی ہے اور فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ وہاں وجود عبادت فرضیت کو ساقط کر دیتا ہے مگر طریقت میں کمالِ عبادت کے بغیر چارہ نہیں۔

تصوف میں کثرتِ عبادت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور کمالِ عبادت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ان دونوں مطالبات پر اہل تصوف کا عمل رہا ہے اور ان کے ہاں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ کثرتِ عبادت کی مثال حضرت حسین بن منصور حلاج کی زندگی میں نظر آتی ہے، انھوں نے اپنے اوپر چار سو رکعات نماز کو لازم کر رکھا تھا۔ پوچھنے والے نے سوال کیا:

''اس قدر درجۂ کمال رکھتے ہوئے اتنی مشقت کیوں؟ انھوں نے فرمایا یہ تمام رنج و راحت تمہاری حالت کا پتہ دیتا ہے۔ حق تعالیٰ کے کچھ دوست ایسے ہیں جن کی صفات فنا ہو چکی ہیں۔ ان پر نہ رنج اثر کرتا ہے نہ راحت۔ کاہلی کو رسیدگی کا نام نہ دو اور نہ حرص کا نام طلب رکھو۔'' (ایضا صفحہ-۴۳۶)

کچھ اسی قسم کی مثال حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔

''حضرت جند بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جب بوڑھے ہو گئے تو اس بڑھاپے میں بھی جوانی کے کسی وِرد کو نہ چھوڑا۔ لوگوں نے عرض کیا، اے شیخ اب بوڑھے ہو گئے، کمزور ہو گئے ہیں، ان میں سے کچھ نوافل چھوڑ دیجئے۔ انھوں نے فرمایا یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کو ابتدا میں کر کے اس مرتبہ کو پایا ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ انتہا پر پہنچ کر ان سے دست بردار ہو جاؤں۔'' (ایضا)

یہ تمام کثرت عبادت کی مثالیں ہیں مگر ان اہل تصوف کے ہاں کمال عبادت کی مثالیں بھی بہت ملتی ہیں۔ جیسا کہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کتابوں میں آتا ہے کہ آپ فنائے نفس کے ساتھ عبادت کیا کرتے تھے۔

''ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا تھا۔ جب انھوں نے تحریمہ کے وقت اللہ اکبر کہا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے، گویا کہ جسم میں حس و حرکت ہی نہیں رہی۔'' (ایضا)

اسی طرح فنائے نفس کے ساتھ عبادت کا ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن مبارک بیان کرتے ہیں:

''فرماتے ہیں کہ مجھے وہ عورت خوب یاد ہے جسے میں نے بچپن میں دیکھا جو بہت عبادت گزار تھی۔ بحالت نماز ایک بچھو نے اس عورت کو چالیس بار ڈنک مارا، مگر اسکی حالت میں ذرہ برابر تغیر نہ ہوا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے کہا اے اماں! اس بچھو کو تم نے کیوں نہیں ہٹایا؟ اس نے کہا اے فرزند! تو ابھی بچہ ہے۔ یہ کیسے جائز تھا میں اپنے رب کے کام میں مشغول تھی اپنا کام کیسے کرتی؟'' (ایضا)

چشتی بزرگوں میں کثرتِ عبادت:

اصل عبادت تو وہی ہے جو محویت اور فنائے نفس کے ساتھ ادا کی جائے۔ اہل تصوف کا اسی پر عمل رہا ہے اور اس میں بھی کثرت عبادت پر زور دیا جاتا ہے۔ چشتی سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر کے ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا بھی کثرتِ عبادت کی روایت پر عمل تھا۔ فرماتے ہیں:

''میں بیس سال فکر میں رہا اس بیس سال کے عرصہ میں ہمیشہ کھڑا رہا چنانچہ سارا خون پاؤں کی راہ رواں ہو گیا۔ اس عرصہ میں عہد کر رکھا تھا نہ ہی نفس کو سرد پانی پلاؤ نگا اور نہ کھانے کا لقمہ دونگا۔'' (راحت القلوب، مجلس-۹)

چشتی سلسلہ جو ہندستان کے طول وعرض میں خوب رائج ہوا اس میں کثرت عبادت اور فنائے نفس پر خاص زور دیا گیا ہے۔ شیوخ اپنے مریدین کو اس جانب ہمیشہ مائل کرتے رہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ جنھیں ہندستان میں اس سلسلے کا بانی تصور کیا جاتا ہے اپنے پیرومرشد خواجہ عثمان ہارونی علیہ الرحمہ کے ملفوظات 'انیس الارواح' میں اپنے پیر کے حوالے سے درج کرتے ہیں:

''فرمایا! میں سمرقند میں مسافر تھا۔ میری ملاقات شیخ عبدالواحد سمرقندی سے ہوئی۔ ان کا فرمان تھا، ایمان میں مزہ ہی تب آتا ہے جب رات اور دن کو قیام کیا جائے۔ جو یہ دونوں کام کرتا ہے وہ یہ مزہ چکھتا ہے۔'' (مجلس-۱۳)

اسی کتاب میں آگے تحریر فرماتے ہیں:

(حضرت خواجہ عثمان ہارونی نے) پھر فرمایا امام ابوحنیفہ تیس سال تک رات کو نہیں سوئے۔ آپ نے جب آخری حج کیا تو خانہ کعبہ کے مجاوروں سے دروازہ کھلوا کر دوگانہ پڑھنے لگے اور پندرہ پارے پڑھ کر دوگانہ تمام کیا۔۔۔۔۔۔۔ پھر فرمایا یوسف چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال تک شب خیزی کی اور خواجہ احمد بلال چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے تیس سال تک قیام کیا۔ وہ ہر رکعت میں دو دفعہ قرآن مجید ختم کرتے تھے۔'' (ایضا)

اہل تصوف عبادت الٰہی کو قرب الٰہی کا ذریعہ تصور کرتے تھے اسی لئے ان کے یہاں کثرتِ عبادت اور انہماکِ عبادت کو خاص درجہ حاصل تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ کی تعلیمات میں بھی اس پر خاص زور ملتا ہے۔ 'دلیل العارفین' آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ نے جمع کیا تھا۔ اس میں جگہ جگہ عبادت کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اور کثرت عبادت کے ساتھ ساتھ خشوع وخضوع کا بھی حکم ہے۔

''حضرت خواجہ نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا، صرف نماز ہی وہ فریضہ ہے جس سے لوگ نزدیک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ نماز مومن کی معراج ہے۔ حدیث میں آیا ہے الصلوۃ معراج المومن۔ تمام مقام سے بڑھ کر نماز ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ملاپ نماز کی بدولت ہوتا ہے۔

پھر فرمایا نماز ایک راز ہے جو بندہ اپنے خالق سے بیان کرتا ہے۔ وہی قرب پا سکتا ہے جو راز کے قابل ہو۔ نماز کے بغیر یہ راز حاصل نہیں ہوتا۔ اسی موقع پر فرمایا عارف ہر وقت عشق الٰہی میں مبتلا رہتا ہے۔ قدرت الٰہی سے آفرینش

میں متحیر رہتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے دوست کا ذکر کرتا ہے۔ سوتے وقت خیال
میں متحیر رہتا ہے اگر جاگتا ہے تو اللہ کے حجاب عظمت کے گرد طواف کرتا
ہے۔'' (مجلس اول)

یادِ الٰہی، ذکرِ الٰہی اہل تصوف کے لئے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ بغیر اس کے عرفان کا حصول ممکن نہیں۔ قرب خداوندی حاصل کرنے کے لئے لازم ہے کہ عبادت وریاضت کے ذریعے دل کے آئینے کو شفاف کیا جائے، تب ہی مشاہدے کا کمال حاصل ہوتا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی مزید فرماتے ہیں:

''عرفان میں ایک حالت ہوتی ہے جب اس پر حالت طاری ہوتی ہے تو وہ
ایک ہی دم میں عرش سے حجابِ عظمت تک کا فاصلہ طے کرلیتا ہے۔ وہاں
سے حجابِ کبریا تک پہنچ جاتا ہے، پھر دوسرے قدم پر اپنے مقام پر آجاتا
ہے۔ پھر خواجہ صاحب آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا عارف کا سب سے کم درجہ یہی
ہے لیکن کامل کا درجہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کہاں سے کہاں تک ہے۔''

(ایضا)

تصوف کا مرکزی نقطہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس لئے ہر عمل کا مقصد اس تک رسائی اور عرفان حاصل کرنا ہے۔ عبادت اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور عرفان حاصل کرنے والے کو عارف کہتے ہیں۔ یہی وہ بندہ ہے جس کے متعلق اوپر فرمایا گیا کہ ایک ہی قدم میں عرش سے حجاب عظمت تک کا فاصلہ طے کرلیتا ہے، لیکن اسے عرفان کی اولین منزل قرار دیا گیا ہے آخری منزل کیا ہے، یہ خدا ہی جانے۔

عبادت بغیر محویت اور شیفتگی کے عبادت نہیں۔ اہل تصوف اسی عبادت کو عبادت تصور کرتے ہیں جس میں بندہ خود کو فنا کردے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنھیں بیشتر سلاسل تصوف کا بانی خیال کیا جاتا ہے، نماز میں اس قدر محو ہوجایا کرتے تھے کہ دنیا سے بالکل غافل ہوجاتے۔
آپ نماز میں تھے کہ آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر دل جمعی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ نماز کے

بعد خود کو خون میں لت پت دیکھا تو دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔آپ کی زبان مبارک سے نکلا فزت برب الکعبہ (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔)

یہ فنائے نفس کی حالت تھی جس کا مطالبہ صوفیہ کے ہاں کیا جاتا ہے۔اسرار الاولیاء (مرتبہ خواجہ بدرالدین اسحٰق) میں ہے، حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر نے فرمایا:

''اے درویش! تصوف کے مذہب اور سلوک کے مطابق وہ شخص صوفی اور سالک ہی نہیں، جو یادِ حق میں نہیں۔اس واسطے کہ جس دم وہ یادِ الٰہی سے غافل رہتا ہے اسے کیا معلوم کہ کیسی کیسی نعمتیں ہٹائی گئی ہیں۔اس لئے جہاں تک ہو سکے یاد الٰہی سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔پھر فرمایا جو لوگ ہر وقت یاد الٰہی میں مستغرق رہتے ہیں اکثر استغراق کی حالت میں ان کے سر پر تلوار بھی چلائی جائے تو بھی خبر نہیں ہوتی۔۔۔۔پھر فرمایا کہ جس وقت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی اپنے وقت میں حاضر ہوتے تو بہت ذکر کرتے اور جب حالت زیادہ ہو جاتی تو ایک دن رات مصلے پر بیہوش پڑے رہتے اور اپنے آپ کی کوئی خبر نہ ہوتی۔۔۔بعد ازاں فرمایا کہ اہل تصوف صرف اسی دل کو زندہ سمجھتے ہیں جو یاد الٰہی میں مستغرق ہو اور ایک دم بھی یاد الٰہی سے غافل نہ ہو۔۔۔'' (فصل-۱۷)

اہل تصوف انسان کے وجود کا مقصد ہی یاد الٰہی سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں جو چیز اپنا مقصد وجود کھو دے اسکا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔اسی لئے وہ صرف اسی دل کو زندہ سمجھتے ہیں جو یادِ حق میں مستغرق ہو، گویا:

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

کشمیر کے ایک مشہور صوفی ہیں حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ۔آپ

نے انتہائی عبادت وریاضت کے بعد جلیل القدر منزلیں طے کیں۔آپ کے متعلق تذکروں میں آتا ہے کہ بیس سال تک خانقاہ میں معتکف رہے اور ہر قسم کے آرام کو چھوڑ کر شب بیداری کرتے رہے۔دوران ریاضت ان کا پہلو زمین سے الگ رہا۔مشہور کشمیری صوفی شاعر شیخ خاکی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

معتکف درخانقہ بودہ قریب بست سال

معسر العشرین بعیش قرب حق اعشر شداست

درریاضت سالہا نہادہ پہلو بر زمیں

حاملش ایں مرتبہ ازاذکر واسحر شداست

(تذکرہ اسلاف، صفحہ-۱۸۲)

(ترجمہ: آپ نے خانقاہ میں تقریباً بیس سال معتکف رہ کر گزارے، اگر چہ یہ زمانہ تنگدستی میں گزرا لیکن قرب الٰہی کی بدولت آپ خوشحال تھے۔آپ نے اس قدر عبادت کی کہ سالہا سال تک اپنے پہلو مبارک کو زمین پر نہیں رکھا۔یہ مقام ومرتبہ کثرت ذکر وشب بیداری سے پائی۔)

''تاریخ شائق'' کے مطابق آپ سمنی چک کی خانقاہ میں گیارہ سال تک عبادت وریاضت کرتے رہے۔یہ کیفیت صرف چند اہل تصوف کی نہیں تھی بلکہ تمام ہی صوفیہ بے حد عبادت گزار اور متقی و پرہیزگار تھے۔ان کا بیشتر وقت یادالٰہی میں صرف ہوتا تھا۔انھیں یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی انکی تنہائی میں دخیل ہو، انکی عبادت میں خلل ڈالے، حالانکہ اس کے باوجود ان کے مشاغل میں دینی علمی، اور سماجی خدمات شامل تھیں۔ان اہل تصوف نے جہاں اپنے مریدین وخلفاء کو تقویٰ وپرہیزگاری کا درس دیا وہیں درسگاہیں بھی قائم کیں اور درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ان صاحبِ عرفان بزرگوں نے مختلف علمی موضوعات پر کتابیں تحریر کیں، شعر شاعری سے شغف رکھا اور عوام الناس کے مسائل سے بھی واقف رہے، رفتارِ زمانہ پر گہری نظر رکھی اور اس کے مطابق اپنے مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔انکی دینی تبلیغی علمی اور اصلاحی کوششیں رفتارِ زمانہ کے مطابق ہوتی تھیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات اپنے دور کے حالات سے کس قدر باخبر

رہتے تھے۔ان تمام مصروفیات کے باوجود یادِ الٰہی میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کو بھی کبھی ترک نہیں کرتے تھے۔اسی کے ساتھ پوری پوری رات ذکرِ الٰہی میں گزارتے تھے اور 'دست بہ کارودل بہ یار' کی عملی تصویر نظر آتے تھے۔سچ ہے۔

ہے سوز دروں سے زندگانی
اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ

اس مضمون میں درج ذیل کتابوں کے حوالے ہیں:

۱۔قرآن مجید
۲۔طبرانی
۳۔دارمی
۴۔ابن حبان
۵۔بخاری
۶۔مسلم
۷۔ترغیب
۸۔کشف المحجوب
۹۔راحت القلوب
۱۰۔انیس الارواح
۱۱۔دلیل العارفین
۱۲۔اسرار الاولیاء
۱۳۔تذکرہ اسلاف (پروفیسر عبدالمجید سائر)
۱۴۔تاریخ شائق

صبر کا انجام بہترین اور غصے کا انجام بدترین ہوتا ہے۔

(مکاشفۃ القلوب)

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اقبالؔ

تصوف اور توکّل

'توکّل' کا مادہ 'وکل' ہے اور یہ وکالت سے مشتق ہے۔ اس کا مطلب ہے، اپنا معاملہ کسی کے سپرد کر دینا۔ جس کے حوالے اپنے معاملے کئے جائیں اسے وکیل کہا جاتا ہے اور کسی کو اپنا وکیل بنانے کے لئے شرط ہے کہ اس پر کامل یقین ہو اور نفس مطمئن ہو۔ نہ اس پر کسی قسم کا کوتاہی کا الزام لگایا جائے اور نہ ہی اس کے عجز و قصور کا اعتقاد ہو۔ دوسرے الفاظ میں توکّل، وکیل پر کامل یقین اور پختہ اعتماد کا نام ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اللہ کی ذات پر کامل یقین اور اپنے معاملات کو اس کے سپرد کرنے کو توکّل کہتے ہیں۔ توکّل دراصل ایمان وایقان کی تکمیل کا نام ہے۔ بندہ جب اپنے خالق کی ذات میں پختہ اعتماد رکھتا ہے اور اسے یقین ہے کہ مخلوقات کے تمام معاملات خالق و مالک کے دست قدرت میں ہیں، وہ جیسا چاہتا ہے ویسا کرتا ہے، جتنا چاہتا ہے اتنا رزق عطا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے فاقہ میں رکھتا ہے، جب چاہتا ہے مرض دیتا ہے اور جب

اسکی مرضی ہوتی ہے شفا عطا فرماتا ہے۔ آرام و تکلیف اسی کے ہاتھ میں ہے لہٰذا عبدیت کا تقاضہ یہ ہے بندہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کرے اور خود کو مرضی مولیٰ کے تابع بنالے۔ اگر اسے زندگی میں کچھ اچھا نظر آئے تو اللہ کا شکریہ ادا کرے اور کوئی تکلیف ہو تو اسے بھی مالک کی مرضی جانے ہر حال میں اس کا شکر کرے کسی بھی حال میں ناشکری نہ کرے۔

صوفیہ توکّل کو راہ سلوک کے طالب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اسے انبیاء کی صفت قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش کرتے ہیں، جنھوں نے سب کچھ راہِ خدا میں صدقہ کر دیا۔ یہاں تک کہ جس پیالے کو وہ پانی پینے کے لئے استعمال کرتے تھے اسے بھی صدقہ کر کے دونوں ہاتھوں کے چلو سے پانی پینے لگے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرتے ہوئے آتش کدۂ نمرود میں جانا گوارا کرلیا۔ جب اللہ کے فرشتے نے پوچھا کہ کوئی حاجت ہو تو بیان کریں تو خلیل اللہ کا جواب تھا، حاجت تو ہے مگر تم سے نہیں۔ فرشتے نے کہا پھر حاجت روا خدا سے ہی طلب کریں۔ حضرت ابراہیم نے جواب دیا ،اس سے طلب کیا کرنا وہ تو میری حاجتوں سے باخبر ہے۔

توکّل قرآن میں:

صوفیہ توکل کو عین حکم خداوندی اور منشاء الٰہی تصور کرتے ہیں۔ وہ اس کے لئے قرآن مجید سے دلیلیں لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

''اور اللہ پر ہی توکّل کرو، اگر تم مومن ہو۔''

(سورہ مائدہ۔ آیت-۲۳)

''اور توکل کرنے والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیۓ۔''

(سورہ ابراہیم، آیت-۱۲)

''اور جو شخص اللہ پر توکل کرے تو وہ کافی ہے۔''

(سورہ طلاق، آیت-۳)

''بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

(سورہ آل عمران، آیت-۱۵۹)

''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کافی نہیں ہے۔''

(سورہ الرمز، آیت-۳۶)

مندرجہ بالا آیات میں توکل کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ یقیناً وہ بندہ خوش نصیب ہوگا جو اللہ پر یقین کامل رکھنے والا ہوگا اور توکّل کی وجہ سے وہ خدا کے محبوبوں میں شامل ہوگا اور اسکی رعایت کا مستحق ہوگا۔ ان آیات سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں جس پر کامل بھروسہ کیا جاسکے، کیونکہ تمام مخلوقات اپنی بھلائی اور حاجت روائی کے لئے اسی کی محتاج ہیں۔ کائنات کے ذرے ذرے کا وہی خالق اور حاجت روا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ تمام مخلوقات سے اپنی امیدوں کو ختم کرکے صرف اور صرف اللہ کی ذات سے اپنی توقعات کو وابستہ کرلے، حقیقی حاجت رواوہی ہے۔

توکّل حدیث کی روشنی میں:

توکل کے متعلق جس طرح قرآن میں بیان کیا گیا ہے اسی طرح احادیث میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے۔ ایک دوبار نہیں سیکڑوں مقامات پر توکل کا بیان ہے۔ نبی پاک ﷺ نے اسکی تاکید فرمائی ہے اور بندگان خدا کو اسی کی ذات پر کامل اور اکمل بھروسہ کی ترغیب دی ہے۔ صوفیہ بہت سی احادیث کو بھی توکل کی فضیلت میں پیش کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اگر تم اللہ پر واقعی توکل کرو، تو وہ تمہیں اس طرح رزق عطا فرمائے جس طرح پرندے کو رزق دیتا ہے۔ وہ صبح کو خالی پیٹ نکلتا ہے اور شام کو سیر ہو کر لوٹتا ہے۔''

(مسند امام احمد بن حنبل، جلد اول، صفحہ-۳۰)

اسی طرح شعب الایمان کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص سب سے تعلق توڑ کر اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑتا ہے، اللہ اسے ہر مشقت میں کفایت کرتا ہے، اور اسے وہاں سے رزق عطا فرماتا ہے جس جگہ کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو شخص دنیا سے تعلق جوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دنیا کے سپرد کر دیتا۔''

(جلد ۳ صفحہ ۔ ۲۸)

کنز العمال کی ایک حدیث کو بھی اہل تصوف اپنے توکل کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مالدار ہو جائے تو اسے اپنے پاس موجود مال کے مقابلے میں اس چیز پر زیادہ بھروسہ کرنا چاہئے جو اللہ کے پاس ہے۔''

اہل تصوف کے توکل کی بنیاد یہ اور اس جیسی بے شمار آیات واحادیث ہیں۔ وہ اپنے لئے اللہ تعالیٰ کو کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آتش کدے میں ڈالے جاتے وقت کہا تھا کہ 'حسبی اللہ و نعم الوکیل' (میرے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) یہ کلمہ بھی ایک صوفی کے توکل کو تقویت دیتا ہے اور اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اپنے مالک کی مرضی میں ہی راضی رہے۔ وہ اسے جہاں جس حالت میں رکھے زبان پر شکوۂ رنج والم نہ لائے۔

زباں پر شکوۂ رنج والم لایا نہیں کرتے
خدا کے نام لیوا غم سے گھبرایا نہیں کرتے

توکّل صوفیہ کی نظر میں:

صوفیہ کی نظر میں توکّل کی خاص اہمیت ہے۔ وہ توکل کو تصوف کے ان بنیادی ستونوں میں سے ایک سمجھتے ہیں جن پر اس عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ وہ اس کے بغیر تصوف کو نامکمل مانتے ہیں۔ صوفیہ حضرات توکل کو توحید کی روح قرار دیتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر ہے کہ انسان کو جب اللہ

تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے تو رزق دینا بھی اسی کے ذمۂ کرم پر ہے۔ اس کے حصے کا رزق ہر حال میں اس تک پہنچ جائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ پتھروں کی چٹانوں، زمین کی تہوں اور سمندر کی گہرائیوں میں اپنی مخلوقات کو روزی پہنچاتا ہے تو انسان کو کیوں نہیں دے گا۔ یقیناً رزاق اللہ اپنے بندوں کو رزق پہنچانے پر قادر ہے اور جو کچھ جس کے حصے کا ہے وہ ہر حال میں اس تک پہنچ جائے گا۔ احیاء العلوم میں امام ابو حامد محمد غزالی نے اہل علم کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

''جو رزق تمہارے لئے مقدر ہے اس کے لئے فرض عمل سے منہ نہ پھیرو۔ اس طرح آخرت کے امر کو ضائع کرو گے اور دنیا سے وہی ملے گا جو تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ حضرت یحیٰ بن معاذ نے فرمایا جب بندے کو طلب کے بغیر ملتا ہے تو یہ اس بات پر دلالت ہے کہ رزق کو حکم دیا گیا کہ وہ بندے کو تلاش کرے۔''

(جلد چہارم، صفحہ-۵۴۷)

امام محمد غزالی علیہ الرحمہ اس کے بعد دو صوفیاء کے واقعات بیان کرتے ہیں جو راہ سلوک پر چلنے والوں کے لئے مشعل راہ ہیں اور عام اہلِ یقین کے لئے نور عرفان۔ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک تارکِ دنیا سے پوچھا کہ آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟ اس نے کہا اس بات کا مجھے علم نہیں، البتہ میرے رب سے پوچھو کہ وہ کہاں سے کھلاتا ہے۔

حضرت ہرم بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ کہاں رہنے کا مشورہ دیتے ہیں؟ انھوں نے شام کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت ہرم نے پوچھا معیشت کی کیا کیفیت ہوگی؟ حضرت اویس نے فرمایا ان دلوں پر افسوس ہے، ان میں تو شک ملا ہوا ہے، ان کو وعظ کیا نفع دے گا۔''

(جلد چہارم، صفحہ ۴۸-۵۴۷)

حضرت امام محمد غزالی علیہ الرحمہ خود بھی متوکل تھے اور دوسروں کو بھی اپنی تصنیفات میں اسی توکل کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ اپنی تصنیف 'منہاج العابدین' میں اپنے شیخ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے استاد فرماتے تھے:

''رزق کے معاملے میں جس چیز سے مجھے سکون واطمینان ہوا وہ یہ تھا کہ میں نے اپنے جی میں سوچا کہ یہ رزق تو بس زندہ رہنے اور اور جینے کے لئے ہے، مردہ کو اس سے کیا کام۔ جس طرح بندہ کی زندگی اللہ تعالیٰ کے خزانے اور اس کے دست قدرت میں ہے، اسی طرح رزق بھی ہے۔ چاہے مجھے دے چاہے نہ دے اور وہ مجھ سے پوشیدہ ہے۔''

(صفحہ-۵۰)

جنید بغدادی اور ترک تدبیر:

حصولِ رزق کے لئے جدوجہد کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس دنیا میں جب سے انسان کا وجود ہے یہ کوشش جاری ہے۔ انسان کے علاوہ دیگر جاندار بھی اپنی روزی کے لئے کوشش کرتے ہیں، مگر اس معاملے میں بعض صوفیہ کی سوچ الگ ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ صوفیہ کے درمیان اس معاملے میں اختلاف بھی ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے خیال میں انسان کو اپنی روزی کے لئے نہ کوئی کوشش کرنی چاہئے اور نہ کوئی تدبیر۔ اسے اللہ کے ذمہ چھوڑ دینا چاہئے۔ رسالہ قشیریہ اور احیاء العلوم میں ہے کہ:

''حضرت جنید بغدادی سے کچھ لوگوں نے پوچھا کہ ہم اپنا رزق کہاں تلاش کریں؟ تو انھوں نے فرمایا اگر تمہیں اس کی جگہ معلوم ہے تو وہاں تلاش کرو۔ لوگوں نے کہا کہ کیا ہم اللہ تعالیٰ سے مانگیں؟ تو آپ نے فرمایا اگر یہ سمجھتے ہو کہ اس نے تمہیں بھلا دیا ہے تو اسے ضرور یاد دلاؤ۔ لوگوں نے کہا کہ کیا ہم گھر بیٹھ کر توکل کریں؟ آپ نے فرمایا تجربہ کرنا شک ہے۔ انھوں

نے پوچھا کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ فرمایا! ترک تدبیر۔"

(احیاء العلوم، چہارم، صفحہ-۲۳۶)

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ حضرت جنید بغدادی کا نظریہ ہے کہ انسان حصول رزق کے لئے کوئی جدو جہد نہ کرے مکمل طور پر اللہ پر بھروسہ کر بیٹھ رہے۔ نہ تو اس سے طلب کرے اور نہ کوئی تدبیر اختیار کرے۔ لیکن دیگر صوفیہ کو اس سے اختلاف ہے۔ شیخ ابو طالب مکی علیہ الرحمہ ترک تدبیر کا مطلب ترک خواہشات بتاتے ہیں۔ قوت القلوب، جلد سوم کے مطابق آدمی کو چاہئے کہ آرزووں کو ختم کر کے فکر امروز وفردا سے بے نیاز ہو جائے اور مستقبل سے کوئی امید نہ باندھے۔ شیخ ابو طالب مکی، توکل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"متوکل یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ کم یا بیش جو کچھ اس کے خالق کی طرف سے ملتا ہے وہی اس کا متعین رزق ہے اور جتنا اس کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے اتنا اسے ہر حال میں مل کر رہے گا۔ دنیا میں اس کا حصہ اسکی صورت گری کے وقت ہی لوح تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ جس میں اسکی کوشش اور تدبیر سے کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔"

(قوت القلوب، جلد سوم، صفحہ ۱۰۔۹)

ایسا لگتا ہے کہ یہ سب توکل کا انتہائی درجہ ہے جو عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اہل تصوف کا ایک بڑا طبقہ اس پر عمل پیرا ہے مگر عام لوگوں کے لئے اس پر عمل ناممکن سا ہے۔ اگر آدمی ترک تدبیر اور ترک اسباب کر دے تو زندگی کیسے گزرے گی؟ حصول رزق کی کوشش انبیاء، صحابہ، صلحاء اور اہل بیت نبوت نے بھی کی ہے۔ احادیث میں حلال طریقے سے روزی حاصل کرنے کی فضیلت بھی آئی ہے۔ بزرگوں نے کبھی بھی عالم اسباب میں ترک اسباب نہیں کیا، مگر بعض صوفیہ اس معاملے میں انتہا پسند نظر آتے ہیں، جیسا کہ حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کے ایک واقعے سے پتہ چلتا ہے، فرماتے ہیں:

"میں برسوں سفر کرتا رہا لیکن صرف ایک بار حقیقی توکل تک پہنچ سکا۔ میں

بحری سفر میں تھا کہ جہاز شکستہ ہوگیا اس کے ایک ٹکڑے کا میں نے سہارا لیا، پھر میرے دل نے کہا اگر ڈوبنا ہی مقدر ہے تو لکڑی کا یہ ٹکڑا کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے، چنانچہ میں نے چھوڑ دیا۔''

(تلبیس ابلیس۔ صفحہ-۲۷۸)

حضرت عمر اور ترک تدبیر:

حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمہ نے عالم اسباب میں ترکِ سبب یا ترکِ تدبیر کیا، اس کے باوجود ان کی زندگی محفوظ رہی ہوسکتا ہے اللہ کی ذات پر کامل بھروسہ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو مگر ایسا کرشمہ عام طور پر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ جدوجہد انسان کرتا ہے اور اسے کامیابی وناکامی سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ کامیابی وناکامی سے ہمکنار کرنے والا اللہ ہی ہے۔ یہ سلسلہ روز ازل سے جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ اس تعلق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک واقعے کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ''در منظوم'' کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اہل یمن سے کچھ لوگ آئے، جو گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا کرتے ہو یعنی ذریعۂ معاش کیا ہے؟ ان لوگوں نے عرض کیا کچھ نہیں کرتے، ہم اللہ پر بھروسہ کرنے والے لوگ ہیں، اسی پر توکل کرکے رہتے ہیں۔ جو کچھ وہ پہنچادے اسی پر گزارا کر لیتے ہیں۔ خلیفۂ دوم نے ارشاد فرمایا! یہ کیوں نہیں کہتے کہ کام چور اور مفت خور ہو۔ توکل یہ نہیں کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہو۔ توکل تو یہ ہے کہ جدوجہد کرو اور اس کے نتیجہ کے لئے اللہ پر بھروسہ رکھو، جیسے توکل ایک کسان کرتا ہے، جو مٹی میں دانہ ڈال کر ایک سال تک انتظار کرتا ہے، پھر اللہ اسے اگاتا ہے۔ اس میں پھل اور دانا لگتا ہے اور اس سے رزق حاصل ہوتا ہے، یعنی مٹی میں دانا محض اللہ کے بھروسے پر ڈالا جاتا ہے۔ اب اسے وہ اُگائے یا نہ اُگائے یہ اس کا کام ہے۔ پھر وہ پودا بار آور ہوا یا نہیں یہ اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے۔ اس سلسلے میں کسان محض اللہ کے بھروسے پر کوشش کرسکتا ہے اور یہی توکل ہے۔

اہل تصوف اور ترک اسباب:

صوفیہ میں ایک چھوٹا طبقہ ہے جو ترک تدبیر اور ترک اسباب کو توکل کا حصہ سمجھتا ہے لیکن اکثر اہل تصوف ایسا نہیں سمجھتے۔ یہی سبب ہے کہ زیادہ تر صوفیہ اپنا ذریعۂ معاش رکھتے تھے، رزق کے لئے جدو جہد بھی کرتے تھے۔ اپنے اور اہل وعیال کے لئے محنت ومشقت کرتے تھے۔ روزی حاصل کرنے کی دوسروں کی طرح ہی جدو جہد کرتے تھے۔ اہل تصوف میں سے بعض تجارت پیشہ تھے تو بعض صنعت وحرفت سے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ ملازمت پیشہ تھے تو کچھ مزدور اور غلام بھی تھے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم اور اشرف جہانگیر سمنانی علیہا الرحمہ جیسے کچھ صوفیہ شاہی گھرانوں کے چشم وچراغ تھے۔ حضرت امیر خسرو اور نصیر الدین چراغ دہلی جیسے کچھ اہل تصوف شاہی ملازمت میں بھی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بادشاہوں، شہزادوں، امیروں اور رئیسوں سے قربت کے باوجود ان کی دلقِ گدائی سلامت رہی اور الفقر فخری کا نمونہ بنے رہے۔

کچھ سوالات:

قرآن مجید اور سیرت نبوی میں توکل کی جو وضاحت نظر آتی ہے اسے سمجھنے میں کسی کو کوئی دشواری نہیں ہوسکتی۔ اکثر صوفیہ کے ہاں اسی پر عمل ہے مگر بعض اہل تصوف اسے اپنے انداز میں لیتے ہیں، جن سے کئی طرح کی دقتیں محسوس ہونے لگتی ہیں اور کئی بار توکل انسانی سمجھ سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ یہ بحث طویل سے طویل تر ہوتی جاتی ہے۔ یہ سوالات بھی اٹھتے ہیں کہ اگر توکل کا مطلب ترک اسباب ہے تو اہل وعیال کی پرورش فکر معاش کے بغیر کیسے ہوسکتی ہے؟ کیا صوفی عیالدار نہ ہو؟ اگر عیالدار ہونے کے بعد اس نے سلوک کے راستے پر قدم رکھا تو اب اہل وعیال کا کیا ہوگا؟ کیا متوکل بیمار ہو تو دواؤں کا استعمال نہ کرے، اللہ کے بھروسے خود کو چھوڑ دے؟ حالت سفر میں توشہ لے کر نکلنا توکل کے خلاف ہے؟ کسی درندے نے حملہ کر دیا تو اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کرے، خود کو اپنے وکیل اور ضامن اللہ تعالیٰ کے بھروسے چھوڑ دے؟ اگر پانی میں کوئی حادثہ پیش

آ گیا تو باہر نکلنے کی جدوجہد نہ کرے کہ اللہ کو اگر اس کی زندگی منظور ہوگی تو وہ بچالے گا اور اگر زندگی کا خاتمہ لکھا ہوگا تو ہو جائے گا؟ گھر میں تالا لگانا توکل کے خلاف ہے؟ کیونکہ محافظ اللہ ہے۔ اسکی مرضی ہوگی تو تالا کے بغیر بھی گھر کے سازوسامان محفوظ رہیں گے اور اسکی اجازت ہوگی تو تالا کے باوجود گھر میں چوری ہو جائیگی۔ یہ تمام سوالات الجھن پیدا کرتے ہیں۔ انھیں سلجھانے کی کوشش مزید پیچیدگی میں ڈال دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سا جواب تو یہ تھا کہ اس عالم اسباب میں ہر کام کے لئے ایک سبب موجود ہے لہٰذا عمل کیا جائے اور اس کے نتیجہ کے تعلق سے اللہ پر توکل کیا جائے، اسی پر بھروسہ کیا جائے۔ نہ یہ کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے یا تدبیر کو چھوڑ دیا جائے۔ قرآن وحدیث میں بھی جس توکل کا ذکر ہے وہ یہی ہے۔ رسول محترم ﷺ کا عمل بھی اسی توکل پر رہا ہے۔ آپ نے کبھی بھی ترک تدبیر کا حکم نہیں دیا۔ ترکِ سبب یا ترکِ تدبیر کا مسئلہ بہت بعد میں پیدا ہوا جس نے بے شمار الجھنیں پیدا کیں۔ احیاء العلوم، جلد چہارم میں ہے۔

> ''توکل دین کی منازل میں سے ایک منزل اور یقین رکھنے والوں کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ بلکہ یہ مقربین کے بلند درجات میں سے ایک درجہ ہے اور توکل ذاتی طور پر علم کی رو سے نہایت دقیق اور عمل کے اعتبار سے مشکل ہے۔ سمجھنے کے اعتبار سے اسکی باریکی کی وجہ یہ ہے کہ اسباب پر نگاہ رکھنا اور اعتماد کرنا توحید میں شراکت ہے اور اسباب کو بالکل چھوڑ دینا سنت پر طعن اور شریعت پر اعتراض اور اسباب پر اس طرح اعتماد کرنا کہ ان کو اسباب خیال کرنا قیاس کو بدلنا اور جہالت کی گہرائی میں غوطہ زن ہونا ہے۔ توکل کا معنیٰ اس انداز میں ثابت کرنا کہ وہ توحید کے تقاضوں کے موافق اور شریعت کے مطابق ہے نہایت مشکل بات ہے اور چونکہ یہ بات نہایت مخفی ہے لہٰذا اس سے پردہ اٹھانے پر ایسے جید علماء قادر ہو سکتے ہیں جن کی آنکھوں میں اللہ کے فضل سے حقائق کا نور موجود ہے۔ انھوں نے دیکھا اور تحقیق کی پھر جو کچھ دیکھا اسے اس طرح بیان کیا

جس طرح ان سے بیان کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

(صفحہ-۵۴۲)

توکل کے تعلق سے جو الجھنیں پیدا ہوتی رہی ہیں ان کا احساس درج بالا عبارت میں نظر آتا ہے۔ظاہر ہے یہ الجھنیں آج کی نہیں ہیں بلکہ صدیوں پہلے جب تصوف کا ہر طرف دور دورہ تھا تب بھی یہ مسائل تھے۔امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ طریقت کے ساتھ ساتھ شریعت کے بھی امام تھے لہٰذا انھوں نے اپنی تصنیفات میں ان سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور تطبیق کی صورت بھی نکالنے کی سعی کی ہے۔

توکل کے درجات:

علماء تصوف کی نظر میں توکل، علم، عمل اور حال سے مل کر بنتا ہے۔دوسرے الفاظ میں یہ تصوف کے اجزائے ترکیبی ہیں۔اسی طرح علماء، توکل کے درجات کو بھی تین حصوں میں منقسم کرتے ہیں۔یہ درجات یقین کی پختگی کے اعتبار سے ہیں، یعنی اللہ پر یقین جتنا پختہ ہوگا اور اعتماد جتنا زیادہ ہوگا، درجے میں اتنی ہی بلندی آتی جائیگی۔اس کا اولین درجہ یہ ہے:

''اللہ تعالیٰ کی کفایت وعنایت پر اعتماد کے سلسلے میں اس کا حال اسی طرح ہو جس طرح وکیل پر اعتماد کی حالت ہوتی ہے۔''

(ایضا صفحہ-۵۸۳)

یعنی جس پر اعتماد کر کے اپنے تمام معاملات سپرد کئے جارہے ہیں اس پر کسی قسم کا شک نہ کیا جائے۔وہ ذمہ داری ادا کرنے والا ہے، وہ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی کرنے والا نہیں۔تب ہی اسے وکیل بنایا گیا ہے۔اگر وکیل حقیقی پر اتنا پختہ یقین ہے تو یہ توکل کا سب سے نچلا درجہ ہے۔تصوف میں اس سے زیادہ یقین واعتماد کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔توکل کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسکی حالت اس طرح ہو جس طرح بچے کا حال اس کی

ماں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اس کے سوا نہ تو کسی کو جانتا ہے اور نہ کسی دوسرے
سے فریاد کرتا ہے اور اعتماد بھی اسی پر کرتا ہے۔ جب وہ اسے دیکھتا ہے تو
ہر حال میں اس کے دامن سے لپٹ جاتا ہے اور اسے نہیں چھوڑتا اور اگر
ماں کی عدم موجودگی میں اسے کوئی بات پیش آتی ہے تو اس کی زبان پر سب
سے پہلے یہی الفاظ آتے ہیں 'اے ماں' اور اس کے دل میں سب سے پہلے
ماں ہی کا خیال آتا ہے کیونکہ وہی اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس نے اس کی
کفالت، کفایت اور شفقت پر ایسا اعتماد کیا ہے، جو ایک قسم کے ادراک سے
خالی نہیں اور اسکی تمیز اور سمجھ کے مطابق ہے"

(ایضا)

بچہ اپنی ماں سے بے حد مانوس ہوتا ہے وہ ماں کو ہی حقیقی ہمدرد سمجھتا ہے، اسکی جدائی برداشت نہیں کر پاتا، کوئی تکلیف پہنچے تو ماں کو ہی پکارتا ہے، کچھ مانگنا ہو تو ماں ہی سے مانگتا ہے، کوئی درد ہو تو ماں ہی سے شکایت کرتا ہے، روتا ہے تو ماں کہہ کر اور خوش ہوتا ہے تو ماں کو دیکھ کر۔ ایک بندے کے اندر اگر اپنے مالک سے یہی لگاؤ ہو تو اسے متوکل کہتے ہیں، مگر یہ توکل کا دوسرا زینہ ہے۔ اسے درمیانہ درجہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تیسرا درجہ سب سے بلند ہے اور یہ اللہ کے خاص الخاص بندوں کا ہے:

"وہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ہو جائے جس طرح
غسل دینے والے کے سامنے مردہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو (متوکل) مردہ
سمجھے کہ قدرتِ ازلیہ حرکت دے رہی ہے، جیسے غسل دینے والے کا ہاتھ
میت کو حرکت دے رہا ہے۔"

(ایضا، صفحہ-۵۸۴)

یعنی تیسرے اور سب سے اعلیٰ درجے میں اللہ کی ذات پر یقین میں مزید پختگی آجاتی ہے۔ یہ اعتماد کا انتہائی مقام ہے۔ گویا یہاں بچہ اپنی ماں کے لئے روتا نہیں، فریاد نہیں کرتا بلکہ

اسے اس بات پر پورا بھروسہ رہتا ہے کہ وہ روئے یا نہ روئے، فریاد کرے یا نہ کرے، اسکی ماں ہر حال میں اس کی خبر گیری کرے گی۔ وہ اپنی ماں کی شفقت ومحبت پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اگر وہ دودھ نہیں مانگے گا تو بھی ماں اسے دودھ پلائے گی۔ اسے اپنی بھوک سے جتنی تکلیف ہوتی ہے اس سے زیادہ ماں کو اس کی تکلیف کا خیال ہے۔ یہ توکل کا وہ مقام ہے جہاں بندے میں خود سپردگی آجاتی ہے اور وہ مانگنے کے بجائے اللہ کے کرم، اسکی بخشش اور اسکی عنایتوں پر بھروسہ کرنے لگتا ہے۔ جن اہل تصوف نے ترک تدبیر کا مشورہ دیا ہے وہ اسی مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ یہ مقام نادر ہے اور یہاں تک بہت کم رہ نوردان شوق کی رسائی ہو پاتی ہے۔

اہل تصوف کے اقوال:

توکل کے راستے پر چلنے والوں سے انتہائی درجے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، مگر قدم بہ قدم۔ معروف صوفی حضرت سہل علیہ الرحمہ سے توکل کے نچلے درجے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

> ''آرزووں کا ترک کرنا۔ سائل نے پوچھا، درمیانہ درجہ کیا ہے؟ اختیار کو چھوڑ دینا۔۔۔۔ اعلیٰ درجے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اس کا ذکر نہ کیا اور فرمایا اس کی پہچان اس شخص کو ہوسکتی ہے جو اس کے اوسط درجے تک پہنچ جائے۔''

(ایضا)

ظاہر ہے خود سپردگی کی کیفیت کے تعلق سے وہی سمجھ سکتا ہے جو کم از کم دوسرے درجے تک پہنچ جائے۔ توکل کے مختلف درجات کے متعلق اہل تصوف کے مختلف خیالات ہیں مگر اس میں یکسانیت پائی جاتی ہے، جیسا کہ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ کے نظریے سے ملتا جلتا نظریہ حضرت ابو علی دقاق علیہ الرحمہ کا ہے:

''حضرت ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا توکل کے تین درجات ہیں (۱) توکل (۲) تسلیم اور (۳) تفویض۔ متوکل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے وعدے پر سکون حاصل کر لیتا ہے اور مسلِّم اس کے جاننے پر ہی کفایت کرتا ہے اور تفویض والا اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوتا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ متوکل کا دیکھنا اس شخص کے اعتبار سے جسے دیکھتا ہے مختلف درجات رکھتا ہے۔''

(احیاء العلوم، چہارم، صفحہ-۵۹۱)

اس مسئلے میں حضرت ابوعبداللہ قرشی علیہ الرحمہ کا نظریہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ان سے توکل کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

''ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رکھنا۔ سائل نے کہا مزید کچھ بتائیے، فرمایا ہر اس سبب کو چھوڑ دینا جو کسی دوسرے سبب تک پہونچاتا ہے حتیٰ کہ حق ہی متولی قرار پائے۔''

(ایضا، صفحہ-۵۹۰)

یہ تو صرف چند اہل تصوف کے خیالات ہیں، اگر مزید گہرائی میں جانے کی کوشش کی جائے تو دیگر صوفیہ کے ہاں بھی ایسے ہی نظریات ملتے ہیں۔ بغیر توکّل کے تصوف تک رسائی کو وہ ناممکن تصور کرتے ہیں۔ درجات اس کے مختلف ہو سکتے ہیں مگر توکّل مختلف نہیں۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری علیہ الرحمہ سے سوال ہوا کہ بندے کے لئے توکّل کب صحیح ہوتا ہے؟

''فرمایا، جب اس کے جسم میں کوئی ضرر اور مال میں کوئی نقصان واقع ہو تو وہ اپنے حال میں مشغولیت کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ نہ ہو اور یوں خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر پر قائم ہے۔''

(ایضا، صفحہ-۶۳۷)

بابا فرید اور توکّل:

اہل تصوف کا خیال ہے کہ انسان کے مقدر میں جو روزی لکھ دی گئی ہے، وہ ہر حال میں مل کر رہے گی لہٰذا اسے عبادت وریاضت سے الگ ہو کر دن رات حصول رزق کی جدو جہد نہیں کرنی چاہئے۔ چشتی سلسلے کے صوفی حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمہ نے فرمایا:

''اے درویش! شریعت و طریقت میں بندۂ صادق وہ ہے جو مال بنانے سے دل نہ لگائے اور اپنے مولیٰ کی اطاعت میں فراخ دلی سے مشغول رہے۔ حصول رزق کے لئے محنت کرتے وقت یہ جان لے کہ جو کچھ میرے مقدر میں ہے وہ مل کر رہے گا۔ نہ اس میں ذرہ برابر کم نہ زیادہ ہوگا۔ اے درویش! فقر کی راہ میں وہ ثابت قدم ہے جو مالِ دنیا بنانے سے دل نہ لگائے۔ جس شخص کے دل میں یہ ہو کہ آج تو میں نے کھالیا، کل کیا کھاؤں گا؟ یہ شخص طریقت کی راہ میں بد دین ہے۔

اس کے بعد فرمایا! اہل سلوک لکھتے ہیں، جس طرح موت انسان کی حفاظت کرتی رہتی ہے، اس نے اس کا مقررہ وقت اس کے کاندھے پر لکھ رکھا ہے۔ اسی طرح رزق بھی انسان کو ڈھونڈتا ہے۔ جہاں وہ جاتا ہے، اس کے ساتھ رہتا ہے۔ جہاں وہ بیٹھتا ہے اس کے ہمراہ بیٹھتا ہے۔ پھر فرمایا، اے درویش! بے فکر رہ کیونکہ تیرا رزق تیرے کاندھے پر لکھا ہے۔ تو کثرت سے یادِ الٰہی میں مشغول ہو جو تیرا مقدر ہے وہ مل کر رہے گا۔''

(اسرار الاولیاء (ملفوظات بابا فرید گنج شکر) فصل سوم)

بابا صاحب کا اعتقاد ہے کہ مقدر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہر حال میں ہو کر رہے گا۔ جو کچھ رزق لکھا ہے وہ مل کر رہے گا خواہ اس کے لئے جدو جہد کریں یا نہ کریں۔ لہٰذا بہتر تو یہی ہے کہ اللہ پر توکل کر کے دلجمعی کے ساتھ اس کی عبادت کریں۔ رزق جس کے حصے کا ہوگا اسے ڈھونڈ کر خود پہنچ جائے گا۔ جس طرح موت وقت مقررہ پر ہر جاندار تک پہنچ جاتی ہے اسی طرح اس کے حصے

کی روزی بھی ضرور پہنچ جائے گی۔ باباصاحب مزید فرماتے ہیں:

''مشائخ طبقات نے رزق کی چار اقسام فرمائی ہیں۔(۱) رزق مقسوم (۲) رزق مذموم، یہ وہ ہے جو کھانے کو ملے اس پر صبر نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ خود رزق کا ضامن ہے۔ (۳) رزق مملوک وہ ہے جو نقدی اور اسباب وغیرہ جمع کیا جائے یا تجارت کی جائے، البتہ اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نیکی حاصل ہوتی ہے، جس سے قوت حاصل ہوتی ہے، لیکن اے درویش! اس راہ کے سالکوں نے کہا ہے کہ تجارت وہ شخص کرتا ہے جسے حق تعالیٰ کے فضل وکرم کا انکار نہ ہو، مگر درویش کے لئے یہی مناسب ہے کہ نقدی یا اسباب اسے ملیں سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دے اور اپنے پاس کچھ نہ رکھے۔ پھر فرمایا اے درویش! (۴) رزق موعود وہ ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے نیک لوگوں، عابدوں سے کیا ہے۔''

(ایضا)

جب انسان توکّل اختیار کر لے تو پھر اسے چاہئے کہ ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر بس خداوند قدوس کی جانب مبذول کر لے، یہ تمام صوفیہ کا مسلک ہے۔ باباصاحب کا بھی یہی مسلک ہے، جیسا کہ اوپر درج ملفوظات سے ظاہر ہے۔ توکّل کا سبق انھوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ سے حاصل کیا تھا۔ وہ اپنے مرشد کے توکّل سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں اور ایک موقع پر فرماتے ہیں:

''توکّل وہ تھا جو خواجہ بختیار اوشی کو حاصل تھا، چنانچہ میں نے کبھی آپ کو کسی قسم کی فتوح قبول کرتے نہیں دیکھا یا کسی سے توقع کرتے نہ سنا نہ دیکھا۔
جب خادم کو درویشوں کی خوراک کیلئے روپے، پیسے یا اناج کی ضرورت ہوتی تو آ کر التماس کرتا اور آپ مصلّیٰ تلے سے چند اشرفیاں نکال کر دے دیتے اور وہ صبح سے شام تک خرچ کر دیتا۔ جب کوئی خانقاہ میں مسافر آ جاتا تو

اسے خالی نہ جانے دیتے، کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے۔جس قدر کھانا دسترخوان پر ہوتا اس میں ذرا بھی کمی نہ آتی۔اس کے بعد فرمایا کہ اہل توکّل پرحقائق میں ایک ایساوقت بھی آتا ہے کہ اگراس وقت انھیں آگ میں پھینک دیا جائے تو مطلق خبر نہ ہوتی۔''

(اسرارالاولیاء، فصل ۱۱)

محبوب الٰہی اور توکّل:

توکّل کسی نہ کسی شکل میں تمام اہل تصوف کے یہاں پایا جاتا ہے۔گویا اس کی تشریح کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔تمام صوفیہ اپنے اپنے انداز میں اسے بیان کرتے ہیں۔برصغیر کے معروف صوفی محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے اور ان کے ملفوظات کے مجموعے 'فوائدالفواد' میں یہ بیان خصوصی اہتمام کے ساتھ ہے:

''فرمایا کہ حق (تعالیٰ) پر اعتماد رکھنا چاہئے اور کسی اور کی طرف نظر نہیں لگائی چاہئے۔اس کے بعد زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ کسی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک ساری مخلوق کو اونٹ کی مینگنی جیسا (ہیچ) نہ سمجھے۔اس کے بعد اس ضمن میں یہ حکایت بیان فرمائی کہ ایک دفعہ ابراہیم خواص کعبے کے سفر کو نکلے تو ایک لڑکا بھی ساتھ لگ گیا۔ابراہیم نے اس سے مخاطب ہوکر پوچھا کہ تم کہاں جارہے ہو؟ بولا کعبے کی زیارت کے لئے۔ ابراہیم نے کہا توشہ اور سواری کہاں ہے؟ بولا خدا عزوجل بندے کو بے اسباب قائم رکھتا ہے تو وہ زادِ سفر اور سواری کے بغیر مجھے کعبے تک پہنچا بھی سکتا ہے۔قصہ مختصر جب ابراہیم خواص کعبے پہنچے تو اس لڑکے کو دیکھا کہ ان سے پہلے پہنچا ہوا ہے اور کعبے کا طواف کررہا ہے۔جب اسکی نظر ابراہیم پر پڑی تو کہنے لگا اے کمزور یقین

رکھنے والے تم نے مجھ سے جو کہا تھا اس سے توبہ کی؟''

(جلد سوم، مجلس-٦)

رزق، انسانی حیات کا وہ پہلو ہے جس کے لئے جدوجہد کرنا انسانی فطرت میں شامل ہے۔ صوفیہ اس معاملے میں توکّل کا سبق دیتے ہیں۔ محبوب الٰہی کے ملفوظات میں اس کا ذکر بھی ملتا ہے۔

''اس کے بعد خواجہ ذکر اللہ بالخیر نے ارشاد فرمایا کہ مشائخ نے رزق کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ رزقِ مضمون، رزقِ مقسوم، رزقِ مملوک اور رزقِ موعود۔ رزقِ مضمون تو وہ ہے جو آدمی کو کھانے اور پینے کی چیزوں کی صورت میں جو اس کے لئے کافی ہوں ملتا ہے، اس کو رزق مضمون کہتے ہیں، یعنی خدا ضامن ہے۔ (ترجمہ آیت) اور زمین میں کوئی رینگنے والا ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ رزق مقسوم وہ ہے جو ازل میں مقدر کردیا گیا اور لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا۔ رزق مملوک وہ ہے جس کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ روپے، کپڑے، اور دوسرے سامان کی صورت میں۔ رزق موعود وہ ہے جس کا وعدہ حق تعالیٰ نے عبادت گزاروں اور صالح بندوں سے کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ توکّل رزق مضمون میں ہوتا ہے، دوسری قسم کے رزق میں نہیں ہوتا کیونکہ جو کچھ مقسوم ہے اس میں توکّل کیا کرے گا؟ اور جو مملوک ہے اس میں بھی توکل کا دخل نہیں اور جو موعود ہے اس میں بھی توکّل نہیں ہے، کیونکہ جس کا وعدہ کیا گیا ہے وہ پہنچے ہی گا۔ توکل رزق مضمون میں ہے۔'' (ایضا)

علاج اور توکّل:

صبر و توکّل، اہل تصوف کے لئے لازم ہے۔ صوفیہ، توکل کا حکم ایک دو جگہ نہیں بلکہ

زندگی کے ہر مرحلے پر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ صوفیہ کا ایک بڑا طبقہ یہ خیال کرتا ہے کہ مرض اللہ کی جانب سے ہے لہٰذا اس پر بھی صبر و توکل کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور علاج سے پرہیز کرنا چاہیے۔ رسول محترم ﷺ کو مختلف مواقع پر امراض لاحق ہوئے اور آپ نے علاج بھی کرائے، لیکن آپ نے کبھی علاج کو لازم نہیں قرار دیا۔ یہی سبب ہے کہ بعض صحابہ جب بیمار ہوئے اور ان سے جب طبیب بلانے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے منع کر دیا۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے تو ایک موقع پر طبیب بلانے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نے مجھے بیمار کیا ہے۔
حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ایک فقہی مسلک کے امام گزرے ہیں، اسی کے ساتھ ان کا تصوف سے بھی تعلق تھا، بے حد متوکل اور صابر تھے، کئی بیماریوں میں مبتلا تھے مگر علاج نہیں کراتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

"جو شخص توکّل کا عقیدہ رکھتا ہو اور اس راستے پر چلتا ہو اس کے لئے دوا وغیرہ پینے کے ذریعے علاج کے ترک کو پسند کرتا ہوں۔"

(احیاء العلوم، جلد چہارم، صفحہ-۶۳۶)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ پوچھنے پر بھی اپنی بیماری کے تعلق سے نہیں بتاتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے صوفیوں کا عمل ایسا ہی تھا، مگر علاج کرانا سنت ہے اور رسول محترم ﷺ کی حدیثوں میں اس کا ثبوت ہے لہٰذا صوفیہ پر کہیں سنت چھوڑنے کا الزام نہ لگ جائے اسی لئے حضرت امام محمد غزالی نے ترک علاج کے لئے کچھ اسباب بتا کر صوفیہ کے عمل کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسباب یہ ہیں۔

۱۔ مریض اہل مکاشفہ میں سے ہو اور اسے کشف ہو کہ اس کا وقت پورا ہو چکا ہے اور دوائی اسے نفع نہیں دے گی۔

۲۔ مریض اپنے حال میں مشغول ہو، اسے اپنی عاقبت کا خوف ہو نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ اس پر مطلع ہے تو اس وجہ سے وہ بیماری کی تکلیف کو بھول جائے اور اس کا دل اپنے حال میں مشغول ہونے کے سبب سے علاج و معالجے کے لئے فارغ نہ ہو۔

۳۔ بیماری پرانی ہے اور جس دوا کا اسے مشورہ دیا گیا ہے اس کا نفع بیماری کی نسبت موہوم ہو۔

۴۔ بندہ اس لئے دوا چھوڑتا ہے کہ اس کا مرض باقی رہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی آزمائش پر اچھی طرح صبر کرنے کا ثواب حاصل ہو۔

۵۔ بندے نے پہلے کچھ گناہ کئے ہوں اور اسے ان کا ڈر ہو اور کفارہ بھی نہ ادا کرسکتا ہو تو بیماری کی طوالت کو ان گناہوں کا کفارہ خیال کرتا ہے اور اس لئے علاج نہیں کرواتا کہ بیماری جلدی ختم نہ ہو جائے۔

۶۔ بندہ زیادہ دیر تک صحت مند رہنے سے اپنے نفس میں تکبر اور سرکشی کا ڈر محسوس کرتا ہے لہٰذا وہ اس خوف سے علاج چھوڑتا ہے کہ مرض زائل ہونے کی صورت میں دوبارہ غفلت ،اکڑ، سرکشی ،لمبی امید، فوت شدہ کے تدارک میں لیت ولعل اور نیکیوں میں تاخیر پیدا ہو جائیگی۔

(احیاء العلوم، جلد چہارم، صفحہ ۶۳۶۔۶۴۲)

مرض وعلاج کے تعلق سے حضرت امام محمد غزالی علیہ الرحمہ نے جو راستہ نکالا ہے وہ درمیانہ راستہ ہے ورنہ اہل تصوف میں ایک بڑا طبقہ اگر علاج کو توکّل کے خلاف سمجھتا ہے تو دوسرا طبقہ عین توکّل کے مطابق خیال کرتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ جس طرح کھانا کھانا توکل کے خلاف نہیں اسی طرح دوائیں کھانا بھی توکل کے خلاف نہیں۔کھانے میں بھوک مٹانے کی طاقت اللہ نے رکھی ہے اسی طرح دواؤں میں بھی شفا کی طاقت اسی مالک نے رکھی ہے۔دوا کھانے والا دوا کو شافی نہیں سمجھتا بلکہ شفا دینے والا اللہ ہے۔

بہرحال بنیادی طور پر توکل تمام صوفیہ کے ہاں پایا جاتا ہے۔اس کے جزئیات میں اختلاف ضرور ہے مگر نفس توکل میں کوئی اختلاف نہیں۔سبھی صوفیہ اسے نہ صرف تصوف کے لئے ضروری سمجھتے ہیں بلکہ ایمان کی تکمیل کے لئے بھی لازم خیال کرتے ہیں۔

❖○❖

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ قرآن مجید
۲۔ مسند امام احمد بن حنبل
۳۔ شعب الایمان، سوم
۴۔ کنز العمال
۵۔ احیاء العلوم، چہارم
۶۔ منہاج العابدین
۷۔ الرسالۃ القشیریہ
۸۔ اسرار الاولیاء
۹۔ فوائد الفواد

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریاں و بے تیغ وسناں عشق

اقبالؔ

تصوف کی اِساس محبت

تصوف کی بنیاد محبت ہے، لیکن محبت ایک ایسا نا قابل فہم اور دشوار موضوع ہے جسے سمجھنا اور سمجھانا ناممکن ہے۔ اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسے سمجھنے اور سمجھانے کی جتنی بھی کوشش کی جاتی ہے، ناکامی ہاتھ لگتی ہے۔ اس مسئلے کو سلجھانے کی ہر جدو جہد مزید الجھنیں پیدا کرتی ہے۔ گویا ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ محبت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بے شمار الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے جن میں سے کچھ خاص یہ ہیں۔ عشق، علاقہ، شغف، شوق، حزن، حرق، جنون، فتون، وجد، کلف وغیرہ وغیرہ مگر اخیر میں کہنا پڑتا ہے۔

محبت معنیٰ و الفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی

محبت کی تعریف:

محبت کی تعریف بھی مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں بیان کی جاتی ہے، مگر ہر تعریف پڑھ کر کسی نہ کسی کمی کا احساس ہوتا ہے اور لگتا ہے کہ یہ تعریف جامع و مانع نہیں ہے۔ کسی نے کہا تڑپتے دل کے ساتھ دائمی میلان کا نام محبت ہے تو کسی نے کہا تمام وابستہ چیزوں پر محبوب کو ترجیح دینا محبت ہے۔ کسی کا قول ہے کہ ہر حال میں محبوب کی موافقت کرنا محبت ہے تو کسی نے محبّ اور محبوب کی مراد کا ایک ہونا محبت بتایا ہے۔ کسی نے محبوب کی مراد کا محبّ پر راجح ہونا محبت سمجھا تو کسی نے سوائے محبوب کے ہر چیز کو دل سے مٹا دینے کا نام محبت رکھا۔ کسی کی نظر میں حدود محبت کی حفاظت کرنا تو کسی کے خیال میں محبوب کی معیت کو اپنے لئے باعث فرحت جاننا محبت ہے۔ بعض نے رضائے محبوب کے حصول کے لئے تن من دھن کی قربانی تو بعض نے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب کو عزیز رکھنے کا نام محبت رکھا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں محبت ایک ایسے اضطرابِ مسلسل کو کہا جاتا ہے جس میں سکون نہیں اور ایسے سکون کو کہا جاتا ہے جس میں اضطراب نہیں۔ بعض اہلِ دل سمجھتے ہیں کہ محبوب کا محبّ کی روح سے بھی قریب ہونا محبت ہے۔ تو بعض اہل نظر احکامِ عشق پر دل کی ثابت قدمی کو محبت کہتے ہیں۔ اردو کے ایک معروف شاعر کے خیال میں۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اور بقولِ غالب ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عشق:

محبت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایک دوسرا لفظ 'عشق' بھی بہ کثرت استعمال ہوتا ہے۔ عشق 'العشقہ' سے ماخوذ ہے۔ العشقہ ایک ایسی بیل کو کہتے ہیں جو سبز اور پھر زرد ہوتی ہے اور

جس چیز سے لگتی ہے مکمل چمٹ جاتی ہے۔ چونکہ عشق میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے، یہ آزار جس کے دل سے لگ جائے، پھر جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس جذبے کو عشق کہا جانے لگا۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

عشق پر زور نہیں یہ ہے وہ آتش غالبؔ
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

'عشق' کا لفظ عربی میں پہلے کم استعمال ہوتا تھا مگر بعد میں رائج ہو گیا فارسی اور اردو میں بھی یہ محبت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسے اردو میں حقیقی اور مجازی دونوں قسم کی محبت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

صوفیہ کی نظر میں محبت:

صوفیہ کرام محبت کو صرف تصوف ہی نہیں دین وشریعت کی بھی اساس مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں کائنات اور تمام مخلوقات کا وجود عشق ومحبت کے جذبے کی کارفرمائی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'روضۃ المحبین ونزہۃ المشتاقین' کے ابتدائی صفحات میں تحریر فرمایا ہے:

"پاک ہے وہ ذات جس نے محبت کی طرف دلوں کو جب چاہا اور جیسے چاہا پھیر دیا اور اس محبت کے ذریعے اپنی حکمت کے ساتھ اس چیز کو نکالا جس کے لئے ہر جاندار کو پیدا کیا گیا ہے اور محبت کی مختلف انواع واقسام کی تعریف وتفصیل کو مخلوق کے درمیان عام کیا اور ہر محبوب کے لئے اس کے محبوب کی محبت سے حصہ مقرر کیا، خواہ وہ اپنی محبت میں درست ہو یا غلط۔ اور اس محب پر محبت کی وجہ سے انعام کردہ یا اسے مقتول بنا دیا، اور اس محبت کو ایسا تقسیم کیا کہ بعض کو اپنی ذات سے محبت کرنے والا بنا دیا، بعض کو بتوں، بعض کو آگ سے اور بعض کو صلیبوں سے، کچھ کو وطنوں کا محبّ بنا دیا اور کچھ کو بھائیوں

کا۔کسی کو عورتوں کا دلدادہ بنادیا تو کسی کو بچوں کا۔کسی کو اموال کا گرویدہ بنادیا تو کسی کو ایمان کا۔کسی کو موسیقی کا عاشق بنادیا تو کسی کو قرآن کا۔لیکن اللہ، اسکی کتاب اور رسول سے محبت کرنے والوں کو تمام محبت کرنے والوں پر زبردست فضیلت بخشی۔محبت کے لئے اور محبت کی وجہ سے زمین و آسمان کو پیدا کیا گیا اور تمام مخلوقات کی تخلیق بھی اسی وجہ سے ہے اور محبت کے لئے ہی افلاک کا دائرہ حرکت میں ہے۔اور اسی کے لئے حرکات اپنی انتہا کو پہنچتی ہیں، اور اپنی ابتدا کو انتہا سے ملاتی ہیں، اور اسی کی وجہ سے دل اپنے مقصود کو حاصل کرتا ہے اور اپنے مطلوب تک رسائی حاصل کرتا ہے اور ہلاکتوں سے خلاصی پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے کو اختیار کرتا ہے۔''

یہ جذبۂ محبت بھی بلا سبب نہیں۔اس کے پسِ پردہ خالق و مالک کی محبت کارفرما ہے۔اس تعلق سے علامہ ابن قیم اپنی مذکورہ کتاب کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے محبت کو محبوب تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا اور محبوب کی اطاعت اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کردینے کو صداقتِ محبت کی دلیل ٹھہرایا، اور نفوس کو محبت کے حصول کے لئے طرح طرح کی قربانیاں اور مشقتیں برداشت کرنے پر برانگیختہ کیا اور یہ محبت عالم علوی اور سفلی میں بلند ہمتوں میں ودیعت کی تاکہ وہ ایجاد، امداد اور قبول کے اعتبار سے قوت کو فعل کی طرف منتقل کریں اور بلند ہمتوں اور عالی جذبوں کو عالی شان رفعتوں کے حصول کے لئے ترغیب دی۔''

خالق کی صفات مخلوق میں:

صوفیہ کے ہاں اصل محبت تو خالقِ حقیقی کی محبت ہے اور مجازی محبت بھی اس کی معرفت کا ذریعہ ہے۔صوفیہ کا تصورِ 'ہمہ اوست' اسی عشقِ حقیقی کا نتیجہ ہے۔وہ ذاتِ باری تعالیٰ میں اس قدر

گم ہو جاتے ہیں کہ کائنات کے ذرے ذرے میں نورِ حق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ہر چیز میں جمالِ ذات وصفات دیکھنے لگتے ہیں۔ بیخودی کی یہ کیفیت کبھی کبھی انھیں اس منزل تک پہونچا دیتی ہے، جہاں خود اور خدا کا فرق مٹ جاتا ہے اور ہر طرف نورِ وحدت کا نظارہ ہوتا ہے شاید ایسی ہی کیفیت میں بعض صوفیہ نے 'انا الحق' کا نعرۂ مستانہ بلند کیا تھا۔

صوفیہ کی نظر میں انسان خالق کی شاہکار ہے۔ خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق میں بھی اس کی صفات کی جھلک نظر آئے۔ اللہ طاق ہے اور طاق کو پسند فرماتا ہے، وہ جمیل ہے اور جمال اسے محبوب ہے۔ وہ عالم وعلیم ہے اور علماء اس کی نظر میں افضل ہیں۔ اللہ سخی ہے اور اسے سخاوت کرنے والے پسند ہیں۔ خدا کو ایک کمزور کے مقابلے طاقت ور مومن محبوب ہے۔ وہ حیا کرنے والا ہے اور باحیا بندوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ وعدہ پورا فرمانے والا ہے اور پابندِ عہد بندے اسکی نظر میں محبوب ہیں۔ وہ شکور، صادق اور محسن ہے اسے ان صفات کے حامل بندے پسند ہیں۔

محبت آئینہ ہے:

محبوب کے اوصاف، محبّ کا شعور اور محبّ ومحبوب کا باہمی تعلق، یہ تینوں اسباب، محبت میں استحکام پیدا کرتے ہیں۔ جب محبوب کا حسن انتہا کو پہنچا ہو اور محبّ کا شعورِ محبت گہرا ہو نیز محبّ اور محبوب کے درمیان اعلیٰ درجے کی مناسبت ہو تو محبت دائم وراسخ ہوتی ہے۔ صوفیاء کی نظر میں اصل اور باقی جمال ربّ کائنات کا ہے باقی تمام فانی ہیں لہٰذا اصل محبت بھی اسی کی ہے باقی اگر کہیں جمال ہے تو وہ پرتو ہے اصل کا۔ بعض لوگ تو عشق کو ایک آئینے کی طرح سمجھتے ہیں جس میں محبّ اپنی طبیعت، نرمی اور دوسرے اوصاف کی جھلک دیکھتا ہے گویا وہ اپنی ذات سے محبت کررہا ہوتا ہے اور انسان کی اپنی ذات بھی خالق کی صفتِ خلق کا مظہر ہے۔

ابن قیم نے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے:

"اللہ رب العزت کی محبت، محبت کرنے والوں کے دلوں کو غیر کی محبت کی

لذت سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ دنیا میں اللہ کی محبت کی لذت کے برابر کوئی لذت نہیں اور آخرت میں اپنے محبوب کے دیدار سے بڑھ کر انھیں کسی بڑے اجر کی امید نہیں۔''

محبوب بندے:

صوفیہ کے پیغامِ محبت کی بنیاد کئی احادیث رسول ہیں۔ امام احمد نے ایک حدیث نبوی نقل کی ہے جس کے راوی عطا ابن یسار رضی اللہ عنہ ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا، تیرے اہل کون ہیں، جنھیں تو عرش کے نیچے جگہ عنایت فرمائے گا؟ فرمایا وہ لوگ جن کے ہاتھ گناہوں سے محفوظ اور دل پاک ہیں۔ جو میری خاطر باہم محبت رکھتے ہیں، جب میرا ذکر کیا جائے تو انھیں بھی یاد کیا جائے اور جب انھیں یاد کیا جائے تو میرا ذکر بھی کیا جائے۔ جو نا گواری کے باوجود بھی وضو کرتے ہیں اور میرے ذکر کی طرف ایسے لوٹتے ہیں جیسے پرندے گھونسلوں کی طرف اور وہ میری محبت کی وجہ سے تکلیف اٹھاتے ہیں جیسے بچہ لوگوں کی محبت کی وجہ سے تکلیف اٹھاتا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور حدیث نقل فرمائی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ تیرے محبوب بندے کون ہیں؟ فرمایا، جنھیں دیکھنے سے میں یاد آجاؤں۔

قرآن مجید کی سورہ انشراح میں فرمایا گیا:

''جب آپ احکام سے فارغ ہوں تو ریاضت کیجئے اور اپنے رب کی طرف دل لگایئے۔''

اسی طرح سورہ التوبہ کی آیت ۵۹ میں فرمانِ خداوندی ہے:

''اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر اسی پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اور کہتے ہیں اللہ ہی ہمیں کافی ہے اور وہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول۔ ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔''

ایک حدیث قدسی بھی ابن قیم نے نقل کی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

''اے میرے بندے تیرے حق کی قسم میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، تجھے میرے حق کی قسم کہ تو بھی مجھ سے محبت کر۔''

محبت کی یہی اصل ہے جو حضرات صوفیہ کے ہاں نظر آتی ہے اور اس کی اِساس چونکہ قرآن وحدیث ہے لہٰذا صوفیہ اس پر زور دیتے ہیں۔ اکثر صوفیہ کی سیر وسوانح میں ملتا ہے کہ انھوں نے برسوں خلوت اختیار کر کے عبادت وریاضت کی ہے۔ ظاہر ہے انھوں نے اسی محبت کی خاطر ایسا کیا۔ معروف صوفی حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ، میں نے حارث محاسبی کو فرماتے سنا، محبت تیرا کسی بھی چیز کی طرف مکمل طور پر پھر جانا اور مائل ہو جانا ہے پھر تیرا اس کو اپنی جان، روح اور مال پر ترجیح دینا پھر اعلانیہ اور خفیہ اس کی موافقت کرنا اور پھر اپنی محبت کو کوتاہ سمجھنا۔''

(روضۃ المحبین ونزہۃ المشتاقین)

حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں، جس کو محبت عطا کی گئی لیکن اس کی مثل خشیت عطا نہ ہوئی تو ایسا آدمی دھوکہ کا شکار ہے۔

(ایضا)

معروف صوفی حضرت یحیٰ بن معاذ کہتے ہیں محبت کا ایک ذرہ ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

وہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص سچا نہیں جو اللہ کی محبت کا دعویٰ کرے اور پھر اسکی حدوں کی حفاظت نہ کرے۔

(ایضا)

محبوبیت کی انتہا:

اللہ کے وہ بندے جو اپنے معبود سے سچی محبت کرتے ہیں انھیں ولی یا اللہ کا دوست

کہا جاتا ہے۔ان بندوں سے خود اللہ بھی محبت کرتا ہے۔ان کے تعلق سے بخاری شریف کی ایک حدیث ہے، جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں۔رسول محترم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو میرے ولی کی توہین کرتا ہے وہ مجھ سے اعلانِ جنگ کرتا ہے، اور بندہ فرائض کی ادائیگی کے علاوہ کسی چیز سے میرا قرب حاصل نہیں کرسکتا اور بندہ نوافل سے میرے قرب کو بڑھاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں اور جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، لہٰذا وہ مجھ سے سنتا ہے، مجھ ہی سے دیکھتا ہے، میرے ذریعے پکڑتا ہے اور میری دی ہوئی طاقت سے چلتا ہے۔اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے عطا فرماتا ہوں، اگر وہ مجھ سے پناہ چاہے تو اسے پناہ دیتا ہوں اور میں کسی چیز میں تردد نہیں کرتا، سوائے اپنے اس مومن بندہ کی موت کے جو موت کو ناگوار سمجھتا ہے اور مجھے اس کی موت کی برائی ناپسند ہے حالانکہ موت تو اس کے لئے ضروری ہے۔''

ذرا بندے کی محبوبیت کا عالم تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا خود کیسے اس کی محبوبیت حاصل کرلیتا ہے گویا اب محبت کرنے والا خود محبوب بن جاتا ہے اور اس کی ناز برداری ایسی ہورہی ہے کہ خالق کی مرضی بھی شامل ہوگئی ہے اور جو بندہ چاہتا ہے مالک اسے پورا فرمادیتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ محبت الٰہی کے تعلق سے کیا نظریہ رکھتے ہیں اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوجاتا ہے جسے ابن قیم علیہ الرحمہ نے نقل کیا ہے۔

''ابوبکر کتانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ حج کے زمانے میں محبت

الٰہیہ کی حقیقت کا مسئلہ زیر بحث آ گیا۔شیوخ نے اس بارے میں بحث فرمائی۔جنید بغدادی علیہ الرحمہ عمر میں ان سب سے چھوٹے تھے۔شیوخ نے فرمایا اے عراقی! تم بولو، محبت الٰہیہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ انھوں نے اپنا سر جھکا لیا، انکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر فرمایا ایک ایسا آدمی جو اپنے نفس کو چھوڑ چکا ہو، اپنے رب کی یاد سے مل چکا ہو، اس کے حقوق کو دلجمعی سے ادا کر رہا ہو، اپنے دل کی نگاہ سے اسے دیکھ رہا ہو، اللہ کی ذات میں مشغولیت کے انوار سے اس کا دل جل چکا ہو، اس نے محبت الٰہیہ کا جام انڈیل لیا ہو، اگر بولے تو اللہ کو بولے اگر گفتگو کرے تو اسی کے بارے میں، اگر حرکت کرے تو اللہ کے حکم سے، اگر خاموش رہے تو اللہ کی وجہ سے، وہ اللہ کا ہو، اس کے لئے ہو، اس کے ساتھ ہو۔''

جب بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے تو اللہ بھی اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہے اور پھر یہ محبوبیت بندوں میں بھی عام کر دی جاتی ہے اور محبوبِ خدا بندوں کا بھی محبوب بن جاتا ہے۔ایک حدیثِ نبوی بخاری، مسلم اور ترمذی تینوں کتابوں میں الفاظ کے فرق کے ساتھ موجود ہے۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر یہ محبت زمین والوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے۔''

اسی طرح قرآن مجید میں ہے:

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے درمیان محبت پیدا کر دے گا۔''

(سورہ مریم، آیت-٩٦)

مفسرین کے مطابق اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور انھیں لوگوں کا محبوب بنا دیتا ہے۔

محبت اور آخرت:

محبت اور محبوبیت کا یہ سلسلہ صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی جاری رہے گا اور اسکی برکت روز قیامت دیکھنے کو ملے گی۔ اس تعلق سے مختلف احادیث میں واضح بات ملتی ہے۔ ایک حدیث بخاری اور مسلم کی ہے اور الفاظ کے فرق کے ساتھ ترمذی اور سنن ابوداؤد میں بھی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے قیامت کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے کہا تم نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ سائل نے کہا، ویسے تو میں نے کوئی تیاری نہیں کی ہے مگر میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ یہ سن کر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، تم قیامت کے دن اس کے ساتھ ہوگے جس سے محبت کرتے ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بات سن کر جتنی خوشی ہوئی کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔

حضرات صوفیہ کرام رحمہم اللہ کے ہاں اپنے شیوخ اور اہل معرفت کے ساتھ محبت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اپنے مرشدِ طریقت کے ساتھ محبت کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں، خاص طور پر حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء اور ان کے مرید وخلیفہ حضرت امیر خسرو کی محبت تو بے مثال ہے۔ محبوبِ الٰہی کا یہ قول مشہور ہے کہ اگر ایک قبر میں دو لوگوں کو دفن کرنے کی اجازت ہوتی تو میں وصیت کرتا کہ خسرو کو میری قبر میں دفن کیا جائے۔ یہ امیر خسرو کی محبت کی انتہا تھی کہ مرشد کے انتقال کے بعد قبر مبارک کے قریب ماتمی لباس میں بیٹھے روتے رہتے۔ اکثر زبان پر یہ دوہا ہوتا۔

گوری سوئے سیج پر سوکھ پر ڈارو کیس
چل خسرو گھر آپنے سو سانجھ بھئی چو دیس

اسی حالت میں چھ مہینے گزار کر جان، جاں آفریں کے سپرد کیا اور محبّ ومحبوب کے درمیان کا حجاب آخر کار اٹھ گیا۔ آج بھی خسرو، مرشد کے قدموں میں خوابیدہ ہیں اور رہتی دنیا

تک کے لئے محبت کی زندہ مثال ہیں۔

محبت کا انعام:

محبت تصوف کی اساس ہے اور صوفیہ انسان ہی نہیں تمام مخلوقات سے محبت کرتے ہیں۔اس محبت کے بدلے وہ دنیا میں کوئی اجر نہیں چاہتے ،یہ محبت خالص اللہ کے لئے ہوتی ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی نظر میں اس کی مخلوقات محبوب ہیں لہٰذا ہمیں بھی چاہئے کہ اس کی مخلوقات سے پیار کریں اور ان کے ساتھ احترام کا برتاؤ کریں۔یہ عمل اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہے اور قیامت کے دن اس پر بھی انعام واکرام عطا فرمایا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، کہاں ہیں وہ لوگ جو میری وجہ سے آپس میں محبت رکھتے تھے؟ آج میں انھیں اپنے سایہ میں جگہ دونگا کہ آج میرے سایہ کے علاوہ کوئی دوسرا سایہ نہیں۔

ایسی ہی ایک دوسری روایت ترمذی میں ہے۔معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میری خاطر محبت کرنے والوں کے لئے نور کے منبر ہونگے اور ان پر انبیاء وشہداء رشک کرتے ہونگے۔

سنن ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام اعمال میں سب سے افضل اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے نفرت ہے۔

یہی اسباب ہیں کہ صوفیہ کرام انسانیت سے محبت کرتے ہیں اور اللہ کی مخلوقات سے محبت رکھتے ہیں۔سب جانوں کا احترام کرتے ہیں۔

دیدار محبوب:

اے میرے ماہ کامل پھر آشکار ہو جا

اُکتا گئی طبیعت تاروں کی روشنی سے

ایک محبّ کے لئے سب سے بڑی آرزو دیدارِ محبوب ہے۔اس سے بڑی کوئی تمنا ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں تک کہ ایک عاشق صادق کو اگر ساری دنیا دے کر اپنے محبوب کی ایک جھلک ملتی ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ عاشق صادق وہی ہوتا ہے جس کے ہوش وحواس پر اس کے محبوب کا تصور چھایا ہو۔ بولے تو زبان پر محبوب کا ذکر جاری ہو جائے۔اس کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دینے کا جذبہ رکھتا ہو۔اس سے منسوب ہر چیز سے لگاؤ رکھتا ہو لیکن ایک محبّ کی تمناؤں کی معراج دیدار جمالِ محبوب ہی ہے۔ دیدار یار تمام غموں کو کافور کر دیتا ہے اور عاشق کو ایک ایسی بے خودی و سرمستی کی کیفیت سے ہم آہنگ کر دیتا ہے جس کا لطف بیان سے باہر ہے یا جسے بیان کرنے کے لئے الفاظ ہی پیدا نہیں ہوئے۔ جب مجازی محبت میں انسان اس بلندی پر پہنچ سکتا ہے تو حقیقی محبت کس مقام تک لے جائے گی یہ تصور سے باہر ہے۔

ایمان کی تکمیل کا انحصار بھی محبت کی پختگی پر ہے۔محبت کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ بخاری، مسلم، ابن ماجہ اور نسائی کی ایک حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں کوئی بھی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

ظاہر ہے کہ جب اللہ کے بندے اور اس کے رسول سے محبت میں یہ پختگی درکار ہے تو پھر خالقِ رسول سے محبت اس سے کم نہیں ہونی چاہئے۔

صوفیہ کی نظر میں محبت کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی بنیادی وجہ قرآن واحادیث میں محبت کی فضیلت کا ہونا ہے۔ اللہ خوش ہوتا ہے اسکی مخلوقات سے محبت کرنے سے، انکے ساتھ حسنِ اخلاق اور مروت کا برتاؤ کرنے سے۔ یہاں ان جذبات کو وہ اہمیت حاصل ہے کہ ایک جانور کے ساتھ بھی اچھا سلوک انسان کو جنت کا حقدار بنا دیتا ہے۔اسی طرح کسی جانور کے اوپر ظلم بھی آدمی کو جہنم تک پہونچا دیتی ہے۔ایسا اس لئے ہے کہ اللہ اپنی مخلوقات سے بے حد پیار کرتا ہے۔ انسان لاکھ گناہ کرے، اپنے خالق و مالک کی نافرمانی کرے مگر اس کے کرم اور بخشش میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ وہ اپنی عطا میں کٹوتی نہیں کرتا۔ جس طرح ایک فرمانبردار بندے کو روزی

دیتا ہے اسی طرح ایک نافرمان کو بھی دیتا ہے ۔

ولیکن خداوندِ بالا و پست

در رزق بہ عصیاں بر کس نہ بست

صوفیہ کی نظر میں محبت، ایمان وایقان کی بنیاد ہے۔ جنت کی کنجی ہے۔ رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے مگر سب سے افضل محبت، محبتِ الٰہیہ ہے اور سب سے زیادہ مسرور کن دیدار، دیدارِ جمالِ خداوندی ہے۔ دنیا کے حسینوں کا حسن اللہ کا عطا کیا ہوا ہے۔ یہ حسن جب اتنا پرکشش ہے کہ دیکھنے والے نظریں ہٹانے کو تیار نہ ہوں تو خالقِ حسن کے جمال کا عالم کیا ہوگا؟ جس کے متعلق فرمایا گیا کہ 'اللہ جمیلٌ ویحب الجمال'۔ یقیناً اللہ جمیل ہے اور ایسا جمیل ہے کہ اس جیسا صاحبِ جمال کوئی دوسرا نہیں۔ اللہ کا ایک صفاتی نام جمیل بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر حسن و جمال والا کون ہوسکتا ہے، جسکی کاریگری نے کائنات کے ذرے ذرے میں جمال کے خزانے بکھیر دیئے ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے، حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ کے سامنے نور کا پردہ ہے اگر وہ اٹھا دے تو اس کے چہرے کے انوار حدِ نگاہ تک اس کی مخلوق کو جلا کر بھسم کر دیں۔'' اسی حسن کا ایک پرتو طور پر ظاہر ہوا تھا تو قیامت برپا ہوگئی تھی۔ ہر طرف سے صدائے الاماں بلند ہونے لگی تھی۔

دیدارِ جمالِ خداوندی:

صوفیہ کرام، اولیاء کاملین اسی حسن کے عاشق و متوالے ہوتے ہیں۔ وہ اسی کی ایک جھلک پانے کے لئے اپنی پوری زندگی لگا دیتے ہیں۔ جمالِ خداوندی کا نظارہ سر کی آنکھوں سے اس مادی دنیا میں ممکن نہیں۔ جب اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تمنا کی تھی تو اللہ نے فرمایا 'لن ترانی' (مجھے نہیں دیکھ سکتے) پھر اولیاء کے لئے اور بھی ناممکن ہے مگر آخرت میں یہی سب سے بڑی دولت ہوگی جو اہلِ محبت کو عطا فرمائی جائے گی۔ نسائی اور ابنِ حبان کی روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے کہ ''اے اللہ میں تجھ سے تیرے چہرے کے دیدار

کی لذت اور ملاقات کے اشتیاق کا سوال کرتا ہوں۔''

اسی طرح سنن ابنِ ماجہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جنت والے جنت کی نعمتوں میں محو ہونگے کہ اچانک نور چمکے گا وہ اپنے سروں کو اٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے اوپر ظہور فرمائے گا اور ارشاد ہوگا 'تم پر سلامتی ہو اے اہل جنت! اور یہی مراد ہے 'سلام قولا من رب رحیم' سے۔ پھر وہ سروں کو اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ انکو دیکھے گا اور وہ جنت کی نعمتوں کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہونگے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حجاب فرمائے گا، لیکن اس کا نور اور برکت ان پر ان کے گھروں پر اور ان کے مکانات میں باقی رہیں گے۔''

ترمذی کی ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ''سب سے اعزاز والا جنتی صبح وشام اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔''

معروف صوفی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''جب اہلِ جنت اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے تو جنت کی نعمتوں کو بھول جائیں گے'' اور ایسا کیوں نہ ہو کہ دیدارِ جمالِ محبوب سے بڑھ کر کوئی نعمت ایک محبّ کے لئے ہو بھی نہیں سکتی۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

''کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہونگے، اپنے رب کو دیکھتے ہونگے۔''

(القیامۃ، آیت-۲۲)

نسائی کی ایک روایت ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا قیامت کے دن ہم اپنے رب کو دیکھیں گے؟ فرمایا! کیا تمہیں بادلوں سے صاف دن میں سورج اور بادلوں سے صاف رات میں چاند دیکھنے میں کوئی مشکل پیش آتی ہے؟ ہم نے عرض کیا نہیں۔ پھر فرمایا یقیناً تم اپنے رب کو دیکھو گے، یہاں تک کہ وہ تم سے کلام بھی کرے گا اور کسی ایک سے کہے گا، اے میرے بندے! تو فلاں فلاں گناہ کو جانتا ہے؟ وہ کہے گا، اے میرے رب کیا تو نے مجھے معاف نہیں کر دیا؟ ارشاد ہوگا، میرے معاف کرنے کی وجہ سے ہی تو یہاں پہنچا ہے۔''

صوفیاء اور عشق:

عشق حقیقی کے تعلق سے اہلِ دل نے بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ انکی نظر میں عشق کی معراج دیدارِ محبوب ہے۔ لیکن اگر محبوب نے شربتِ دیدار نہیں پلایا تو بھی یہاں ناشکری کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، بلکہ اس سے تڑپ میں مزید زیادتی ہوتی ہے۔

جنت میں بھیج یا مجھے دوزخ میں ڈال دے
جلوہ دکھا کے پر مری حسرت نکال دے

ابنِ قیم نے اس سلسلے میں اپنی مشہور زمانہ تصنیف 'روضۃ المحبین ونزہۃ المشتاقین' میں کئی صوفیہ کے اقوال درج کئے ہیں جو رہروانِ راہِ سلوک کی مستانہ روی کا پتہ دیتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سری سقطی علیہ الرحمہ کو فرماتے سنا:

''شوقِ خداوندی جب عارف میں متحقق ہو تو یہ سب اس کا سب سے عالی شان مقام ہے۔ جب اس میں شوق پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ہر اس چیز سے توجہ ہٹا لیتا ہے جو اس کو اس کے شوق سے غافل کر دے۔''

یونہی جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ جب محبوب سے محب کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ روتا کیوں ہے؟ فرمایا یہ اس کی ملاقات کے شوق کے سرور اور درد کی وجہ سے ہوتا ہے۔

امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں عشقِ خداوندی کے تعلق سے کچھ صوفیوں کے حالات تحریر کئے ہیں۔ ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ صوفیہ محبت میں کس قدر اخلاص کے قائل ہیں:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خبروں میں ہے آپ نے فرمایا، جب تم کسی نوجوان کو اللہ تعالیٰ کی طلب میں مشغول دیکھو تو جان لو کہ اس نے اسے سب چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔''

(احیاء العلوم، جلد چہارم، صفحہ-۶۸۸)

آگے تحریر فرماتے ہیں:

''کسی بزرگ نے حضرت بشر بن حارث رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا ابونصر تمار اور عبدالوہاب وراق کا کیا حال ہے؟ فرمایا، میں نے اس وقت ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھاتے پیتے چھوڑا ہے۔ میں نے پوچھا اور آپ؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ میں نے کھانے پینے میں زیادہ رغبت نہیں رکھی تو اس نے مجھے اپنا دیدار نصیب فرمایا۔

حضرت علی بن موفق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا جنت میں داخل ہوتا ہوں، میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دستر خوان کے پاس بیٹھا ہوا ہے اور دو فرشتے اس کے داہنے بائیں اس کے منہ میں اچھے کھانوں کے لقمے ڈال رہے ہیں، اور وہ کھا رہا ہے۔ اور میں نے ایک دوسرے شخص کو جنت کے دروازے پر کھڑا دیکھا، جو لوگوں کے چہروں کو دیکھ دیکھ کر بعض کو اندر جانے دیتا ہے اور بعض کو واپس کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں، پھر میں ان سے آگے بڑھ کر خطیرۂ قدس (جنت) کی طرف گیا تو عرش کے خیموں میں ایک شخص کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف نظر لگائے دیکھ رہا ہے، اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا۔ میں نے رضوان فرشتے سے پوچھا یہ کون ہے؟ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت جہنم کے خوف اور جنت کے شوق سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں کی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کیلئے اس کو اپنے دیدار کی اجازت دے دی۔ کہا گیا ہے کہ دوسرے دونوں شخص حضرت بشر بن حارث اور حضرت احمد بن حنبل رحمہما اللہ تھے۔''

(احیاء العلوم، چہارم، صفحہ-۶۸۹)

حضرت سفیان ثوری کا مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے حضرت رابعہ بصریہ سے پوچھا کہ آپ کے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا، میں نے اللہ کی عبادت جہنم کے خوف اور

جنت کی محبت میں نہیں کی کہ میرا حال برے مزدور کے جیسا ہوتا بلکہ میں نے اللہ تعالیٰ کی محبت اور شوق میں عبادت کی۔

(ایضا)

صوفیہ سمجھتے ہیں کہ محبت میں خلوص شامل ہونا چاہیئے۔اس کے بغیر محبت کامل نہیں ہوتی۔یونہی اللہ کی عبادت بھی جہنم کے خوف اور جنت کے شوق میں اگر کی جائے تو یہ عبادت نہیں ایک طرح سے مزدوری ہے کہ بندہ محبتِ الٰہی میں عبادت نہیں کرتا بلکہ مزدوری میں وہ جنت چاہتا ہے۔عبادت خالص اللہ کے واسطے ہو وہی اصل عبادت ہے۔حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے، وہ اس سے محبت کرتا ہے اور جو آدمی دنیا کی معرفت حاصل کر لیتا ہے وہ زہد اختیار کرتا ہے، اور اس کا تصور کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے آپ سے محبت کرے، لیکن اپنے رب سے محبت نہ کرے، حالانکہ اسی کے ساتھ قائم ہے۔''

(احیاء العلوم، چہارم، صفحہ-۶۷۰)

حضرات صوفیہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی محبت سے بڑھ کر کوئی محبت نہیں، کیونکہ ان کا ذوق و شوق صرف اور صرف ذاتِ باری تعالیٰ میں رہتا ہے۔انھیں یہ پسند نہیں کہ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اسکی یاد سے غافل ہوں۔حضرت ابوسلمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ معروف صوفی ہیں۔ان کے اقوال مختلف کتابوں میں درج ہیں، جن سے ان کے ذوق وشوق کا پتہ چلتا ہے۔فرماتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن کو جہنم کا خوف اور جنت کی امید اللہ تعالیٰ کی ذات سے غافل نہیں کر سکتی تو دنیا کس طرح ان کو اللہ تعالیٰ سے بے خبر کر سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض احباب نے ان سے کہا اے ابو محفوظ! کس چیز نے آپ کو عبادت کی ترغیب دی اور مخلوق سے الگ کیا؟ آپ نے خاموشی اختیار کی۔اس نے کہا موت

کے ذکر نے؟ آپ نے فرمایا، موت کیا چیز ہے؟ اس نے پوچھا قبر اور برزخ کے ذکر نے؟ آپ نے فرمایا قبر کیا چیز ہے؟ پوچھا جہنم کے خوف اور جنت کی امید نے؟ فرمایا یہ کیا چیز ہیں؟ یہ سب کچھ ایک بادشاہ کے قبضے میں ہے اگر تم اس سے محبت کرو تو یہ سب کچھ تمہیں بھول جائے گا اور اگر تمہارے اور اس کے درمیان معرفت ہو تو وہ تمہیں ان چیزوں سے کفایت کرے گا۔''

(احیاء العلوم، چہارم، صفحہ-۶۸۸)

حضرت ابوسلیمان دارانی ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''جو شخص آج اپنے نفس میں مشغول ہوگا وہ کل بھی اپنے نفس میں مشغول ہوگا اور جو آج اپنے رب کے ساتھ مشغول رہے گا وہ کل بھی اپنے رب کے ساتھ مشغول رہے گا۔''

(احیاء العلوم، چہارم، صفحہ-۶۸۹)

محبت الٰہی کی لذت کو وہی پہچان سکتا ہے جسے اسکی معرفت عطا ہوئی۔ سونگھنے کی طاقت سے محروم انسان خوشبو کا احساس نہیں کرسکتا۔ آنکھوں کی بینائی سے محروم شخص کے لئے حسین نظاروں اور خوبصورت رخساروں کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ بہرا آواز کے جادو اور موسیقی کی لطافت سے لطف انداز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح عشقِ الٰہی کی لذت بھی عاشق ہی محسوس کرسکتے ہیں۔ صوفیہ کو معرفتِ خداوندی کی دولت عطا ہوتی ہے، اسی لئے وہ ہر محبت پر محبتِ الٰہیہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ روضۃ المحبین ونزہۃ المشتاقین' میں ہے:

''حضرت سلیمان دارانی سے پوچھا گیا کہ اللہ کے قرب کا سب سے موثر ذریعہ کیا ہے؟ تو وہ رونے لگے اور فرمایا کہ مجھ جیسے لوگوں سے ایسا سوال کیا گیا۔ اللہ کے قرب کا سب سے موثر ذریعہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تیرے دل کو پرکھے تو اس میں دنیا و آخرت کی چیزوں میں صرف اللہ کی ہی چاہت ہو۔''

معروف صوفی یحیٰی بن معاذ فرماتے ہیں:

''عبادت کی حقیقت تنہائی کی توجہ اور دل سے اللہ کے ہر غیر کا نکال دینا ہے۔''

صوفیہ کے اِن اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل محبت اللہ کی محبت ہے اور یہ دل میں اتنی راسخ ہو کہ ہر غیر کی محبت اس کے آگے ہیچ ہو جائے۔ ظاہر ہے اسی وجہ سے صوفیہ محبت حقیقی کو ایمان کی اساس سمجھتے ہیں اور انسان کی تخلیق کا مقصد بھی ان کی نظر میں محبت ہے

عشق سے عشق، محبت سے محبت مجھ کو
اس قدر ذوقِ بلا، شوقِ مصیبت مجھ کو

محبت کی علامت:

جس طرح خوشبو پھول کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے اور دھواں آگ کے وجود پر دلالت کرتا ہے پھلوں کی موجودگی پیڑوں کی موجودگی کی علامت ہے، اسی طرح صوفیہ کی نظر میں محبت کی بھی کچھ علامتیں ہیں۔ ان علامتوں کے بغیر محبت کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ صوفیہ کا ایک طبقہ ایسا بھی گزرا ہے جس نے خود کو عوام کی نظروں سے چھپانے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا جو عوام کی نظروں میں ناپسندیدہ تھا، لیکن ایسے صوفیہ کی تعداد بہت کم تھی۔ بیشتر اہل تصوف وہ تھے جو بحر معرفت میں گم اور جمال ذات میں کھوئے ہوئے تھے اور اسکی علامتیں بھی ان میں نمایاں تھیں۔ معروف عالم دین اور صوفی حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں محبتِ خداوندی کی نشانی یہ ہے کہ:

''وہ (بندہ) اللہ تعالیٰ کو اپنے ظاہری اور باطنی کاموں کا کفیل سمجھے، اللہ تعالیٰ ہی اس کو مشورہ دینے والا، وہی کاموں کی تدبیر فرمانے والا اور وہی اس کے اخلاق کو مزین کرنے والا ہے۔ وہی اس کے اعضا کو مصروف رکھتا اور اس کے ظاہر و باطن کو درست کرنے والا ہے۔ وہی اس کی تمام فکروں کو سمیٹ کر ایک فکر بنا دیتا ہے۔ اس کے دل میں دنیا سے نفرت ڈالتا ہے اور اپنے غیر سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ نیز خلوت میں مناجات کے ذریعے انس عطا کرتا

ہے۔اللہ تعالیٰ ہی اس کے اور اپنے درمیان سے حجاب اٹھاتا ہے، تو اس قسم کی باتیں اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت کی علامات ہیں۔''

(احیاء العلوم، چہارم، صفحہ ۔۲۳۱)

بندہ اپنے خالق و مالک سے محبت کرتا ہے اور یہ محبت جب انتہا کو پہنچتی ہے تو بندہ خود اپنے محبوب کا محبوب بن جاتا ہے اور درمیان سے حجابات اٹھنے لگتے ہیں پھر بندے میں محبت کی علامتیں بھی ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ یہ علامتیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔انھیں صوفیہ نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات چاہتا ہے اللہ بھی اس سے ملاقات کو پسند فرماتا ہے۔''

(بخاری، جلد دوم، کتاب الرقاق)

اسی لئے حضرات صوفیہ موت کو محبوب رکھتے ہیں اور اسے محبتِ خداوندی کی علامت تصور کرتے ہیں۔یعنی موت ایک ایسا ذریعہ ہے جو محبوب اور محبّ کے درمیان حجابات اٹھا دیتا ہے۔

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسیؔ
آج کی رات ہے اس گل سے ملاقات کی رات

امام محمد غزالی نے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے:

''بندے میں اللہ تعالیٰ کی چاہت کے بعد کثرتِ سجود سے بڑھ کر کوئی خصلت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی چاہت کو سجدے سے مقدم کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے محبت میں سچائی کی حقیقت کے لئے راہِ خدا میں شہادت کو شرط قرار دیا۔''

(احیاء العلوم، جلد چہارم، صفحہ)

اسی طرح حضرت سفیان ثوری اور حضرت بشر حافی رحمہما اللہ کے یہاں بھی موت کی محبت یا اس پر رضا کو محبتِ خداوندی کی دلیل سمجھا گیا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''موت کو وہی ناپسند کرتا ہے جسے شک ہو، کیونکہ محبّ کسی بھی حالت میں محبوب سے ملاقات کو ناپسند نہیں کرتا۔ حضرت بویطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک زاہد سے پوچھا کہ کیا تم موت کو پسند کرتے ہو؟ تو اس نے توقف کیا، حضرت بویطی نے فرمایا اگر تم سچے ہوتے تو موت کو محبوب جانتے۔''

(ایضا صفحہ-۷۳۳)

صوفیہ کرام اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کو اس کی محبت کی علامت قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے جب بندے کے اندر اللہ کی محبت راسخ ہوگی تو وہ اس کے احکام کی نافرمانی نہیں کرے گا اور طغیان وسرکشی کی جانب قدم نہیں بڑھائے گا۔ حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ عہدِ وسطیٰ کے معروف صوفیہ میں گنے جاتے ہیں، فرماتے ہیں:

''اللہ کی نافرمانی کمال محبت کی ضد ہے، اصلِ محبت کی نہیں۔''

(ایضا صفحہ-۷۳۷)

وہ ایک عارف کا قول نقل کر کے حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بھی علاماتِ محبت کا ذکر کرتے ہیں:

''جب ایمان دل کے ظاہر میں ہو تو اللہ تعالیٰ سے درمیانہ درجے کی محبت رکھتا ہے اور جب ایمان دل کے اندر چلا جائے تو وہ اس سے انتہائی محبت کرتا ہے اور گناہوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ محبت کے دعویٰ میں خطرہ ہے۔ اسی لئے حضرت فضیل علیہ الرحمہ نے فرمایا جب تم سے پوچھا جائے کہ کیا اللہ سے محبت کرتے ہو؟ تم چپ رہو۔ اگر تم کہو گے 'نہیں' تو یہ کفر ہے اور اگر تم 'ہاں' کہو گے تو تمہارا وصف محبین والا وصف نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرو۔ بعض علماء نے فرمایا کہ جنت میں اہلِ محبت اور معرفت کو حاصل ہونے والی نعمت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور نہ جہنم میں اس شخص کے عذاب سے زیادہ عذاب ہے جو محبت ومعرفت کا دعویٰ کرتا

ہے لیکن اس میں، ان میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی۔"

(ایضاً صفحہ-۷۳۷)

صوفیہ نے ذکر الٰہی کی کثرت کو محبتِ الٰہی کی دلیل قرار دیا ہے اور امرواقعہ یہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اسے کثرت سے یاد کرتا ہے۔ بات بات میں اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کا نام لیتے ہی زبان پر حلاوت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ محبوب کے ذکر کے بغیر بات پوری نہیں ہوتی۔ محبوب کے کلام سے اسے الفت ہوتی ہے۔ اس سے منسوب ایک ایک چیز سے اسے والہانہ لگاؤ ہوتا ہے۔ یہی کیفیت بدرجہ اولیٰ عشقِ حقیقی میں ہوتی ہے کہ بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے، تو اسکے کلام، اسکے ذکر، اس کے رسول اور اس کی مخلوقات سے بھی محبت کرنے لگتا ہے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت قرآن پاک سے محبت کرنا ہے، نیز اللہ تعالیٰ اور قرآن پاک سے محبت کی علامت نبی اکرم ﷺ سے محبت کرنا اور نبی اکرم ﷺ سے محبت کی علامت سنت سے محبت ہے اور سنت سے محبت کی علامت آخرت سے محبت کرنا ہے اور آخرت سے محبت کی علامت دنیا سے بغض رکھنا ہے اور دنیا سے بغض کی پہچان یہ ہے کہ ضروری اخراجات اور آخرت کے سوا کچھ نہ لے۔"

(ایضاً صفحہ-۷۳۸)

نبی محترم ﷺ نے خود بھی اللہ ورسول سے محبت اور انکی اطاعت کا حکم فرمایا۔ ارشاد ہوا:

"اللہ تعالیٰ سے محبت کرو کہ وہ تمہیں نعمت عطا فرماتا ہے اور مجھ سے اللہ کے لئے محبت کرو۔"

(المستدرک للحاکم، جلد سوم، کتاب معرفت الصحابہ)

صوفیہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اکثر گوشہ نشیں رہ کر عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ ایسی گوشہ نشینی کو وہ محبتِ الٰہی کی علامت قرار دیتے ہیں۔ گوشہ نشینی میں ذکر وفکر زیادہ انہماک سے کیا

جا سکتا ہے۔نماز، تلاوتِ قرآن اور دعا ومناجات ترکِ دنیا کر کے زیادہ یکسوئی سے کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح رات کی تنہائی میں ہر طرح کے دنیاوی مشاغل سے انقطاع کر کے اپنے خالق کا ذکر صوفیہ کو محبوب رہا ہے اور یہ علامتِ محبت میں ہے۔حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے ایک بلند پایہ صوفی ہیں۔ایک بار ایک پہاڑ سے ذکر وفکر کے بعد اتر رہے تھے،کسی نے دریافت کیا کہاں سے آرہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا:

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس سے۔'' (احیاء العلوم، چہارم صفحہ-۷۳۸)

صوفیہ نے ترکِ دنیا ایک خاص مدت کے لئے کی اور پھر وہ آبادی کی طرف لوٹ آئے، کیونکہ اسلام نے رہبانیت کی اجازت نہیں دی مگر اس دنیا میں رہ کر دنیا سے بے رغبتی ان کے مزاج کا خاصہ رہی ہے۔اللہ کے بندوں کے درمیان رہ کر اپنے مالک کی عبادت ان کا مشغلہ رہا اور بندوں کو اللہ کی محبت کی دعوت ان کا نصب العین۔خدا کی مخلوق سے محبت بھی خالق سے محبت کی علامت ہے لہٰذا مخلوقات کی خدمت بھی صوفیہ کا مشن رہا ہے۔بیشتر صوفیہ دن رات لوگوں کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ،چشتی سلسلے کے بلند پایہ صوفی ہیں۔انھوں نے راجدھانی دلی میں رہ کر بے شمار بندگانِ خدا کی خدمت کی۔آپ کا دروازہ ہر امیر وغریب کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ضرورت مند کسی بھی وقت آکر اپنی ضرورت پیش کر سکتے تھے۔لنگر میں ہر روز ہزاروں غریب و مسکین کھانا کھاتے تھے۔لا تعداد طلباء، علماء، درویش اور یتیم ونادار آپ کے وظیفے پر پلتے تھے۔ان صوفیہ حضرات کے یہاں خالق کی محبت کا علامتی ظہور مخلوقات کی خدمت میں ہوتا تھا۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا عاشق بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

❖○❖

مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔قرآن مجید

۲۔بخاری

۳۔مسلم

۴۔ترمذی

۵۔ابن ماجہ

۶۔نسائی

۷۔سنن ابوداؤد

۸۔ابن حبان

۹۔روضۃ المحبین ونزہۃ المشتاقین

۱۰۔المستدرک للحاکم

۱۱۔احیاء العلوم

ہر عزیز اور یگانے سے بے پرواہو جا، کیوں کہ لوگوں سے
بے نیازی ہی مالداری ہے۔

(مکاشفۃ القلوب)

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

اقبالؔ

تصوف اور بیعت وخلافت

صحبت صالح ترا صالح کند (اچھوں کی صحبت تجھے اچھا بنائیگی ۔) شیخ سعدیؔ شیرزی کا یہ مصرع آج ضرب المثل کی طرح بولا جاتا ہے۔ سعدیؔ ایک دوسری جگہ کہتے ہیں کہ اصحابِ کہف کا کتا اچھے انسانوں کے ساتھ رہ کرانسانیت کے اوصاف سے متصف ہوگیا اور نوح علیہ السلام کے بیٹے نے برے لوگوں کی ہم نشینی اختیار کی تو مقام نبوت حاصل کرنے سے محروم ہوا۔ یقیناً آدمی اپنے ماحول سے بہت کچھ حاصل کرتا ہے اور بہت سے اثرات وہ اپنے آس پاس سے لیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ صوفیہ کے حلقوں میں صحبتِ شیخ کو خاص مقام حاصل رہا ہے۔ جس مرید نے اپنے پیر کے ساتھ زیادہ وقت بتایا اسے فیضانِ صحبت بھی زیادہ حاصل ہوا اسی لئے صوفیہ کا اس بات پر زیادہ زور رہا ہے کہ راہِ سلوک پر چلنے کا خواہشمند پہلے کسی پیر کا مرید بن جائے، پھر پیر کی رہنمائی میں راہ سلوک طے کرے۔ مرشد کی رہنمائی کے بغیر راہِ طریقت پر چلنے کا تصور صوفیہ کے

یہاں نہیں پایا جاتا۔ حضرت سید علی ہجویری علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''مریدوں کے لئے سب سے اہم ترین چیز صحبت ہے، کیونکہ صحبت کے حق کی رعایت کرنا اہم فرض ہے۔ چونکہ مریدوں کے لئے انفرادی اور علیٰحدگی کی زندگی گزارنا موجبِ ہلاکت ہے۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۴۹۰)

داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری علیہ الرحمہ نے حضرت جنید بغدادی کے ایک مرید کا حال بھی لکھا ہے، جس کے دل میں غرور پیدا ہو گیا اور وہ اپنے پیر کی صحبت سے دور ہو کر شیطان کے مکر میں گرفتار ہوا مگر اسے آزادی حضرت جنید بغدادی کی مدد سے ملی۔ صحبتِ شیخ کے بے شمار فوائد صوفیہ نے بیان فرمائے ہیں۔ اس کے بعد دوسری منزل گوشہ نشینی کی آتی ہے۔ گوشہ نشینی بھی اپنے پیر کے حکم کے مطابق ہونی چاہئے۔ یہاں بھی پیر کے حکم کا لحاظ ضروری ہے تاکہ مرید کو اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو یا راہِ طریقت طے کرنے میں کوئی رکاوٹ آئے تو پیر اسکی دست گیری کر سکے۔

بیعت کیا ہے؟:

سلاسل طریقت میں یہ دستور ہے کہ پیر، راہِ سلوک پر چلنے کے خواہشمند مبتدی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چند وعدے کراتا ہے، مثلاً میں تمام چھوٹے اور بڑے گناہوں سے دور رہونگا اور جو کچھ سرزد ہوئے ہیں ان سے توبہ کرتا ہوں۔ تمام اہل حقوق کے حقوق کی ادائیگی کروں گا، نماز روزے کی پابندی کروں گا، فرائض ترک نہیں کروں گا اور سنتوں پر عمل کروں گا۔ بعض پیر اپنے مریدوں کو بطور تبرک ٹوپی وغیرہ بھی دیتے ہیں۔ بیعت کا یہ سلسلہ صدیوں سے رائج ہے۔ اس موقع پر مریدین کو کچھ اوراد اور وظیفے کی تلقین بھی پیر کی طرف سے کی جاتی ہے۔

خلافت کیا ہے؟:

پیر جب کسی مرید کو اس لائق پاتا ہے کہ وہ علم وعمل میں اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ

دوسروں کی رہنمائی کر سکے تو اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اب وہ دوسروں کو مرید بنا سکتا ہے، اجازت دینے کے اسی عمل کو خلافت کہا جاتا ہے۔ ہر پیر اپنے کئی لائق مریدوں کو خلافت دیتا ہے۔اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔بعض پیر اپنے خلفاء کو تبرک اور نشانی کے طور پر اپنا یا اپنے پیر کا خرقہ، عصاوغیرہ بھی دیتے ہیں۔

پیر کی حیثیت:

تصوف میں پیر کی حیثیت ایک رہنما اور استاد کی ہے۔ یہاں اس کی رہنمائی اور رہبری کے بغیر آگے بڑھنے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اسے ممکن سمجھا جاتا ہے۔ یہاں یہ مقولہ بھی مشہور ہے کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے۔ پیر کو اپنے مرید پر مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہ جس طرح چاہے اپنے مرید کے معاملات میں دخل دے سکتا ہے۔اسی طرح مرید کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ خود کو اپنے پیر کے حوالے اس طرح کردے، جس طرح غسال کے ہاتھ میں میت۔ مرید کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ اپنے پیر کے خلاف کوئی بات اپنے دل میں لائے، اگر اسکے برخلاف کوئی بات کرتا ہے تو وہ مرید نہیں، عہد توڑنے والا ہے۔

سلاسل طریقت:

اہل تصوف کا خیال ہے کہ پیری مریدی کے سلسلے رسول اکرم ﷺ تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً آج اگر ایک شخص کو خلافت ملی ہے تو اسے خلافت دینے والے پیر کو بھی کسی پیر نے خلافت دی تھی، اسطرح یہ سلسلے نبی کریم ﷺ تک پہنچتے ہیں۔ یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی کا سلسلہ کئی واسطوں سے حضور اکرم ﷺ تک پہنچتا ہے۔ سلسلہ یوں ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ عثمان ہارونی، حضرت شریف زندانی، خواجہ مودود چشتی، شاہ ناصرالدین یوسف، شاہ محمد زاہد، احمد ابدال چشتی، ابواسحاق شامی، ممشاد علوی، ابونبیرہ بصری، شاہ حذیفہ مرعشی، شاہ ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، خواجہ عبدالواحد، حسن بصری، حضرات علی مرتضیٰ وعمر فاروق رضی

اللہ عنہم ۔ نبی کریم ﷺ۔

چشتی سلسلے میں ایک ہی کڑی میں حضرت عمر فاروق اور مولائے کائنات علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما دونوں آتے ہیں، گویا حضرت حسن بصری رحمہ اللہ علیہ کو دونوں سے خلافت واجازت حاصل تھی۔ بیشتر سلاسل طریقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام آتا ہے، مگر کہیں کہیں حضرت علی کی جگہ دوسرے اصحاب کے نام بھی آتے ہیں۔

مشہور سلاسل:

برصغیر میں چشتی سلسلے کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف منسوب ہے۔ قادری سلسلہ بھی یہاں مقبول ہوا جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف منسوب ہے۔ علاوہ ازیں سہروردی سلسلہ کی طرف بھی اہلِ سلوک کی توجہ رہی ہے، جو شیخ شہاب الدین سہرودی سے جاملتا ہے۔ ان سلسلوں کے علاوہ بھی کئی سلسلے برصغیر میں رائج ہوئے، جن میں سے کچھ انھیں سلسلوں کی شاخیں ہیں۔ جیسے اشرفی سلسلہ، جو حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی سے متصل ہوتا ہے۔ وارثیہ سلسلہ جس کے بانی حضرت حاجی وارث علی شاہ ہیں۔ فردوسیہ سلسلہ جو مخدوم شرف الدین یحیٰ منیری کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مجددیہ سلسلے کا بانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کو سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر میں کبروی سلسلے کو خوب خوب ترقی ہوئی جو شاہ ہمدان سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے وادی میں پہنچا۔ اس کے بانی حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ نقشبندی سلسلے کو بھی کشمیر میں مقبولیت حاصل ہوئی جس کے بانی خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ کشمیر کے بڑے بڑے صوفیہ اور رشی اس سلسلے سے وابستہ ہوئے۔

سلوک کے فائدے:

راہ سلوک پر چلنا ایک دشوار کام ہے۔ زندگی کی ضرورتوں کو مختصر کرنا، توکل میں شب وروز بسر کرنا، اپنی جمع شدہ دولت کو اللہ کے نام پر خرچ کردینا، عیش وعشرت کو چھوڑ فقر وفاقہ کی

زندگی بسر کرنا، نفس کی مخالفت میں مجاہدہ کرنا یقیناً ایک مشکل امر ہے۔ لیکن معرفتِ حق کے متوالے اس کٹھن ڈگر پر چلنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''عارفوں میں صادق وہ ہے جس کی ملکیت میں کوئی چیز نہ ہو اور نہ وہ کسی کی ملکیت میں ہو۔''

(دلیل العارفین، مجلس-۱۰)

خواجہ صاحب نے ایک مقام پر حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کے حوالے سے بیان فرمایا ہے:

''ایک صوفی نے سوال کیا کہ صوفی اور عارف کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا صوفی اور عارف وہ ہیں جن کے دل کدورتِ بشریت سے آزاد ہوں، دنیا وحب دنیا سے صاف ہوں۔ جب ان میں یہ اوصاف پائے جائیں گے تو وہ اعلیٰ درجہ پائیں گے۔ تمام مخلوقات سے برگزیدہ کہلائیں گے۔ وہ غیر دوست سے دور بھاگیں گے، پھر وہ مالک ہو جائیں گے نہ کہ مملوک۔''

(ایضا)

راہ سلوک کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں انسان کی روحانی تربیت ہوتی ہے اور اس راستے پر چلنے والوں کے دل کو کدورتِ بشریت سے آزاد کر کے دنیا وحبّ دنیا کو دل سے نکالا جاتا ہے۔ دل مقامِ الٰہی ہے۔ تصوف کا مقصد بھی بتانِ خود آرا سے اس کعبے کو پاک وصاف کر کے صرف اللہ کے لئے مخصوص کرنا ہے۔ جب یہ مقام تمام بتانِ ہوا وہوس سے پاک ہو جائے اور تجلیاتِ الٰہی سے معمور ہو جائے تو یقیناً مقامِ الٰہی کہلانے کے لائق ہو جاتا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ملفوظات میں ہے:

''اہل توکل پر تجلیاتِ شوق میں ایک ایسا مقام آتا ہے کہ اگر اس وقت انھیں ذرہ ذرہ کر دیا جائے یا تلوار سے زخمی کر دیا جائے یا کسی طرح رنج والم پہنچایا

جائے تو انھیں مطلق خبر نہیں ہوتی۔''

(دلیل العارفین، مجلس-۱۱)

تصوف انسان کو اسی مقام پر لے جانا چاہتا ہے۔ وہ خالق و مخلوق کے درمیان سے اسی حجاب کو اٹھانا چاہتا ہے۔ خدا کی عبادت انسان عذابِ الٰہی کے خوف سے کرتا ہے مگر صوفیہ کی نظر میں یہ عبادت خالص نہیں، مخلصانہ عبادت تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی محبت میں اس کی عبادت کرے، اس کے لئے نماز روزہ اور حج وزکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی کرے۔

اہل تصوف کی نظر میں راہ سلوک پر چلے بغیر معرفت خداوندی حاصل نہیں ہوتی اور اس راستے پر چلنے کے لئے کسی خداشناس رہنما کی ضرورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ اولیاء اللہ کی خدمت اور ان کے سلسلوں سے وابستگی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر نے فرمایا کہ:

''اے درویش! جب تک تو درویشوں کی خدمت نہ کرے گا کبھی بھی کسی مقام پر نہ پہنچے گا۔''

(اسرار الاولیاء، فصل-۵)

تصوف کے جہاں بہت سے فائدے ہیں وہیں اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہاں تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن ہو جاتا ہے۔ تصوف اس پہلو پر خاص زور دیتا ہے اور اس کے بغیر راہِ سلوک پر چلنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''جو نفس سے میں نے کیا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ آدھی رات کو میرے دل میں خیال آیا کہ باقی آدھی رات جاگنا چاہیے۔ نفس نے میری مخالفت کی اور میرا اہم خیال نہ ہوا۔ میں نے قسم کھالی کہ اے نفس تو نے میری راہ زنی تو کی ہے اور میرے ساتھ عبادت میں مشغول نہ ہوا۔ اب میں بھی تجھے سال بھر تک پانی نہ دونگا۔ چنانچہ ویسا ہی کیا سال بھر تک پانی نہ دیا۔''

(افضل الفواد، فصل-۱۰)

محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ نے اپنی ایک مجلس میں حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے چالیس سال تک میوہ نہ کھایا اوراس کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”اس کے دو سبب ہیں۔ایک یہ کہ جس زمین میں یہ میوہ ہوتا ہے، وہ زمین لشکر کے قبضے میں ہے۔دوسرے نفس سے میری ضد ہے کہ یہ میوہ تجھے نہ دونگا۔“

(افضل الفواد، فصل-١٦)

اصلاحِ نفس اور تزکیۂ نفس کا جو انداز صوفیہ کے یہاں ملتا ہے کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ نے بارہ سال تک انار نہیں کھایا۔دل خواہش کرتا رہا مگر آپ مخالفت کرتے رہے۔یہاں تک کہ آپ کے سامنے انتقال سے قبل انار لایا گیا جسے کھانے سے انکار کر دیا۔

تصوف انسان کے اندر بہت سی تبدیلیاں لاتا ہے۔عبادت کا وہ تصور جو علماء ظواہر کے یہاں ملتا ہے، اس سے سینکڑوں درجہ زیادہ خلوص صوفیہ کے یہاں ملتا ہے۔اہلِ تصوف کی نظر میں عبادت محض ظاہری رسم نہیں ہے بلکہ معبود کے سامنے خود سپر گی ہے۔ترک و تجرد ہی روحانیت کے لئے کافی نہیں، بلکہ یہاں اپنی ذات کو بھی ترک کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے۔فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات پر عمل کافی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کی روح کو سمجھنا اور خود کو اس کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔

❖○❖

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابیں معاون رہیں:

۱۔ کشف المحجوب
۲۔ دلیل العارفین
۳۔ افضل الفواد
۴۔ رودِ کوثر
۵۔ گلستانِ سعدی
۶۔ خواجہ بہاء الدین نقشبند اور سلسلہ نقشبندیہ
۷۔ انیس الارواح
۸۔ تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ
۹۔ اسرار الاولیاء

اے مال کے جمع کرنے والے! تو نے دولت اکٹھی کرلی،
مجھے یہ بتلا تو نے اسے خرچ کرنے کے لئے اپنے دن بھی
اکھٹے کرلئے ہیں؟

(مکاشفۃ القلوب)

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اقبالؔ

تصوف کی اصطلاحیں

ہر فن کی کچھ اصطلاحیں مخصوص ہیں۔ان اصطلاحوں کو اس فن کے جانکار اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں دوسروں کے لئے یہ اصطلاحیں نا قابلِ فہم ہوتی ہیں۔دوسرے الفاظ میں یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر علم وفن کے کچھ تکنیکی الفاظ ہیں جنھیں اس علم وفن سے تعلق رکھنے والے اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر دوسروں کے لئے وہ اجنبی ہوتے ہیں۔بالکل اسی طرح صوفیہ کی بھی کچھ اصطلاحیں ہیں جو اہل تصوف میں رائج ہیں اور وہ ان الفاظ سے مخصوص مطلب مراد لیتے ہیں۔دوسروں کے لئے یہ الفاظ بہت اہم نہیں مگر اہل تصوف کے لئے ان کی خاص اہمیت ہے۔ ہم یہاں ایسے ہی کچھ الفاظ اور ان کا مفہوم درج کرتے ہیں تاکہ تصوف کا مطالعہ کرنے والے جب اس موضوع پر پڑھیں تو انھیں سمجھنے میں آسانی ہو۔ان الفاظ کی تشریح امام تصوف حضرت ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'رسالہ قشیریہ' میں درج کی ہے۔

وقت:

عرف عام میں وقت کا مطلب 'سمے' یا 'ٹائم' ہوتا ہے۔لیکن صوفیہ اسے ایک مخصوص اصطلاح میں لیتے ہیں۔ان کے نزدیک صوفی کی ایک خاص حالت یا کیفیت کا نام وقت ہے۔یعنی وہ اس وقت جس حالت میں ہے وہی اس کا وقت ہے۔اس مفہوم کو یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ ماضی اور مستقبل کے بیچ کے وقفے کو وقت کہتے ہیں۔وہ وقفہ جس کے بیچ میں صوفی کا وقوف ہے۔امام قشیری علیہ الرحمہ اپنے استاد ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس سلسلے میں نقل کرتے ہیں:

"جس آن میں تم ہو وہی تمہارا وقت ہے،اگر تم دنیا میں ہو تو تمہارا وقت دنیا ہے،اگر عقبیٰ میں ہو تو تمہارا وقت عقبیٰ ہے۔اگر غم میں ہو تو تمہارا وقت غم ہے اور اگر خوشی میں ہو تو تمہارا وقت خوشی ہے۔"

(رسالہ قشیریہ،صفحہ-۱۹۸)

شیخ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد خود وہ اپنی رائے لکھتے ہیں کہ:

"ان کی مراد یہ ہے کہ جو حالت انسان پر غالب ہے وہی اس کا وقت ہے،اور بعض اوقات وقت سے مراد وہ زمانہ ہوتا ہے،جس میں انسان ہے۔کیونکہ کچھ لوگوں نے وقت کی تعریف یہ کی ہے کہ وقت وہ ہے جو دو زمانوں،ماضی اور مستقبل کے درمیان ہے۔اور وہ کہتے ہیں کہ صوفی وقت کا بیٹا ہے اور اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ وہ اس وقت اس حالت میں مشغول ہے،جو اس کے لئے بہتر ہے اور اس چیز پر قائم ہے جس کا مطالبہ اس سے کیا جاتا ہے۔"

(ایضا)

وقت کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک خط میں ایک شعر درج کرتے ہیں

صوفی ابن الوقت آمد درمثال
لیک صافی فارغ است از وقت وحال
(صوفی سکر میں وقت کا تابع ہے اور صحو والا بے نیازِ وقت وحال ہے۔)
(مکتوباتِ مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب ۸۴)

اس کی اجمالی تشریح یہ ہے کہ صوفی وقت کا تابع ہوتا ہے جیسا کہ بیٹا، باپ کا تابع ہوتا ہے یعنی وہ وقت کا پابند ہوتا ہے مگر صافی وہ ہے جو وقت سے آگے نکل چکا ہے اور وقت پر غلبہ پا چکا ہے۔ وقت اس کے سامنے مغلوب ہے۔ وہ ابن الوقت نہیں ابوالوقت ہے۔

حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'کشف المحجوب' میں وقت کی اپنے انداز میں تشریح کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''وقت اسے کہتے ہیں کہ بندہ اس کے سبب اپنے ماضی اور مستقبل سے فارغ ہوجائے۔ بندے کے دل پر حق تعالیٰ کی طرف سے جو واردات طاری ہوتے ہیں ان کے اسرار کو دل میں محفوظ رکھے جس طرح کشف ومجاہدہ میں ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے دل میں نہ تو پہلے کی کوئی یاد رہے اور نہ آئندہ کی فکر۔ اس حالت میں کسی مخلوق کی اس پر دسترس نہیں رہتی اور نہ کوئی یاد باقی رہتی ہے کہ ماضی میں اس پر کیا گزرا اور مستقبل میں کیا ہوگا؟''
(کشف المحجوب، صفحہ۔۵۳۰)

ان تمام عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ وقت کی تشریح میں صوفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ 'وقت' صوفی کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ مگر داتا صاحب اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صاحبانِ وقت کہتے ہیں کہ ہمارا علم، ماضی و مستقبل کا ادراک نہیں کرسکتا۔ ہم تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش ہوتے ہیں، کیونکہ ہم اگر کل کی فکر میں مشغول ہوں اور دل میں آئندہ کے اندیشہ کو جگہ دیں تو ہم وقت

سے محجوب ہو جائیں گے۔حجاب بہت بڑی پراگندگی اور موجبِ پریشانی

ہے۔لہٰذا جس چیز پر دسترس نہ ہواس کا اندیشہ باطل ہے۔'' (ایضا)

داتا صاحب علیہ الرحمہ کی نظر میں 'وقت' صوفی کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے۔وہ حال جو، اب صوفی کے لئے وقت کی صورت اختیار کر چکا ہے وہی سب کچھ ہے کیونکہ ماضی گزر چکا ہے اب اس کی فکر بے کار ہے اور مستقبل سے وہ بے خبر ہے، لہٰذا اب جو کچھ ہے وہ حال ہی ہے۔اس سلسلے میں حضرت ابوسعید خرازی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی اہمیت کا حامل ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صوفیہ کی نظر میں 'وقت' کی کیا قدر و قیمت ہے۔

''حضرت ابوسعید خرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے عزیز وقت کو عزیز ترین چیزوں کے سوا کسی سے مشغول نہ کرو اور بندے کی عزیز ترین چیز ماضی و مستقبل کے درمیان وقت اور حال ہے۔اسی میں مشغول رہنا چاہئے۔''

(ایضا)

اصل میں 'وقت' صوفی کے لئے وہ لمحہ ہے جب وہ اللہ کی ذات میں محو ہوتا ہے اور ساری دنیا سے بے خبر ہوتا ہے۔وہ خود اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔صوفیہ اس کیفیت کے لئے احادیث سے دلیلیں لاتے ہیں اور رسول محترم ﷺ کی شب معراج کی حالت کو پیش کرتے ہیں۔

''حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ، اللہ تعالیٰ کے حضور میں میرا ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت میرے دل میں اٹھارہ ہزار عالم میں سے کسی کا بھی گزر ممکن نہیں۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۳۱)

یہ وقت ذات باری تعالیٰ میں گم ہونے کا ہوتا ہے۔اسی لئے شب معراج جب بے شمار نعمتیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کی گئیں تو بھی آپ نے ان کی طرف نظر آٹھا کر نہیں دیکھا اور مازاغ البصر و ماطغی کی کیفیت میں مبتلا رہے۔یہ گویا آپ کا وقت تھا۔

تصوف کا مقصد اللہ کی ذات میں فنا ہو جانا ہے۔ یہاں ہر عمل کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے فنائیت۔ 'وقت' سے جب صوفی گزر جاتا ہے تو وہ فنا ہو جاتا ہے مگر جب تک وہ 'وقت' میں ہے تب تک باقی ہے۔ استاد ابو علی دقاق علیہ الرحمہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

''وقت ریتی کی طرح ہے جو تجھے گھستا ہے مگر فنا نہیں کرتا۔ یعنی اگر تجھے فنا کر دے تو نجات پا جائے، مگر وقت تمہیں گھٹاتا جاتا ہے اور کلیۃ مٹاتا نہیں۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۱۹۹)

صوفی کی منزل فنا ہے۔ جو فنا ہو گیا وہ منزل پا گیا مگر وقت اسے گھٹاتا جاتا ہے فنا نہیں کرتا۔ یہاں فنا ہونے والا ہی باقی رہتا ہے اور جو دنیا کی نظر میں باقی رہتا ہے وہ اصل میں باقی نہیں۔

'وقت' کی صوفیہ دو قسمیں بتاتے ہیں۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ عارف کے دو 'وقت' ہوتے ہیں ایک کھونے کا دوسرا پانے کا۔ ایک فراق کا، دوسرا وصال کا۔ صوفی جب تک خدا کا عرفان حاصل نہیں کر پاتا وہ فراق میں ہے اور جب وہ اپنے خالق کی ذات کا عرفان حاصل کر لیتا ہے وہ وصال کی کیفیت میں ہے۔ دونوں حالتوں میں 'وقت' مغلوب ہوتا ہے۔ چونکہ بندے کا اختیار اس سے جدا کر دیا جاتا ہے لہٰذا وہ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے اختیار سے نہیں کرتا۔ داتا صاحب نے اس سلسلے میں جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا بیان کردہ ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

''جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیابان میں ایک درویش کو دیکھ، جو کیکر کے درخت کے نیچے سخت دشوار جگہ میں بیٹھا ہوا تھا میں نے اس سے کہا اے بھائی کس چیز نے تمہیں یہاں بٹھایا ہے۔ یہ جگہ بڑی سخت و دشوار ہے اور یہاں تم بیٹھے ہو؟ اس نے کہا بارہ سال اسے گزر چکے ہیں۔ اب میں اپنے شیخ سے استدعا کرتا ہوں میرے کام میں میری مدد فرمائیں تا کہ اپنے وقت میں اپنی مراد کو حاصل کر سکوں۔ حضرت جنید بغدادی (علیہ الرحمہ) فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے چل دیا۔ حج کیا اور اس کے لئے دعا کی جو خدا

نے قبول فرمائی اور وہ اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ جب واپس آیا تو اس درویش کو اس جگہ بیٹھا پایا۔ میں نے اس سے کہا اے جوانمرد! اب جب کہ تم نے اپنا وقت پالیا تو اب یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا، اے میرے شیخ! یہ وہ جگہ ہے جہاں مجھے وحشت و پریشانی لاحق ہوئی تھی اور میرا سرمایہ گم ہوا تھا اور اب بھی یہی وہ جگہ ہے جہاں سے میرا گم شدہ سرمایہ مجھے دوبارہ ملا ہے۔ میں نے اس جگہ کو پکڑ لیا ہے، مجھے اس جگہ سے محبت ہوگئی ہے۔ کیا اب میرے لئے جانا جائز ہوگا کہ میں اس جگہ کو چھوڑ دوں اور کسی اور جگہ چلا جاؤں۔ میری تمنا ہے کہ مرکر میری مٹی بھی اسی جگہ مل جائے اور قیامت کے دن جب اٹھایا جاؤں تو میں اسی جگہ سے اٹھوں۔ یہ میرے انس و محبت کی جگہ ہے۔''

(کشف المحجوب، صفحہ ۵۳۱۔۵۳۲)

'وقت' کا مطلب صوفیہ کے ہاں اسکے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے اور وہ کئی بار اس سے مراد وہ مفہوم لیتے ہیں جو اس وقت ان کے ذہن میں ہوتا ہے۔ مشائخ طریقت 'وقت' کو ایک کاٹنے والی تلوار کے مشابہ قرار دیتے ہیں، جو ماضی اور مستقبل کی جڑوں کو کاٹتا ہے اور اس کے غموں کو مٹاتا ہے۔

حال:

'وقت' کی طرح 'حال' بھی ایک صوفیانہ اصطلاح ہے۔ اسے صوفیہ اپنے مخصوص مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی تشریح میں حضرت ابوالقاسم عبدالکریم قشیری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''حال ایک کیفیت ہے جو بلاارادہ اور بغیر کوشش کے ان کے دل پر طاری ہوتی ہے۔ مثلاً طرب، غم، بسط، قبض، شوق، بے قراری، ہیبت اور احتیاج احوالِ وہبی ہوتے ہیں، اور مقامات کسبی ہوتے ہیں۔ احوال سعی اور کوشش کے بغیر حاصل ہوتے ہیں اور مقامات کے حصول کے لئے محنت اور

جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔صاحبِ مقام اپنے مکان پر متمکن ہوتا ہے
اور صاحبِ حال اپنے مقام سے ترقی کرتا رہتا ہے۔"

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۰۱)

اُوپر کی عبارت سے ظاہر ہے کہ صوفیہ لفظ 'حال' کا استعمال صوفی کی ایک خاص کیفیت کے لئے کرتے ہیں۔یہ وہ کیفیت ہے جو سالک کے دل پر طاری ہوتی ہے۔جس طرح انسان خوشی اور غم، سکون اور بے قراری جیسی کیفیات کا احساس کرتا ہے اسی طرح سالک 'حال' جیسی کیفیت کو بھی محسوس کرتا ہے۔مگر احوال یکساں نہیں ہوتے بلکہ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔جس آدمی ہمیشہ خوش نہیں ہوتا، ہمیشہ غمگین نہیں ہوتا، ہمیشہ پرسکون نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمیشہ بے قرار ہوتا ہے اسی طرح صوفی کے احوال بھی لمحہ لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔اسے حال کہا بھی اسی لئے جاتا ہے کہ اس میں بدلاؤ آتا رہتا ہے، متغیر ہوتا رہتا ہے۔یہ اگر نہ بدلتا تو حال نہ ہوتا۔جس طرح سایہ کبھی چھوٹا اور کبھی بڑا ہوتا ہے اسی طرح صوفی کا 'حال' بھی بدلتا رہتا ہے۔صوفیہ کی نظر میں 'حال' ایسی کیفیت کا نام ہے جس کے بیان کرنے سے زبان قاصر ہے اور احوال گویا ہیں۔

"مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ،الحال سکوت اللسان فی فنون البیان صاحبِ حال کی زبان اپنے حال بیان کرنے سے ساکت رہتی ہے اور اس کا معاملہ اس کے حال کے تحقق واثبات میں گویا ہوتا ہے۔"

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۳۳)

'حال' ایسی کیفیت ہے جو زبان سے بیان کے لائق نہیں یا جسے بیان کے لئے الفاظ ہی نہیں بنائے گئے مگر جس پر یہ حال طاری ہوتا ہے اس کی کیفیت کو دیکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔یہ کیفیت اللہ کی طرف سے بندے پر وارد ہوتی ہے۔اس کا حامل صرف سالک ہوتا ہے۔داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں حضرت ابوعلی قاری علیہ الرحمہ کا قول نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"دنیا وآخرت میں خوشی وغم وقت کا نصیبہ ہے اور حال ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ

حال ایسی کیفیت ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے بندے پر وارد ہوتی ہے اور جب اس کا ورود ہوتا ہے تو دل سے سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا حال تھا وہ صاحبِ وقت تھے۔ ایک وقت میں تو بحالتِ فراق آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور دوسرے وقت میں بحالتِ وصال بینائی لوٹ آئی۔ کبھی گریہ وزاری سے ایسے ضعیف و ناتوں ہوئے کہ بال سے زیادہ باریک ہو گئے اور کبھی وصال سے تندرست و توانا بن گئے۔ کبھی خوفزدہ ہوئے اور کبھی مسرت و خوشی پائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحبِ حال تھے وہ نہ فراق سے مغموم ہوتے اور نہ وصال سے مسرور۔ چاند، ستارے اور سورج ان کے حال کی مدد کرتے تھے اور خود ہر چیز کے دیکھنے سے فارغ تھے۔ جو نظر آتا اس میں حق تعالیٰ کا جلوہ ہی نظر آتا تھا۔ فرماتے تھے لا احب الآفلین میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (ایضا)

حال کی کیفیت مختلف ہوتی ہے، جیسے کہ احساسات وجذبات بدلتے رہتے ہیں، اسی طرح 'حال' کی کیفیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ وہ یکساں کبھی نہیں رہتا۔ اصل میں صوفی کے لئے محبوب کا دیدار سب سے اہم ہے۔ وہ اگر دیدار کی کیفیت میں ہو تو یہ اس کا حال ہے اور اگر وہ اس کیفیت سے باہر ہو تو یہ حالت اس کے لئے بے حد مشکل ہے۔ شیخ علی ہجویری علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''صاحبِ وقت کے لئے کبھی سارا جہاں دوزخ ہو جاتا ہے جبکہ مشاہدے میں غیبت ہو جاتی ہے اور دل سے محبوب کا روپوش ہو جانا موجبِ وحشت بن جاتا ہے اور کبھی اس کا دل خوشی اور مسرت میں پھولا نہیں سماتا اور سارا جہاں مانندِ جہالت بن جاتا ہے۔ نعمتوں میں ہر آن وہ حق کا مشاہدہ کرتا ہے اور وہ نعمت اس کے لئے تحفہ اور بشارت بن جاتی ہے۔ پھر یہ کہ صاحبِ حال کے لئے حجاب ہو یا کشف ہو، نعمت ہو یا بلا سب یکساں ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہر

مقام میں صاحبِ حال ہوتا ہے۔"

(کشف المحجوب، صفحہ ۵۳۳۔۵۳۴)

'حال' کی دلیل صوفیہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے لاتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ 'حال' کی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ بھی رہتے تھے۔اس سلسلے میں حضرت ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد شیخ ابوعلی دقاق علیہ الرحمہ کا قول نقل کیا ہے:

"آنحضرت ﷺ اپنے احوال میں ہر وقت بلند تر ہوتے جاتے تھے، لہٰذا جب آپ ایک حال سے بلند ہوکر دوسرے حال میں جاتے تو بسا اوقات آپ کی نگاہ پہلی حالت پر پڑ جاتی تو ان کو ایسا معلوم ہوتا کہ بعد کی حالت پہلی حالت کے لئے بادل کا کام کرتی ہے۔آنحضرت ﷺ کے احوال متواتر ترقی پر تھے اور اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کی انتہا نہیں۔"

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۰۲)

'حال' ایک صوفی کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں۔وہ اس کا انتظار کرتا ہے اور یہ اس کا مطلوب بھی ہوتا ہے۔جیسا کہ اوپر بتایا گیا احوال میں بدلاؤ ہوتا رہتا ہے مگر بعض صوفیہ کا یہ ماننا ہے کہ حال دائم اور قائم بھی ہوسکتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ حال جب تک دائم نہ ہو وہ حال ہی نہیں۔بدلنے والی کیفیات کو 'لوائح' اور 'بوادہ' کہنا چاہیے۔

"ابوعثمان حیری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں، مجھے چالیس سال گزر گئے ہیں، جس حال میں اللہ تعالیٰ نے مجھے رکھا ہے، میں خوش ہوں، میں نے اسے برا محسوس نہیں کیا۔ان کی مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حالتِ رضا میں رہے اور رضا بھی احوال میں سے ہے۔"

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۰۱)

حضرت ابوعثمان حیری رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ اس جانب ہے کہ وہ قائم حال میں رہے ہیں۔صوفیہ کی ایک چھوٹی سی جماعت ہی حال کے قائم رہنے کی قائل ہے۔بیشتر اہل تصوف سمجھتے

ہیں کہ حال بدلنے والی کیفیت ہے۔صوفیہ مختلف احوال کے مختلف نام لیتے ہیں۔

مقام:

لفظِ مقام کا لغوی مطلب تو جگہ ہے مگر صوفیہ کی اصطلاح میں اس کا الگ ہی مطلب لیا جاتا ہے۔'مقام' کی تشریح میں حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''طالب کا صدقِ نیت اور ریاضت و مجاہدے کے ساتھ حق تعالیٰ کے حقوق کو ادا کرنے پر قائم رہنے کا نام 'مقام' ہے۔ ہر ارادہ حق والے کا ایک مقام ہوتا ہے، جو بوقتِ طلب، بارگاہِ حق سے ابتدا میں اس کے حصول کا موجب بنتا ہے۔ جب بھی طالب کسی مقام کو عبور کرے گا اور پچھلے مقام کو چھوڑے گا تو وہ لازمی کسی ایک مقام پر قائم ہوگا۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۳۴)

اب اسی 'مقام' کی تشریح میں شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مقام، آدابِ صوفیہ کی اس منزل کو کہتے ہیں، جسے بندہ خدا کی طرف سے حاصل کرتا ہے۔ جہاں تک بندہ کسی قسم کے تصرف سے پہنچتا ہے یا تلاش اور تکلیف کر کے اسے حاصل کرتا ہے، لہٰذا ہر شخص کا 'مقام' وہ ہے جہاں اس وقت اس کا قیام ہے۔ کسی شخص کا ایک مقام پر اترنا صرف اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے، جب اس کو یقینی مشاہدہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے تاکہ اس کے مقام و حالت کی بنا صحیح قاعدہ پر ہو۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۰۰)

ان عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سالک کو راہ سلوک طے کرتے ہوئے جن مقامات سے گزرنا پڑتا ہے انھیں کو مقام کہتے ہیں۔ وہ جس جگہ ہوتا ہے وہ اس کا مقام ہے۔ صوفیہ انبیاء کو بھی ان مقامات کا حامل بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انبیاء کے بھی مقامات مختص ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا مقام توبہ تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کا مقام زہد تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام

کا مقام تسلیم ورضا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام انابت تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کا مقام حزن وملال تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام امید ورجا تھا، حضرت یحیٰ کا مقام خوف وخشیت تھا اور سید عالم ﷺ کا مقام ذکر تھا۔ یہ وہ مقامات ہیں جن کا ذکر صوفیہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

تمکین:

لفظِ 'تمکین' کا استعمال حضرات صوفیہ مقام کے معنی میں ہی کرتے ہیں۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ مقام بدلتا رہتا ہے مگر تمکین نہیں بدلتا۔ 'تمکین' راہِ سلوک کا ایک مستقل مقام ہے۔ یہ سب سے اعلیٰ مقام ہے جو سب سے اخیر میں آتا ہے۔ دوسرے مقامات سے گزرنا ممکن ہوتا ہے مگر یہاں سے گزر ممکن نہیں۔ داتا صاحب لکھتے ہیں:

> "محققین کا درجۂ کمال کے اعلیٰ منزل میں اقامت گزیں ہونے کا نام تمکین ہے۔ لہٰذا صاحبانِ مقامات کے لئے مقامات سے گزر جانا ممکن ہے، لیکن درجۂ تمکین سے گزر جانا محال ہے۔ اس لئے کہ مقام مبتدیوں کا درجہ ہے، تمکین منتہیوں کی اقامت گاہ ہے۔ ابتدا سے انتہا کی طرف جانا تو ہے لیکن انتہا سے گزر جانے کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ مقامات منزلوں کی راہیں ہیں اور 'تمکین' بارگاہ قدس میں برقرار ہونا ہے۔"

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۳۵)

اسے یوں سمجھنا آسان ہے کہ 'مقام' راستہ ہے اور 'تمکین' منزل ہے۔ جب منزل تک رسائی ہوگئی تو پھر اب سفر کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ تمکین کی منزل تک پہنچنے والا بارگاہ خداوندی تک رائی حاصل کرنے والا ہوتا ہے۔ منزل تک پہنچ کر قرار پانا فطری امر ہے۔ اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے کہ پانی جب تک ندی، نالے میں ہوتا ہے بہتا رہتا ہے اور جب سمندر میں پہنچ جاتا ہے تو قرار پالیتا ہے۔ متمکن کی مثال سمندر کے پانی کی ہے۔ وہ اپنی منزل تک پہنچ چکا ہے اب اسے بہنے کی کوئی ضرورت نہیں اور 'مقام' والے کی مثال بہتے پانی کی ہے اسے چل کر

سمندر تک پہنچنا ہے۔

قبض و بسط :

تصوف راہِ معرفت کا نام ہے۔اس راہ پر چلنے والوں کا مقصد اللہ کی بارگاہ تک رسائی اور محبوب حقیقی کا دیدار ہے۔اس راہ میں انسان کی مادیت پردہ بن کر حائل ہو جاتی ہے۔صوفی عبادت و ریاضت کے ذریعے اسی پردے کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔صوفیاء کی اصطلاح میں 'قبض' اور بسط دل پر چھانے والی خاص کیفیات کا نام ہے۔ان الفاظ کی تشریح حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں یوں ہے:

> ''قبض، اس حالت کا نام ہے جو بحالتِ حجاب دل پر چھائے اور بسط اس کیفیت کا نام ہے جس کو دل پر چھائے ہوئے حجاب کا ارتفاع کہتے ہیں۔یہ دونوں حق ہیں ان میں بندے کا اختیار نہیں ہے۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۳۹)

اہلِ تصوف ان کیفیات سے بچنا چاہتے ہیں۔وہ اسے پسند نہیں کرتے۔شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''اہلِ تحقیق نے قبض کو ان امور میں شمار کیا ہے جن سے وہ پناہ مانگتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں حالتیں اوپر کی حالت کے مقابلے میں بندے کی تباہی کا سبب ہوتی ہیں اور صوفی کا اس میں پڑنا درحقیقت محتاجی اور موجبِ ضرر ہے۔''

ہیبت و انس:

جمال اور جلال دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔وہ اپنے بندوں کے ساتھ کبھی جلال کا برتاؤ فرماتا ہے تو کبھی جمال کا۔ہیبت و انس کا بھی اللہ کی انھیں دونوں صفات سے تعلق ہے۔ان صوفیانہ اصطلاحات کی تشریح میں حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''ہیبت و انس، سالکانِ راہِ حق کے دو حال کا نام ہے۔جب حق تعالیٰ بندے

کے دل پر مشاہدۂ جلال سے تجلی فرماتا ہے تو اس وقت اس کے دل پر ہیبت
طاری ہو جاتی ہے، پھر مشاہدۂ جمال سے تجلی فرماتا ہے تو اس کے دل پر محبت
وانس کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اہلِ محبت اس کے جلال سے حیرت
زدہ اور اہلِ انس و محبت اس کے جمال سے خوشی میں مگن ہو جاتے ہیں۔"

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۴۱)

وجد، وجود اور تواجد:

دنیا کی ہر چیز اپنے خالق کے وجود کا پتہ دیتی ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے پیدا کرنے والے کے ہونے کی خبر دیتا ہے۔ زمین سے اُگنے والا ہر پودا ایک ایسی طاقت کے متعلق بتاتا ہے جو انتہائی خاموشی کے ساتھ دنیا کے نظام کو چلا رہی ہے۔ انسان اگر غور کرے تو اس ان دیکھی قوت کا احساس ہوتا ہے، لیکن اگر گہرائی کے ساتھ غور وفکر کرے تو اس کی روحانی کیفیت میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار جنگل میں ایک مور کو دیکھا تو بے خود ہو گئے اور اسی عالم میں جنگل میں گم ہو گئے۔ نہ جانے یہ حالت کب تک رہی، لوگ ڈھونڈتے رہے مگر وہ مل نہیں پائے۔ کئی سال بعد دوبارہ لوگوں نے انھیں راجگیر (بہار) میں دیکھا۔ اللہ کی کسی مخلوق کو دیکھ کر خالق کی قدرت کا احساس ہونا اور انتہائی شدید احساس ہونا صرف صوفیہ کا حصہ ہے۔ یوں تو ہر لمحے ہم اس کی مخلوقات کو دیکھتے ہیں مگر کبھی بھی انھیں دیکھ کر خالق کی قدرت میں غور نہیں کرتے مگر جو لوگ ہر لمحے اس کی قدرت میں غور وفکر کرتے ہیں وہی ایک مور کو دیکھ کر بے خود ہو سکتے ہیں۔ ایسی کیفیت صوفیہ پر طاری ہوتی رہی ہے جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ اللہ کی قدرت اور اس کی صفات کے اظہار کے شدید احساس کے سبب ہوتا ہے۔ کئی صحابہ اور بزرگوں کے بارے میں کتابوں میں ملتا ہے کہ قرآن کی تلاوت سن کر وہ بے خود ہو جاتے یا بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ کئی بار صوفیہ اشعار سن کر بے خود ہو جایا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کتابوں میں ملتا ہے کہ ان

کے سامنے قوالوں نے ایک شعر پڑھا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را

ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

یہ سنتے ہی ان پر بے خودی اور سرشاری کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں کئی روز تک رہے اور قوال مسلسل یہی شعر پڑھتے رہے یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا ۔ بے خودی کی اسی کیفیت کو صوفیہ کی اصطلاح میں 'وجد' کہا جاتا ہے۔ یہ حالت غیر دانستہ طور پر طاری ہوتی ہے۔ اس میں صوفی کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی یہ حالت اپنی مرضی سے طاری کرے تو اسے 'وجد' نہیں 'تواجد' کہیں گے۔ لیکن اگر 'وجد' اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور بشریت فنا ہو جائے تو 'وجود' کہلاتا ہے۔ صوفیہ اسے حلاوتِ معاملات کا ثمرہ اور عنایتِ ربانی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ ماہرینِ تصوف نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''وجد، ایک باطنی کیفیت ہے جو طالب ومطلوب کے درمیان ہوتی ہے، کیونکہ کشف میں باطنی حالت کا بیان اور اس کے وجود کی کیفیت وکمیت کا نشان واشارہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ مشاہدہ یک گونہ خوشی ہے اور خوشی طلب سے حاصل نہیں ہوتی ہے اور وجود ایک طلب ہے جو محبوب سے محبّ کو ملتی ہے، اور اس کی حقیقت کا اظہار واشارہ ناممکن ہے۔ میرے نزدیک وجد، دل کو غم والم پہنچنے کا نام ہے خواہ وہ خوشی سے ہو یا غم سے، تکلیف سے ہو یا راحت سے اور وجود، دلی غم کا آلہ ہے۔ اس سے مراد سچی محبت ہے۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۸۵)

اس بارے میں حضرت شیخ ابو القاسم عبد الکریم قشیری کا کہنا ہے کہ:

''تواجد، وجد کی ابتدائی حالت ہوتی ہے۔ اس کے بعد وجد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور وجد یہ ہے کہ کیفیت تمہارے دل پر طاری ہو اور بغیر ارادہ

اور تکلف کے وارد ہو۔اسی لئے مشائخ فرماتے ہیں 'وجد' وہ کیفیت ہے جو اتفاقاً طاری ہو اور یہ کیفیت اوراد کا پھل ہے لہٰذا جس کے وظائف زیادہ ہوں گے اللہ کی عنایات بھی اسی پر زیادہ ہونگی۔'' (رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۰۸)

حضرت ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ 'وجود' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اب رہا 'وجود' سو یہ وجد سے ترقی کر جانے کے بعد حاصل ہوتا ہے، اور جب تک بشریت فنا نہیں ہوتی 'وجود حق' بھی حاصل نہیں ہوتا۔''

(ایضاً)

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

''مختصر یہ کہ 'تواجد' ابتدا ہے اور 'وجود' انتہا اور وجدان دونوں کے درمیان کی کیفیت کا نام ہے۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۰۹)

سماع کا رواج صوفیہ کی محفلوں میں رہا ہے اور سماع کے دوران وجد آنا ان محفلوں کی روایت رہی ہے۔وجد کے متعلق صوفیہ کے تذکروں میں بہت کچھ ملتا ہے۔اسی طرح تواجد یعنی کوشش کر کے وجد لانے کے متعلق بھی ذکر ملتا ہے۔کشف المحجوب اور رسالہ قشیریہ میں بھی صوفیہ کی محفلوں کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

''ابومحمد جریری کا قصہ مشہور ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا اور اس وقت ابن مسروق رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ایک قوال گا رہا تھا۔ابنِ مسروق اور دوسرے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، مگر جنید رحمۃ اللہ علیہ میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔میں نے عرض کیا، جناب کیا آپ کو سماع سے لطف حاصل نہیں ہوتا؟ تو فرمایا وتری الجبال تحسبہا جامدۃ وھی تمر مر السحاب (تو پہاڑوں کو دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ ساکن ہیں حالانکہ بادل کی طرح یہ بھی چل رہے ہیں۔) پھر فرمایا

اے !ابو محمد کیا تجھے بھی سماع سے لطف نہیں آتا؟ میں نے عرض کیا۔ جب میں کسی ایسی جگہ جاؤں جہاں مجلس سماع قائم ہو اور کوئی قابلِ تعظیم ہستی ہو تو میں اپنے آپ کو وجد سے روک لیتا ہوں اور جب میں خلوت میں ہوتا ہوں تو وجد کو چھوڑ دیتا ہوں اور تکلفاً وجد کی حالت پیدا کر لیتا ہوں۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ ۲۰۸۔۲۰۷)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل تصوف میں وجد اور تواجد دونوں کا رواج رہا ہے۔ محفلِ سماع میں کبھی ان پر خود بہ خود وجد طاری ہوتا تھا تو کبھی وہ بہ تکلف طاری کرتے تھے۔ صوفیہ کا یہ ماننا تھا کہ اگر وجد طاری کر لیا جائے تو وہ آگے بڑھ کر فطری وجد بھی بن جاتا ہے۔

جمع اور فرق:

صوفیہ کے کلام میں جمع اور فرق کی اصطلاحیں بھی اکثر استعمال ہوتی ہیں۔ جس چیز کا تعلق انسان کے کسب سے ہو اسے صوفیہ کی اصطلاح میں فرق کہتے ہیں اور جن امور کا تعلق انسان کی کسب سے نہ ہو بلکہ اللہ کی عطا سے ہو اسے جمع کہتے ہیں۔ رسالہ قشیریہ میں یوں ہے:

''استاد ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے، جس چیز کی نسبت تمہاری طرف ہے وہ فرق ہے اور جو چیز تم سے چھین لی جائے وہ جمع ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ہر بات جس کا تعلق انسان کے کسب و کوشش سے ہے وہ 'فرق' ہے مثلاً بندگی اور ان اعمال کو قائم رکھنا جو بشریت کے حالات کے مناسب ہیں اور جو امور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں مثلاً معانی کا اظہار اور دیگر لطف و احسان وہ جمع کہلاتے ہیں۔ جمع اور فرق کے اعتبار سے یہ حالت صوفیہ کی ادنیٰ حالت خیال کی جاتی ہے، اس لئے اس میں افعال کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔''

(صفحہ-۲۱۱)

'جمع' کے بعد 'جمع الجمع' بھی صوفیہ کی اصطلاح کا حصہ ہے۔اس کا مطلب ہے فناءِ کلی اور غلبۂ حقیقت کے وقت ماسوا اللہ کے ہر قسم کا احساس ختم ہو جائے۔اسی طرح 'فرق' کے بعد 'فرق ثانی' بھی آتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے وقت صوفی حالتِ صحو میں آجائے تا کہ اپنے فرائض ادا کر سکے۔یہ مقام کمیاب ہے۔

فنا اور بقا:

'فنا' اور 'بقا' دو ایسی صوفیانہ اصطلاحیں ہیں ،جن کا اہلِ تصوف خوب استعمال کرتے ہیں۔اصل میں آدمی خوبیوں اور خرابیوں کا پیکر ہوتا ہے۔اچھائیاں اور برائیاں اس کی فطرت میں شامل ہوتی ہیں۔اگر وہ ان خرابیوں اور بری عادتوں کو خود سے جدا کردے تو اسے فنا کہتے ہیں۔اسی طرح وہ اچھی صفات کا جامع بن جائے یعنی خوبیوں کے ساتھ باقی رہے اسے 'بقا' کہا جاتا ہے۔امام ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''صوفیاء کے یہاں 'فنا' سے مراد مذموم اوصاف کا ساقط ہونا ہے اور 'بقا' سے اوصافِ محمودہ کا بندہ کے ساتھ قائم ہونا ہے۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۱۴)

انسان میں اگر خرابیاں نہ ہوں تو یقیناً اچھائیاں باقی رہیں گی ،اسی طرح اگر اس میں اچھائیاں نہ ہوں تو خرابیاں باقی رہیں گی۔'فنا' اوصافِ مذمومہ کے فنا کا نام ہے،اگر یہ اوصاف ختم ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ اوصافِ حمیدہ ہی باقی رہیں گی اور یہی 'بقا' ہے۔رسالہ قشیریہ کی درج ذیل عبارت سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

''جس نے کوشش کر کے اپنے اخلاق کو ٹھیک کرلیا اور اپنے دل سے حسد ،کینہ بخل ،غصہ ،تکبر اور اسی قسم کی دیگر رعونتوں کو دور کر دیا تو اس کے متعلق یوں کہا جائے گا کہ فلاں اپنے اخلاقِ بد سے فنا ہو گیا اور جب وہ اخلاقِ بد سے فنا ہو گیا تو وہ فتوت اور صدق کے ساتھ باقی رہے گا اور جس نے احکام

کے ردوبدل ہونے میں اللہ کی قدرت کے جاری ہونے کا مشاہدہ کیا اس
کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ حوادثات کو مخلوق کی طرف سے خیال کرنے سے
فنا ہو گیا اور جب وہ ان آثار کو غیر اللہ کی طرف سے سمجھنے سے فنا ہو گیا تو وہ
اللہ کی صفات کے ساتھ باقی رہا۔"

(صفحہ-۲۱۵)

انسان اپنے اعمال، اوصاف اور اخلاق یا احوال سے موصوف ہوتا ہے اگر اس کی ذات
ان کی خرابیوں سے پاک ہو جائے تو وہ برے اعمال، افعال اور اخلاق سے فنا ہو جائے گا اور اچھے
اعمال و اوصاف اور اخلاق کے ساتھ باقی رہے گا۔

حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے فنا اور بقا کے سلسلے میں کچھ بزرگوں کے بیانا
درج کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، فنا یہ ہے کہ بندہ اپنی بندگی
کی دید سے فانی ہو اور بقا یہ کہ بندہ مشاہدۂ الٰہی سے باقی ہو۔"

"حضرت یعقوب نہر جوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بندگی کی صحت و درستگی
فنا و بقا میں ہے۔"

(کشف المحجوب، صفحہ-۳۵۸)

شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں خود اپنی رائے بھی رکھتے ہیں جو یوں ہے۔

"جو اپنی مراد سے فانی ہو گیا وہ مرادِ حق سے باقی ہو گیا۔ اس لئے کہ بندے
کی مراد فانی ہے اور حق تعالیٰ کی مراد باقی ہے۔ جب تم اپنی مراد سے وابستہ
ہو گئے تو تمہاری مراد فانی ہوگی اور فنا کے ساتھ اس کا قیام ہوگا۔ پھر جب حق
تعالیٰ کی مراد سے متصف ہو گے تو حق کی مراد کے ساتھ باقی ہو گے، اور بقا
کے ساتھ باقی ہو گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جو چیز آگ کے غلبہ میں
ہوگی اس کے غلبہ کی وجہ سے اس میں بھی وہی صفت پیدا ہو جائے

گی، جو آگ کی ہے۔ تو جب آگ کا غلبہ اس چیز کی صفت کو دوسری صفت
کے ساتھ بدل دیتا ہے تو حق تعالیٰ کا غلبہ آگ کے غلبہ سے بدرجہ اولیٰ بہتر
ہے، لیکن آگ کا یہ تصرف لوہے کی صفت میں ہے نہ کہ لوہے کی ذات
میں۔ کیونکہ لوہا ہرگز آگ نہیں بن جاتا۔"

(کشف المحجوب، صفحہ ۳۵۷۔۳۵۸)

فنا اور بقا کی بحث بہت لمبی ہے اور اس مضمون کو سمجھانے کی صوفیہ نے اپنے اپنے ڈھنگ اور اپنے اپنے انداز میں کوشش کی ہے۔ تصوف کے عام قاری کے لئے یہ بحث کئی بار الجھنیں پیدا کرتی ہے تو کئی نئے مباحث کے دروازے بھی کھولتی ہے۔ جس دور میں صوفیانہ اصطلاحوں کا استعمال ہو رہا تھا اور ان پر بحثیں جاری تھیں اس زمانے میں منطق وفلسفہ کا دور دورہ تھا لہٰذا کئی جگہ فلسفیانہ بحثیں بھی اس خالص صوفیانہ موضوع میں شامل نظر آتی ہیں۔ البتہ جن بزرگوں نے خود فنا اور بقا کا تجربہ کیا انھوں نے اسے اپنے تجربے سے اس موضوع کو سمجھا۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیرومرشد خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھے ایک خط میں اپنے اس تجربے کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو:

"جو علوم کہ فنافی اللہ اور بقا باللہ سے تعلق رکھتے ہیں، حق تعالیٰ نے اپنی
عنایت سے ظاہر فرمادیئے ہیں اور اسی طرح خادم نے معلوم کرلیا ہے کہ ہر
چیز کی وجہِ خالص کیا ہے اور سیر فی اللہ کے کیا معنیٰ ہیں اور تجلّی ذاتی برقی کیا
ہوتی ہے اور محمدی مشرب کون ہے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔"

(مکتوباتِ حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب-۱۲)

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خط کی عبارت سے ان کے تجربۂ فنا و بقا کا پتہ چلتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے دیگر روحانی تجربوں کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ تصوف تو ایک تجرباتی کیفیت کا ہی نام ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ فنا اور بقا کا مفہوم مکمل طور پر سمجھنے کے لئے اس تجربے سے گزرنا ضروری ہے۔ فارسی کا ایک مشہور مقولہ ہے، شنیدہ کے بود مانند دیدہ' یعنی سنا ہوا کب ہوتا ہے

دیکھے ہوئے کے برابر؟ ظاہر ہے کہ جس نے دیکھا اس نے حق الیقین حاصل کرلیا۔ اپنے ایسے ہی ایک تجربے کے بارے میں مجدد الف ثانی ایک خط میں اپنے مرشد کو لکھتے ہیں:

> ''جب سے اس خاکسار کو صحو میں لائے ہیں اور بقا عطا فرمائی ہے، عجیب و غریب علوم و معارف جو پہلے متعارف نہیں تھے، پے در پے و مسلسل فائض و وارد ہو رہے ہیں، ان میں سے اکثر قوم یعنی صوفیاء کرام کے قول اور ان کی مروجہ و مستعمل اصطلاح کے ساتھ موافقت نہیں رکھتے۔ مسئلہ وحدت الوجود اور اس کے متعلقات کی نسبت جو کچھ ان حضرات نے بیان کیا ہے اس خاکسار کو اس حال سے ابتدا میں ہی مشرف کر دیا گیا اور کثرت میں وحدت کا مشاہدہ حاصل ہوا۔ پھر اس مقام سے کئی درجے اوپر لے گئے اور اس ضمن میں کئی قسم کے علوم کا افادہ نصیب ہوا۔''

(مکتوبات مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب-۸)

سچ ہے کسی بات کے سننے اور دیکھنے و تجربہ کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو باتیں تحریر کی ہیں وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر کی ہیں۔ ہم جو کچھ لکھ پڑھ رہے ہیں وہ صوفیہ کی کہی ہوئی باتوں کو دہرا رہے ہیں۔

غَیبت اور حضور:

صوفی کی تمام جدوجہد کا حاصل خود کو گم کرنا ہوتا ہے۔ ذات الٰہی اس کا مقصود ہے اور اسکی اطاعت و فرمانبرداری اس کا شیوہ۔ یہاں اپنے آپ کو گم کر دینے والا ہی گوہرِ مقصود کو پاتا ہے۔ جو اپنے آپ کو دنیا اور اس کی ہما ہمی سے غائب کر دے وہی بارگاہ خداوندی میں حضور حاصل کر پاتا ہے۔ یہ گمشدگی ہی 'غَیبت' کہلاتی ہے اور اس کا نتیجہ 'حضور' کہلاتا ہے۔

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

غَیبت اور حضور معروف صوفیانہ اصطلاحیں ہیں۔اس پر صوفیہ نے بہت طویل بحثیں کی ہیں۔اسکی تعریف میں حضرت ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ یوں کرتے ہیں:

''غیبت یہ ہے کہ دل مخلوق کے حالات سے بے خبر ہو کیونکہ اس کا خاسہ اس کیفیت کے ساتھ مشغول ہے جو اس پر وارد ہوتی ہے۔پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات اور دیگر امور کے احساس سے غافل ہو جاتا ہے اور اس کا سبب بھی وہ کیفیت ہے جو اس پر وارد ہوتی ہے، مثلاً ثواب کو یاد کرنا یا عتاب کے متعلق سوچنا۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۱۷)

اس سلسلے میں شیخ علی ہجویری (داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ) تحریر فرماتے ہیں:

''غیبت اور حضور ایسی دو عبارتیں اور کلمے ہیں جو مقصود کے عین مفہوم کو بیان کرتے ہیں، عکس و سایہ کی مانند ہیں۔یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی ضد ہیں، جو اربابِ زبان اور اہلِ معانی کے درمیان بکثرت مستعمل ہیں۔لہذا حضور سے مراد وہ حضورِ قلب ہے جو یقینی ولایت کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس کے لئے غیبی حکم، عینی حکم کی مانند ہو جائے۔اور غیب سے مراد، ماسوااللہ سے دل غائب ہونا ہے۔یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے بھی غائب ہو کر اپنی غیبت سے بھی غائب ہو جائے اور اپنی غیبت کو بھی خود نہ دیکھ سکے۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۳۶۲)

صوفیہ کے یہاں غیبت کا عام قاعدہ رہا ہے۔ان کے تذکروں میں اس قسم کی باتیں بہت زیادہ ملتی ہیں۔ہر طبقے کے صوفیہ میں اس قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ایک ایسا ہی واقعہ بہت سی کتابوں میں ملتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمہ کی زیارت کے ارادے سے گیا۔جب دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی تو

اندر سے بایزید بسطامی نے پوچھا کون اور کیا کام ہے؟ مرید نے جواب دیا حضرت بایزید بسطامی کی ملاقات کو آیا ہوں۔ اندر سے بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کون بایزید؟ کہاں ہے؟ میں مدت سے تلاش کررہا ہوں نہیں ملتا۔ ملے تو مجھ سے بھی ملوانا۔ اس واقعے کو جب مرید نے آ کر حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے عرض کیا تو انھوں نے فرمایا 'میرا بھائی بایزید تو خدا کی طرف جانے والوں میں جاملا۔'

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے کہ ان کے پاس آ کر ایک شخص نے عرض کیا آپ تھوڑی دیر میرے پاس رک جایئے، آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے فرمایا میں خود بھی بہت دن سے یہی چاہتا ہوں کہ اپنے پاس رک جاؤں اور خود سے کچھ باتیں کرلوں مگر اب تک نہیں کر پایا کیونکہ میں خود میں بھی موجود نہیں ہوں۔ اب جو کام میں اپنا نہیں کر پایا وہ تمہارا کیسے کرسکتا ہوں؟

صوفیہ اس قسم کی کیفیات سے اکثر دوچار ہوتے رہے ہیں۔ یہی کیفیات غیبت اور حضوری کی ہیں۔ جب صوفی دنیا سے غائب ہوتا ہے تو اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھ پر ایسا زمانہ بھی گزرا ہے تمام تمام زمین وآسمان والے میری پریشانی پر روتے تھے۔ پھر ایسا زمانہ بھی آیا ہے کہ میں ان کی غیبت پر روتا تھا اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ مجھے نہ اپنی خبر ہے نہ زمین وآسمان کی۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۳۶۶)

اہلِ تصوف اپنی اس حالت کے لئے رسول اکرم ﷺ کی حالت سے دلیل لاتے ہیں۔ وہ اس کے لئے ایک واقعے کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت عائشہ رسول اکرم ﷺ کے حجرے کے دروازے پر حاضر ہوئیں اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کون؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ میں عائشہ!

آپ نے پوچھا کون عائشہ؟ حضرت عائشہ نے عرض کیا ابوبکر کی بیٹی عائشہ۔ اللہ کے رسول نے پھر اندر سے پوچھا کون ابوبکر؟ تو حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ انھیں خوف محسوس ہونے لگا۔

صوفیہ کا ماننا ہے کہ یہی کیفیت غیبت اور حضور کی ہوتی ہے۔ یعنی یہ وہ حالت ہوتی ہے جب بندہ دنیا سے غائب ہو کر بارگاہ خداوندی میں روحانی طور پر حاضر ہوتا ہے۔ حضرت ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"کبھی صوفی حق کے حضور میں ہوتا ہے کیونکہ جب مخلوق سے غائب رہتا ہے تو حق کے حضور میں ہوتا ہے۔ اس طرح گویا وہ حاضر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ذکر اس کے دل پر غالب ہوتا ہے، لہٰذا وہ اپنے دل کے ذریعے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوتا ہے، چنانچہ جس قدر وہ مخلوق سے غائب ہوتا ہے، اسی قدر وہ حق کے آگے حاضر رہتا ہے۔ اگر مخلوق سے کلیۃً غائب ہوا تو اس کو اسی مناسبت سے حضوری حاصل رہی۔ اگر کوئی کہے کہ فلاں حاضر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دل کے ذریعے اپنے رب کے آگے حاضر ہے۔ اس سے غافل نہیں ہے۔ اسے ہر دم یاد کرتا رہتا ہے پھر اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اللہ کے حضور میں رہتے ہوئے اس کو اس مرتبہ کے مطابق ان معانی کا مکاشفہ ہوتا ہے، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اسے مخصوص کرتا ہے۔"

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۱۹)

غیبت وحضور کی بحث طویل ہونے کے باوجود قابلِ فہم ہے اور صوفیاء کا اس پر زور رہا ہے۔ ان کا مقصود اور مدعا دنیا سے غیبت اور خالق کے حضور حاضری ہے۔ تصوف کی تمام جدوجہد کا حاصل یہی ہے۔

کسی میں جو کوئی فنا ہو گیا
نہ کچھ پوچھ آسی وہ کیا ہو گیا

یہ ساقی نے کیسی پلائی شراب
کہ جو رند تھا پارسا ہوگیا

صحو اور سکر:

غیبت اور حضور کی طرح صحو اور سکر بھی صوفیانہ اصطلاحیں ہیں اور ان کا مفہوم بھی غیبت اور حضور سے بہت قریب ہے۔ ان الفاظ کی تشریح میں شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''احساس سے غیبت کے بعد احساس کی طرف لوٹ آنے کا نام 'صحو' ہے اور کسی قوی کیفیت کے وارد ہونے کی وجہ سے احساسے غائب ہونے کو 'سکر' کہتے ہیں۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۲۰)

صوفیہ سکر اور صحو دونوں کو اللہ کی مرضی پر محمول کرتے ہیں۔ ان میں اختلافات ہیں کہ ان دونوں میں سے افضل کیا ہے۔ بعض صوفیہ سکر کو افضل سمجھتے ہیں تو بعض صحو کو۔ صوفیہ کا ماننا ہے کہ بندہ سکر کی حالت میں حال کا مشاہدہ کرتا ہے اور صحو کی حالت میں علم کا۔ حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ دو بزرگوں کا ایک واقعہ اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

''سرخس میں دو بزرگ رہتے تھے۔ ایک نام لقمان تھا اور دوسرے کا نام ابوالفضل حسن تھا۔ ایک دن لقمان ابوالفضل حسن کے پاس آئے۔ ابوالفضل کے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھ کر کہا کہ اے ابوالفضل! کتاب میں کیا تلاش کررہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا اسے تلاش کررہا ہوں، جسے تم اس کو چھوڑ کے تلاش کررہے ہو۔ لقمان نے کہا یہ خلاف کیوں ہے؟ ابوالفضل نے جواب دیا خلاف تم کررہے ہو اور مجھ سے دریافت کرتے ہو کہ کیا تلاش کررہے ہو؟ لہٰذا مستی سے ہوشیار بنو اور ہوشیاری سے بیدار ہو تا کہ تم سے

خلاف اٹھ جائے اور جان سکو کہ ہم اور تم کسے تلاش کر رہے ہیں۔‘‘

(کشف المحجوب، صفحہ-۲۷۲)

کبھی کبھی منزل مقصود ایک ہوتی ہے مگر دو مسافروں کے راستے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح صوفیہ کے دو طبقات بھی سکر اور صحو کے متعلق سوچتے ہیں۔ کسی کے لئے حالتِ مستی اور خود فراموشی اہم ہے کہ وہ اس حال میں ان حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے جن کا عالمِ ہوش وخرد میں نہیں کرسکتا تو کسی کے لئے حالتِ علم افضل ہے کہ وہ اس حالت میں عبادت وریاضت اور مجاہدے کرسکتا ہے۔

ذوق اور شرب:

قربتِ خداوندی کے جام پینا صوفیہ کی اصطلاحیں ہیں۔ یہ جام کوئی مادی چیز نہیں۔ نہ ہی کوئی کھانے پینے کی چیز ہے۔ یہاں ذوق وشرب سے مراد وصل محبوب کی راحت ہے۔ وصل محبوبِ حقیقی سے جو لطف ملتا ہے اسے اہلِ تصوف ذوق وشرب سے تعبیر کرتے ہیں۔ شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق:

’’اس سے ان کی مراد تجلی کے وہ ثمرات، کشف کے نتائج اور فوری واردات ہیں، جنھیں یہ لوگ پاتے ہیں۔ چنانچہ پہلا درجہ ذوق کا ہے پھر شرب اور پھر ’ری‘ (سیرابی) کا۔‘‘

(رسالہ قشیریہ، صفحہ ۲۲۱-۲۲۲)

محبوب سے ملاقات کا اپنا لطف ہے اور یہ محبوب اگر دنیاوی مخلوقات سے الگ ہو بلکہ تمام محبوبوں اور حسن والوں کا خالق ہو تو اس کے وصال کا لطف فکر واندازہ سے باہر ہے۔ ذوق وشرب میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے جو یقیناً ناقابلِ بیان ہوگی مگر اس کی تعبیر کے لئے ذوق وشرب کے الفاظ متعین کئے گئے ہیں۔ اس کیفیت کی تھوڑی سی تشریح درج ذیل واقعے سے ہوتی ہے۔

’’یحیٰ بن معاذ نے بایزید بسطامی کو خط لکھا۔ یہاں ایک شخص ہے جس نے

ایک بار محبت کا پیالہ پیا پھر اسے پیاس نہیں لگی۔ ابو یزید نے جواب میں لکھا
، مجھے تمہارے ضعفِ حال پر تعجب ہوتا ہے۔ یہاں تو وہ شخص ہے جو دنیا کے
سمندر پی جانے کے بعد بھی منہ کھولے ہوئے ہے اور زیادہ مانگ رہا ہے۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۲۲)

اس طرح کی کیفیات کا صوفیہ کے تذکروں میں اکثر ذکر ملتا ہے مگر عام آدمی اسے کیسے سمجھ سکتا ہے جو خود ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا۔ اس بارے میں بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ تصوف اور روحانیت ایک تجربے کی کیفیت ہے لہٰذا اسے سمجھنے کے لئے خود اس تجربے سے گزرنا ضروری ہے اس کے بغیر اسے سمجھنا بے حد مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

محو اور اثبات:

رسالہ قشیریہ میں محو اور اثبات کا مطلب یوں بیان کیا گیا ہے۔

''عاداتِ بشریہ کے اوصاف کو مٹا دینے کا نام 'محو' ہے اور احکامِ عبادت کے
قائم کرنے کا نام 'اثبات' ہے۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۲۲۳)

یعنی جس شخص نے اپنی عادات اور احوال سے بری صفات کو ختم کر دیا اور اچھی عادات واطوار کا حامل ہو گیا وہ 'محو اور اثبات کا مالک ہو گیا۔ صوفیہ کا ایسا بھی ماننا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عارفین کے دلوں سے غیر اللہ کے ذکر کو مٹاتا ہے اور ان کی زبانوں پر اپنے ذکر کو ثابت کرتا ہے، یہی محو اور اثبات ہے۔ صوفیہ کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں مشاہدۂ نفس سے بالکل محو کردے اور پھر انھیں اپنی حالت پر نہ لوٹائے۔

سِرّ اور تجلّی:

سِرّ کا لفظی ترجمہ بھید یا چھپا ہوا ہونا ہے اور تجلّی کا مطلب روشنی ہے، مگر صوفیہ کی

اصطلاح میں سِرّ کا مطلب انوارِ الٰہیہ کا چھپ جانا اور تجلّی کا مطلب انوارِ خداوندی کا مشاہدہ ہے۔عوام انوارِ الٰہی کے مشاہدے اور اس کے راز سے پردے میں ہیں لہٰذا ان کا تعلق سرّ سے ہے اور صوفیہ کی جماعت روحانی طور پر ان کا مشاہدہ کرتی ہے لہٰذا وہ تجلی میں ہے۔اس سلسلے میں ایک حدیث صوفیہ کے یہاں مشہور ہے کہ اگر، اللہ اپنے چہرے کا انکشاف کرے تو اس کے چہرے کے انوار ہر اس چیز کو جس پر اس کی نگاہ پڑے گی جلا دینگے۔' یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدارِ خداوندی کی تمنا کی تو فرمایا گیا کہ 'تم دیکھ نہیں سکتے۔' اللہ تعالیٰ نے اپنے رازوں پر پردہ ڈال رکھا ہے اگر ان کا انکشاف ہوجائے اور اس کے چھپے ہوئے بھید ظاہر ہوجائیں تو عوام کے لئے دشواریاں کھڑی ہوجائیں۔اس لئے مصلحت بھی اسی میں ہے کہ اس کے رازوں پہ پردہ پڑا رہے مگر انھیں رازوں سے کبھی کبھی خواص کے لئے پردہ اٹھ جاتا ہے۔درمیان کے فاصلے مٹ جاتے ہیں، دوریاں نزدیکیوں میں بدل جاتی ہیں۔

محاضرہ، مکاشفہ، مشاہدہ:

صوفیہ کی خاص اصطلاحوں میں محاضرہ، مکاشفہ اور مشاہدہ کے الفاظ بھی ہیں۔ان الفاظ کی تشریح حضرت ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔ان کی عبارت کا ترجمہ نیچے درج کیا جارہا ہے، جس سے ان الفاظ کا مفہوم پوری طرح سمجھ میں آجائے گا:

> ''محاضرہ، دل کا حاضر ہونا ہے۔یہ حضوری کبھی متواتر برہان کے ذریعے ہوتی ہے جب کہ بندہ ابھی پردے کے پیچھے ہوتا ہے۔خواہ وہ سلطان ذکر کے غلبہ کی وجہ سے حاضر کیوں نہ ہو۔اس کے بعد مکاشفہ آتا ہے۔مکاشفہ یہ ہے کہ صوفی بیان ووضاحت کی صفت کے ساتھ حاضر ہو۔اس حالت میں اسے نہ تو کسی دلیل میں غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ راستہ تلاش کرنے کی، اور نہ ہی شک وشبہات کے اسباب سے اسے پناہ طلب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ مغیبات کو بیان کرنے میں حجاب محسوس کرتا

ہے۔اس کے بعد مشاہدہ ہے۔مشاہدہ حق تعالیٰ کے ساتھ اس طرح حاضر
ہونا ہے کہ صحیح حالات کو بندہ مشاہدہ کرے، ان میں کوئی شک وشبہہ باقی نہ
رہے۔ چنانچہ جب اصرار کا آسمان پردوں کے بادلوں سے صاف ہوتا ہے،
شہودِ مشاہدہ کا سورج برج شرف سے جگمگا اٹھتا ہے۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۲۵)

یہ کیفیات دراصل عارف اور معبود کے درمیان کی ہیں۔اللہ کی طرف سے انوار وتجلیات کی بارش ہوتی ہے، جس سے بندے کے دل کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے۔انوار وتجلیات کا یہ عالم ہی مختلف ہوتا ہے جس کے بارے میں شیخ قشیری نے عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے:

''مشاہدہ میں بغیر اس کے کہ درمیان میں پردہ پڑے یا انقطاع ہو صوفی کے
دل پر انوار و تجلی کا ورود ہوتا ہے بعینہ اسی طرح جس طرح لگاتار بجلیاں
چمکتی ہوں، چنانچہ جس طرح بجلیوں کے متواتر اور لگاتار روشن ہونے سے
تاریک رات دن کی طرح روشن ہو جاتی ہے، اسی طرح صوفی کے دل پر
جب متواتر تجلی ہوتی ہے تو اس کے لئے دن چڑھ آتا ہے اور پھر رات باقی
نہیں رہتی۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۲۶)

اللہ کی کائنات کے بہت سے راز ہیں جو دنیا والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، مگر ان میں سے بہت کچھ اہلِ دل کے مشاہدے میں ہیں۔اللہ کے انوار وتجلیات بھی اس کے ایسے ہی راز ہیں جن کا مشاہدہ عام لوگ نہیں کر سکتے، مگر یہ صوفیہ اور اہلِ عرفان کی نگاہوں میں منکشف ہیں۔محاضرہ، مکاشفہ اور مشاہدہ بھی ایسے ہی رازوں کے انکشاف کے کچھ طریق ہیں۔جن لوگوں نے روحانی تجربے کئے ہیں اور ان مقامات سے گزرے ہیں وہی اس کے بارے میں صحیح طور پر بتا سکتے ہیں۔روحانی ترقی کے اپنے تجربے کو اپنے ایک خط میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ

احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''حضور کا کمترین خادم احمد عرض کرتا ہے کہ جو مقام محدد (عرش) کے اوپر ہے اپنی روح کو عروج کے طریق پر اس مقام میں پاتا تھا اور وہ مقام حضرت خواجۂ بزرگ (خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ) کے ساتھ مخصوص تھا، کچھ زمانہ گزرنے کے بعد اپنے عنصر بدن کو بھی اسی مقام میں پایا اور اس وقت یہ بات خیال میں آئی کہ یہ عالم سارے کا سارا عنصریات اور فلکیات سے نیچے چلا گیا ہے، اور اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔ اور چونکہ اس مقام میں بعض اولیاء کبار کے سوا اور کوئی نہیں تھا، اس وقت تمام عالم کو اپنے ساتھ ایک ہی جگہ اور ایک ہی مقام میں شریک پاکر بہت حیرت حاصل ہوتی ہے، کہ پوری پوری بیگانگی کے باوجود اپنے آپ کو ان کے ساتھ دیکھتا ہے۔ غرض کہ وہ حالت کبھی کبھی حاصل ہوتی تھی، جس میں کہ نہ خود رہتا تھا اور نہ عالم، نہ نظر میں کوئی چیز آتی تھی نہ علم میں۔ اب وہ حالت دائمی ہوگئی ہے، خلقتِ عالم کا وجود دید ودانش سے باہر نکل گیا ہے۔

اس کے بعد اسی مقام میں ایک بلند محل ظاہر ہوا کہ جس کی سیڑھی رکھی ہوئی ہے، میں وہاں پہنچ گیا، وہ محل بھی اس عالم کی طرح دھیرے دھیرے نیچے چلا گیا اور میں ہر گھڑی اپنے آپ کو اس کے اوپر چڑھتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اتفاقاً میں وضو کے شکرانے کی نماز ادا کر رہا تھا کہ ایک بہت ہی بلند مقام ظاہر ہوا اور مشائخ نقشبندیہ قدس اللہ اسرارہم میں سے چار بزرگ مشائخ کو اس مقام میں دیکھا، اور دوسرے مشائخ مثلاً سید الطائفہ (جنید بغدادی علیہ الرحمہ) وغیرہ کو بھی اسی مقام میں پایا اور بعض دوسرے مشائخ اس مقام کے اوپر ہیں، لیکن اس کے پایوں کو پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں اور بعض اپنے درجہ کے مطابق اس مقام کے نیچے تھے اور میں نے اپنے آپ کو اس

مقام سے بہت دور پایا، بلکہ اس مقام کے ساتھ کچھ مناسبت ہی نہیں دیکھی۔اس واقعہ سے بہت بے چین اور بے قرار ہوگیا۔قریب تھا کہ دیوانہ ہوکر نکل جاؤں اور غم وغصے کے باعث اپنے جسم کو جان سے خالی کردوں۔کچھ وقت اسی حالت پر گزرا آخر آنجناب کی بلند توجہات سے اپنے آپ کو اس مقام کے مناسب دیکھا۔اول اپنے سر کو اس کے بالمقابل پایا پھر آہستہ آہستہ جاکر اس مقام کے اوپر بیٹھ گیا۔توجہ کرنے کے بعد دل میں ایسا گزرا کہ وہ مقام تکمیل کا مقام ہے کہ سالکین سلوک مکمل کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچے ہیں۔''

(مکتوباتِ حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب-۷)

اوپر کا اقتباس ذرا طویل ہوگیا مگر اس کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرات صوفیاء کرام اس راستے پر چلتے ہوئے کن کن تجربات سے گزرتے ہیں۔راہ سلوک پر چلنے والوں کے اس قسم کے تجربات ان کی کتابوں، مکتوبات اور ملفوظات میں ملتے ہیں۔انھیں پڑھ کر تصوف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

لوائح، طوالع، لوامع:

راہِ سلوک پر چلنے والے مختلف قسم کے تجربات سے گزرتے ہیں۔ان پر مختلف مراحل میں انوار وتجلیات کی بارشیں ہوتی ہیں۔وہ ان کیفیات کو کئی بار محسوس بھی کرتے ہیں۔یہ انوار وتجلیات کبھی کبھی بہت تیزی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں اور پھر چھپ جاتی ہیں۔انھیں انوار کو لوائح، طوائع اور لوامع کہتے ہیں۔یہ تینوں کیفیات بہت قریب قریب ہیں۔ان میں بہت معمولی فرق ہیں۔اس بارے میں شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''طوالع زیادہ دیر تک قائم رہتے ہیں اور ان کا تسلط بھی زیادہ قوی ہوتا ہے۔یہ تاریکی کو زیادہ دور کرتے ہیں اور تہمت کی زیادہ نفی کرتے ہیں، مگر

ان میں غروب ہونے کا خطرہ ہر وقت لاحق رہتا ہے۔ان کی نہ بلندی زیادہ ہوتی ہے اور نہ زیادہ رہنے والے ہوتے ہیں۔مزید برآں ان کے حاصل کرنے کے اوقات جلد منقطع ہو جاتے ہیں اور ان کے غروب ہونے کے احوال لمبے لمبے دامن پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں۔یہ تمام معانی یعنی لوائح اور طوالع اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔چنانچہ بعض ایسے ہیں کہ گزر جانے کے بعد ان کا نشان تک باقی نہیں رہتا مثلاً شوارق کہ ان کے گزر جانے پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ (کبھی روشنی تھی ہی نہیں) رات ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔بعض کا نشان باقی رہ جاتا ہے اگر ان کا نقشہ زائل ہو جائے تو کم از کم درد باقی رہتا ہے اور انوار غروب ہو جائیں تو ان کے علامات باقی رہتے ہیں، لہٰذا اس حالت کا مالک اس حالت کے غلبہ کے مدھم ہو جانے کے بعد بھی اس کی برکات کی روشنی میں زندہ رہتا ہے اور اس کے دوبارہ آنے تک اس کے وقت کی امید لگی رہتی ہے، اور اس کے لوٹنے کا انتظار رہتا ہے اور وہ اس کیفیت کے ساتھ زندہ رہتا ہے، جو اسے اس کیفیت کے موجود ہونے پر حاصل ہوئی تھی۔"

(رسالہ قشیریہ، صفحہ ۲۲۸۔۲۲۹)

یہ کیفیات لگ بھگ ویسی ہی ہوتی ہیں جیسے کہ سورج، چاند اور ستاروں کا طلوع و غروب ہونا۔شہاب ثاقب کا چمکنا اور آسمان میں کئی قسم کی تبدیلیوں کا رونما ہونا۔

بوادِہ اور ہجوم:

کئی کیفیات انسان کے دل پر طاری ہوتی ہیں۔یہ مختلف حالات کے نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہیں، یہ سب کچھ فطری امور ہیں۔اسی طرح کی ایک خاص کیفیت صوفی کے دل پر گھبراہٹ جیسی طاری ہوتی ہے جسے بوادہ کہتے ہیں۔یہ خوشی کا سبب ہو سکتی ہے اور غم کا بھی۔بوادہ

اور ہجوم کے بارے میں حضرت شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''بوادہ تو وہ کیفیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکا یک بطور گھبراہٹ کے دل پر وارد ہوتی ہے، خواہ خوشی کا سبب بنے یا غم کا۔ اور ہجوم وہ کیفیت ہے جو تمہاری طرف سے تصنع کے بغیر وقت کی قوت کی وجہ سے دل پر وارد ہوتی ہو۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۲۹)

تلوین اور تمکین:

ہر راہی جب تک راستہ میں ہو تو منزل تک پہنچنے کی چاہت میں بے قرار رہتا ہے، لیکن منزل تک رسائی کے بعد اسے چین وسکون مل جاتا ہے۔ اسی طرح جب صوفی راہِ سلوک میں رہتا ہے تو اسے صاحبِ تلوین کہتے ہیں اور جب وہ اپنے مقام تک پہنچ جاتا ہے تو اسے تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تمکین اہلِ حقائق کی صفت ہے۔ صاحب تلوین کے بارے میں صوفیہ کا کہنا ہے کہ وہ لگاتار ترقی کرتا رہتا ہے اور اپنی منزل کی طرف رفتہ رفتہ بڑھتا رہتا ہے اور 'صاحبِ تمکین' کا اپنے مقام تک پہنچنے کے بعد اتصال ہو جاتا ہے۔ شیخ قشیری رحمہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''ایک شخص کا قول ہے کہ طالبِ طریقت کا سفر اس وقت ختم ہوتا ہے، جب وہ اپنی ذات کو پالے اور جب اس نے اپنی ذات کو پالیا تو وہ اپنے مقام پر پہنچ گیا۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۳۰)

سفر طریقت منزل در منزل سفر ہے۔ اس راستے پر چلنے والا دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اس پر عالم بالا کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ ۔۔۔ اگر کسی کو ایک ۔۔۔ ظاہر کر دی جائیں تو ۔۔۔ ان کی تاب نہ لا سکے

اس کے لئے صوفیہ، حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جب مصر کی عورتوں نے زلیخا پر طعن و تشنیع کی کہ وہ ایک ملکہ ہوتے ہوئے ایک غلام پر عاشق ہوگئی تو زلیخا نے انھیں اپنے محل میں بلایا اور ہر ایک عورت کو ایک چھری اور لیموں دے دیا۔ جب یوسف علیہ السلام ان کے سامنے آئے تو زلیخا نے لیموں کاٹنے کو کہا۔ عورتوں نے لیموں کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور انھیں احساس تک نہ ہوا۔ وہ پکار اٹھیں کہ یہ انسان نہیں کوئی مقرب فرشتہ ہے، مگر زلیخا کی حالت ان عورتوں سے مختلف تھی۔ وجہ یہ ہے کہ وہ عورتیں یوسف علیہ السلام کے معاملے میں صاحبِ تلوین تھیں اور زلیخا صاحبِ تمکین تھیں

بنایا اے ظفرؔ خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حور و غلماں کو

قرب و بعد:

قرب اور بعد بھی صوفیانہ اصطلاحیں ہیں۔ قُرب کا استعمال عام طور پر طاعت و عبادت کے ذریعے اللہ کے قریب ہونے کے معنوں میں کیا جاتا ہے، اور بُعد کا مطلب رحمتِ حق سے دوری ہوتا ہے۔ اس معاملے میں حضرت شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> "قُرب کا سب سے پہلا رتبہ اللہ کی اطاعت کے قریب ہونے اور ہر وقت اس کی عبادت کرنے کی صفت سے موصوف ہونے کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخالفت اور اس کی اطاعت سے علاحدہ رہنے کی گندگی سے آلودہ ہونے کا نام 'بُعد' ہے۔ بعد کا پہلا مرحلہ اللہ کی توفیق سے دور ہونے کا ہے، پھر تحقیق سے بُعد کا مرتبہ آتا ہے، بلکہ دراصل توفیقِ ایزدی سے دوری کا نام ہی بُعد عن التحقیق ہے۔"

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۳۲)

قرآن اور احادیث میں کئی جگہوں پر اللہ سے قریب ہونے کے طریقے بتائے گئے

ہیں۔ جیسے ایک حدیث قدسی ہے، کہ میرا قرب حاصل کرنے کی خواہش کرنے والے کسی بات سے بھی اس قدر قرب حاصل نہیں کرسکتے ،جس قدر وہ فرضوں کے ادا کرنے سے کرتے ہیں۔ بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگ جاتا ہے اور میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اللہ کے قریب ہونے کے متعلق ایک اور حدیث ہے کہ بندہ سجدے کی حالت میں اللہ سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ قرب خداوندی شریعت اور طریقت دونوں میں یکساں مطلوب ہے۔ اللہ سے بندے کی قربت کئی شکلوں میں ہوتی ہے۔ اس بارے میں قرب کی مثال دیتے ہوئے امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلے بندے کا قرب بندے کے ایمان اور تصدیق سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد احسان اور تحقیق کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ سے قریب ہونا اس طرح ہے کہ اس زندگی میں اللہ تعالیٰ اسے عرفان کے ساتھ خاص کرتا ہے اور آخرت میں اسے شہود وعیاں کی عزت عطا فرماتا ہے اور درمیانی عرصہ میں طرح طرح کے لطف واحسان سے مالا مال کرتا ہے۔''

(ایضاً، صفحہ-۲۳۲)

شریعت وحقیقت:

شریعت اور حقیقت وہ الفاظ ہیں جن کا استعمال خوب خوب کیا جاتا ہے اور صرف تصوف کی اصطلاح میں ہی نہیں، دوسرے حلقوں میں بھی یہ الفاظ بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی تشریح اور تعریف امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں یوں ہے:

> ''عبودیت پر قائم رہنے کا حکم دینا شریعت ہے اور حقیقت حق تعالیٰ کی ربوبیت کے مشاہدے کا نام ہے۔ لہذا ہر وہ شریعت جس کی تائید حقیقت

سے نہیں ہوتی وہ غیر مقبول ہے اور ہر وہ حقیقت جو احکامِ شریعت سے مقید نہ
ہو بے سود ہے۔ لہٰذا شریعت مخلوق کو مکلّف بنانے کے لئے ہے اور حقیقت
میں اس بات کی اطلاع دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق میں کس طرح تصرف
کرتا ہے۔ لہٰذا شریعت اللہ کی بندگی کا نام ہے اور حقیقت اس کے مشاہدے
کو کہتے ہیں۔ شریعت میں احکام کی پابندی ضروری ہے اور حقیقت میں ان
امور کا مشاہدہ ہوتا ہے جن کا فیصلہ ہو چکا ہے، جو تقدیر میں لکھی جا چکی ہیں
اور جو مخفی ہیں یا ظاہر ہیں۔''

(ایضاً، صفحہ-۲۳۵)

شریعت اور حقیقت کی بحث کو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے انتہائی آسان طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ حقیقت کو شریعت سے الگ کوئی ادارہ نہیں مانتے اور شریعت کی تکمیل کا نام ہی حقیقت بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کے ایک خط کا کچھ حصہ:

''شریعت کے تین جز ہیں، علم، عمل اور اخلاص۔ جب تک یہ تینوں جزو ثابت نہ ہو جائیں اس وقت تک (حقیقت میں) شریعت ثابت نہیں ہوتی اور جب (حقیقت میں) شریعت ثابت ہوگئی تو حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوگئی جو کہ دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں سے اوپر (افضل) ہے۔ ورضوان من اللہ اکبر (توبہ، آیت۷۲) (اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔)

تو شریعت تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں کی ضامن ہوئی۔ کوئی بھی مقصد نہیں جس کے حاصل کرنے میں شریعت کے ماسوا کسی اور چیز کی ضرورت پیش آئے۔ طریقت اور حقیقت جس کے ساتھ صوفیاء کرام ممتاز ہیں، شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں۔ تو ان دونوں کے حاصل کرنے سے مقصود شریعت کا کامل کرنا ہے نہ کہ شریعت کے سوا کوئی اور امر ہے۔''

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب-۳۶)

اُوپر کی عبارت نے پوری طرح واضح کردیا کہ شریعت کیا ہے؟ اور حقیقت کیا ہے؟ دونوں کے فرق اوران کے بیچ کی نسبت کو بھی بتادیا۔شریعت اور حقیقت دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے لازمی ہیں ۔حقیقت کا شریعت سے الگ کوئی وجود نہیں۔حقیقت سے مرادشریعت کی حقیقت ہے اور طریقت سے مرادشریعت کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ ہے۔حالانکہ ایک طبقہ ایسا بھی رہاہے جوشریعت سے بالکل الگ حقیقت کو مانتا ہے۔اس طبقے کی خودصوفیہ نے مذمت کی ہےاورایسا نظریہ رکھنے والوں کوگمراہ و بے دین قراردیا ہے۔داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نظریہ مشبہ،قرامطہ،مشبعہ اور موسان کا بتایا ہے۔صوفیہ شریعت اورحقیقت کوجسم وجان کی طرح سمجھتے ہیں۔شیخ علی ہجویری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

''اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جوروح کے ساتھ زندہ ہو۔جب روح اس سے جداہوجاتی ہےتووہ شخص مردہ ہوجاتا ہےاورروح جب تک رہتی ہےتواس کی قدروقیمت ایک دوسرے کے ساتھ رہنے تک ہے۔اسی طرح شریعت بغیرحقیقت کے ریاہےاورحقیقت بغیرشریعت کے نفاق۔''

(کشف المحجوب،صفحہ-۵۴۹)

نفس:

تصوف کی اصطلاحوں میں ایک اہم ترین اصطلاح 'نفس' ہے۔لفظِ نفس کامختلف جگہوں پرمختلف شکلوں میں استعمال ہوتا ہےاورضرورت کے مطابق اس سے معنیٰ مراد لیتے ہیں،مگرصوفیہ کی اصطلاح میں اس کا مطلب کچھ اور ہی ہوتا ہے:

''غیبی لطائف کے ذریعے سے دلوں کوراحت دینے کانام نفس ہے۔''

(رسالہ قشیریہ،صفحہ-۲۳۶)

نفس کے مفہوم کوطے کرنے میں اہلِ تصوف کے یہاں بہت زیادہ اختلافات

ہیں۔ وہ اس سے الگ الگ مفہوم مراد لیتے ہیں اور کئی بار یہ مفہوم ایک دوسرے سے بالکل متضاد بھی ہوتا ہے۔ شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اس کی مختصر تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''واضح ہو کہ نفس کے لغوی معنیٰ، وجود شی اور حقیقت وذات کے ہیں۔ لوگوں کی عادت اور ان کے استعمال میں اس کے معانی بہت ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل خلاف بلکہ متضاد ہیں۔ چنانچہ ایک گروہ کے نزدیک نفس کے معنیٰ روح کے ہیں اور ایک گروہ کے نزدیک اس کے معنیٰ مودت ہیں اور ایک گروہ کے نزدیک اس کے معنیٰ جسم وبدن کے ہیں۔ ایک دوسرے گروہ کے نزدیک اس کے معنیٰ خون کے ہیں، لیکن طریقت کے محققین کے نزدیک اس لفظ کے مذکورہ معانی میں سے کوئی مراد نہیں ہیں۔ اربابِ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ درحقیقت نفس تمام شر اور برائی کا سرچشمہ ہے، جو برا امام اور قائد ہے، لیکن ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نفس وہ شی ہے جو قالب میں بطور امانت رکھا گیا ہے، جیسے روح۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ قالب ہی کی ایک صفت ہے۔ جس طرح حیات وزندگانی اس کی صفت ہے بایں ہمہ اس میں سب متفق ہیں کہ کمینہ خصلتیں اور برے افعال اسی سے ظاہر ہوتے ہیں۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۲۸۴)

رسالہ قشیریہ اور کشف المحجوب کی عبارتیں بالکل الگ الگ ہیں۔ دونوں ماہرینِ تصوف کے خیالات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نفس کیا ہے اس میں بھی صوفیہ کا باہمی اختلاف ہے۔ لیکن اتنا تو ہے کہ جس نے بھی اس سے کوئی مفہوم مراد لیا اس نے سیاق وسباق کے مطابق مراد لیا۔ خود امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ کی دو جگہ الگ الگ انداز میں تشریح کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی الگ الگ جگہوں پر الگ الگ مفہوم مراد لیتے ہیں۔

خواطر:

جو باتیں آدمی کے اندر القا کے ذریعے آتی ہیں انھیں صوفیہ کی اصطلاح میں خواطر کہا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ القاء فرشتے کی جانب سے ہو مگر اس بات کی پہچان مشکل ہے کہ القاء شدہ بات خواطر میں ہے یا نہیں۔ کئی بار دل میں شیطانی وسوسے بھی آتے ہیں، جن کے بارے میں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ صوفیہ اس کی پہچان کا یہ طریقہ بتاتے ہیں کہ اگر یہ شیطان کی طرف سے ہوگا تو خواہشاتِ نفس کی پیروی کی دعوت ہوگی، تکبر کا احساس دلائے گا۔

علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین:

علم حاصل ہونے کی تین صورتیں ہیں، جنھیں صوفیہ اپنی اصطلاح میں بیان کرتے ہیں۔ یہ اصطلاحات ہیں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ ان کا سیدھا سا مطلب تو یہ ہے کہ پختہ علم کے لئے یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تشریح یوں کی ہے:

''صوفیاء کی اصطلاح کے مطابق علم الیقین وہ علم ہے جس میں برہان ودلائل کی شرط پائی جائے اور عین الیقین وہ جس میں وضاحت پائی جائے، اور حق الیقین وہ علم ہے جس میں معائنہ یا ایسا علم پایا جائے جیسے انسان اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ لہٰذا عین الیقین اربابِ عقول کا علم ہوتا ہے اور صاحبِ علم کا علم عین الیقین ہوتا ہے اور اصحابِ معرفت کا علم حق الیقین ہوتا ہے۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۳۸)

ان تینوں اصطلاحوں کی تشریح میں اہلِ تصوف کا زیادہ اختلاف نہیں۔ الفاظ میں فرق ہو سکتا ہے مگر مفہوم قریب قریب ایک ہیں۔ داتا صاحب ان کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''اہلِ طریقت کے نزدیک علم الیقین سے مراد، دنیاوی معاملات میں اوامر واحکام کا جاننا ہے اور عین الیقین سے مراد، جانکنی اور دنیا سے کوچ کرنے کے وقت کا علم ہے اور حق الیقین سے مراد، جنت میں رویت کا کشف اور

اس کے احوال کے معائنہ کی کیفیت ہے۔ گویا علم الیقین علماء کا درجہ ہے کہ وہ احکام واوامر پر استقامت رکھتے ہیں اور عین الیقین عارفوں کا مقام ہے کہ موت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور حق الیقین، محبوبان خدا کے فنا کا مقام ہے کہ وہ تمام موجودات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ علم الیقین مجاہدے سے ہوتا ہے، عین الیقین انس ومحبت سے، اور حق الیقین مشاہدے سے اور یہ کہ ایک عام ہے، دوسرا خاص، تیسرا خاص الخاص۔''

(کشف المحجوب، صفحہ-۵۴۸ وارد)

صوفیہ کے کلام میں وارداتِ قلبی کا ذکر آتا ہے۔ وارد، واردات کا واحد ہے۔ وارد، دل میں ظاہر ہونے والی کیفیت کو کہتے ہیں۔ یہ کیفیت کسی بھی قسم کی ہو سکتی ہے، مگر اسے حق کی طرف سے ہونا چاہئے۔ اس بارے میں امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وارد، وہ اچھے خواطر ہیں جو انسان کے قصد وارادے کے بغیر دل میں محسوس ہوں۔ اسی طرح وہ امور بھی وارد کہلائیں گے جو خواطر کی قسم سے نہ ہوں۔ مزید براں بعض اوقات 'وارد' حق کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی علم کی طرف سے۔ لہٰذا واردات خواطر سے زیادہ عام ہیں، کیونکہ خواطر ایک قسم کے خطاب کے ساتھ مختص ہیں، یا ایسی بات سے مختص ہیں جس میں خطاب پایا جائے۔ واردات کئی قسم کے ہیں۔ واردِ خوشی، واردِ غم، واردِ قبض اور واردِ بسط وغیرہ۔'' (رسالہ قشیریہ، صفحہ-۲۳۸)

شاہد:

'شاہد' کا لفظی مطلب ہوتا ہے، حاضر یا گواہ، مگر صوفیاء کی اصطلاح میں شاہد اس کیفیت کو کہتے ہیں جو اُس وقت دل کے اندر موجود ہو۔ دل کے اندر علم غالب ہے یا 'وجد' سب 'شاہد' کہے جائیں گے۔ اس بارے میں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا تو فرمایا:

''ہم کہاں حق کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، بلکہ حق ہمارا شاہد ہے۔ان کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ ان کے دل پر حق کا غلبہ ہے اور اس کا ذکر غالب ہے اور ذکر پیوستہ ان کے دل میں حاضر ہے۔جس کا کسی مخلوق کے ساتھ قلبی تعلق ہو جائے تو اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ اس کا شاہد ہے یعنی وہ اس کے دل میں حاضر ہے۔اس لئے کہ محبت کا تقاضہ یہی ہے کہ محبوب کا ذکر ہمیشہ جاری رہے اور اس کا عاشق پر غلبہ ہو۔''

(رسالہ قشیریہ، صفحہ ۲۳۸۔۲۳۹)

روح:

'روح' کیا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن مجید میں دے دیا گیا ہے کہ 'وہ امر رب ہے۔ یہاں تک کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوسکتا مگر اس کے آگے اس کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے اس پر صوفیہ کے درمیان بحث رہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ 'روح' حیات ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ جسم ہیں، جنھیں بدن میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ عادتاً ہوتا ہے کہ جب تک روح جسم میں ہوتی ہے تب تک جسم زندہ رہتا ہے اور جیسے ہی وہ جسم سے جدا ہو جاتی ہے، جسم بھی مر جاتا ہے، مگر حشر دونوں کا ہوگا اور عذاب وثواب میں دونوں ساتھ ہونگے۔

یہاں ہم نے چند صوفیانہ اصطلاحوں کا ذکر کیا اور ان کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی مگر ان کے علاوہ بھی بہت سی صوفیانہ اصطلاحیں موجود ہیں، جنھیں سمجھنے کے لئے تصوف کی کتابوں کا مطالعہ لازمی ہے۔ایک خاص بات یہ ہے کہ ان اصطلاحات کے کئی بار حسب ضرورت بھی صوفیاء مطلب مراد لیتے ہیں۔ ایک مشہور مفہوم ہے مگر وہ اس سے الگ کوئی دوسرا مطلب مراد لیتے ہیں۔

❖○❖

دولت تیرے پاس وارثوں کا خزانہ ہے، راہِ خدا میں
خرچ کرنے والے مال کے سوا تیرا کوئی مال نہیں ہے۔

(مکاشفۃ القلوب)

یقین کی بدولت کچھ لوگ پانی پر چل سکتے ہیں، اور وہ لوگ جو اُن
سے زیادہ یقین والے تھے وہ پیاسے مر گئے۔

(جنید بغدادی)

کشمیر وادیٔ تصوف

یقین دل کے اندر ایک ایسا پختہ علم ہے، جس میں کسی قسم کا بدلاؤ نہیں ہوتا۔

(جنید بغدادی)

کشمیر

پانی میں ہے چشموں کی اثر آب بقا کا
ہر نخل پہ عالم خضر سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نور خدا کا
سائے میں شجر کے اثر ظل ہما کا

مبداءِ کرم عام کی ہر جوئے رواں ہے
سرچشمۂ فیض چمن آرائے جہاں ہے
وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا

گردوں پہ شفق کوہ پہ لالے کا لہکنا
مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیم سحری کا
میوؤں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے
بکھرے ہوئے وہ دامنِ کہسار پہ لالے
اڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے جھالے
دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے
وہ ابر کے لکوں کا تماشہ شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کی دروں میں
ہاں میں بھی ہوں بلبل اسی شاداب چمن کا
ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا
ہے رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا
تازے ہیں مضامیں بھی طبیعت بھی ہری ہے
ہاں گلشن قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

چکبست

اگر دُکھ کی رات طویل ہو جائے تو صبر کر کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دُکھ کا انجام مسرت ہوتا ہے۔

(مکاشفۃ القلوب)

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتادیں میں کہاں ہوں

اقبالؔ

یہ وادیاں یہ فضائیں

کشمیر روئے زمین کی کہکشاں کی مانند ہے۔ جس میں انوار وتجلیات کے تمام رنگ ملتے ہیں۔ یہاں ہری بھری وادیاں ہیں۔ٹھنڈی ار پر کیف فضائیں ہیں۔ وسیع جھیلیں ہیں ۔جھیلوں میں تیرتے کنول ہیں۔ سفید برف سے ڈھکی چوٹیاں ہیں۔ زعفران کے خوشبودار کھیت ہیں۔ اس وادئ گل پوش کے بسنے والے بھی گل فام ہیں۔ سرو کے جیسے قد اور گلاب جیسے چہرے ان کی پہچان ہیں۔ چمن زار کشمیر ہمالہ کی گود میں واقع ہے۔ یہ زمانہ قدیم سے برصغیر کا ایک غیر منقسم حصہ رہا ہے تاہم اب لائن آف کنٹرول کے ذریعے دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ بھارت کے زیر انتظام ہے تو دوسرا پاکستان کے کنٹرول میں۔ کشمیر کی سرحد بھارت اور پاکستان کے مختلف صوبوں سے ملتی ہے لیکن دشوار گزار گھاٹیوں کے ذریعے چین، تبت ،روس اور افغانستان کی سرحدیں بھی کشمیر سے متصل ہیں۔ عہد شاہجہانی میں کشمیر سے ایک راستہ چین تو

دوسرا کاشغر کی طرف جاتا تھا۔ یہ راستے اتنے دشوار گزار تھے کہ چین پہنچنے میں مسافروں کو تقریباً تین مہینے لگ جاتے تھے۔ شاہجہاں نے جب تبت کے ایک حصے پر حملہ کیا تو وہاں کے راجہ نے کشمیریوں کے تبت آنے جانے پر پابندی عائد کردی۔ مورخین کے مطابق یہ راستہ مختلف گھاٹیوں سے ہوکر گزرتا تھا اور درمیان میں گہرے دریا بھی آیا کرتے تھے، جنھیں صرف رسیوں پہ لٹک کر پار کیا جاسکتا تھا۔ کشمیر میں آج بھی دریا عبور کرنے کے لئے اس طریقے کا استعمال کیا جاتا ہے۔

وادیٔ گل ولالہ:

کشمیر کو سرزمینِ گل ولالہ کہا جاتا ہے، اس لئے کہ یہاں ہر طرف پھول ہی پھول کھلے نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی خوبصورت دلہن نے اپنے چہرے کو پھولوں کے نقاب سے ڈھک رکھا ہے۔ پربتوں، وادیوں، ندیوں اور جھیلوں کا حسن اس بات کا شاہد ہے کہ قدرت نے حسن کے خزانے جی کھول کر کشمیر پر لٹائے ہیں۔ جنت کے نظاروں کی پیوندکاری سرزمینِ کشمیر پر کردی گئی ہے۔ وہ انمول پھول جو دنیا کے لئے بیش قیمت ہیں یہاں کے لئے بے مول ہیں۔ یہاں کے پھولوں میں چوغاشی اہمیت کا حامل ہے جو موسم بہار میں کھلتا ہے اور انتہائی خوبصورت ہوتا ہے۔ یاسمین، کبودیا، آسمانی چمبیلی وادیٔ کشمیر کے باغوں میں بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ یاسمین سفید یا چنبیلی بھی یہاں ہر طرف دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی خوشبو ہوا کے دوش پر سوار ہوکر دور دور تک پھیل جاتی ہے اور دل ودماغ کو معطر کردیتی ہے۔ چنبیلی کی کئی دوسری اقسام بھی وادی میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے خاص پھولوں میں گلِ سوسن اور گلِ جعفری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ گلِ سوسن کی ایک قسم تو باغوں میں لگائی جاتی ہے مگر دوسری قسم صحرائی بھی ہے جو خودرو پودوں کی طرح صحرا میں اگتی ہے۔ سبز رنگ کا یہ پھول شاداب اور خوشبودار ہوتا ہے۔ گلِ جعفری بھی خوشبودار اور دلکش ہوتا ہے، لیکن گلاب جسے پھولوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے اور اپنی خوشبو ونزاکت کے لحاظ سے بے مثال ہوتا ہے، وادیٔ کشمیر میں بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ یہاں گلاب کی بے شمار

قسمیں ملتی ہیں۔ اتنی مختلف انواع واقسام کے گلاب شاید دنیا کے کسی دوسرے خطے میں نہ ملیں۔

پھل اور میوے:

کشمیر جس طرح اپنے پھولوں کے لئے بے نظیر ہے اسی طرح ذائقہ دار پھلوں میں بھی لاثانی ہے۔ یہاں انواع واقسام کے لذیذ پھل اور رسیلے میوے پائے جاتے ہیں۔ انار، سیب، امرود، ناشپاتی، تربوز، خربوزے اور خوبانی وہ پھل ہیں جن کی وادی میں کثرت ہے۔ ان کے علاوہ انگور، بہی، پستہ، آلوبالو، زرد آلو، بادام، توت، شفتالو، آلوچہ اور اخروٹ بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان پھلوں اور میووں کی کئی اقسام یہاں پائی جاتی ہیں۔

پھلوں کے علاوہ مختلف قسم کی سبزیاں اور اناج کشمیر میں پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ یہاں دھان کی کاشت ہوتی ہے اور یہ کئی انواع واقسام کے ہوتے ہیں۔ دھان کے علاوہ گیہوں، مونگ، مٹر، موٹھ، ماش، کپاس، شلغم، چقندر، تمباکو، ریشم اور شہد کی پیداوار بھی خاصی مقدار میں ہوتی ہے۔

چرند وپرند:

وادیٔ کشمیر میں ہر طرح کے چرند وپرند پائے جاتے ہیں مگر درندے اور وحشی جانور یہاں بہت کم ملتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی یہاں کثرت ہے۔ ایک بکری کی قسم ایسی پائی جاتی ہے جسکی دم نہیں ہوتی۔ اس کا گوشت بے حد لذیذ ہوتا ہے۔ چراگاہوں میں گھوڑوں اور گایوں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ گائیں پستہ قد ہوتی ہیں اور بھینسیں یہاں کمیاب ہیں۔ مختلف اقسام کے ہرن، گورخر اور خرگوش بھی یہاں ملتے ہیں۔ پرندوں میں مرغ، عقاب، بلبل، کبوتر، مینا، فاختہ، تیتر، بگلا، مہوکہ، ہنس، تیتری، مور، سارس اور دوسرے جانور پائے جاتے ہیں۔ یہ پرندے بھی وادی کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ جنگلوں اور باغوں میں پرندوں کی میٹھی چہکار سے سماں بندھ جاتا ہے اور جمالیاتی احساس رکھنے والا ہر دل بیخود ومدہوش ہونے لگتا ہے۔

خلدزار کے مرغزار:

خلدزار کشمیر میں رہنے والے بڑے باذوق ہوتے ہیں۔ یہاں لہلہاتے سبزہ زاروں اور رعنائیاں بکھیرتے پھولوں کی کثرت ہے، باوجود اس کے ہر گھر میں پھولوں کی کیاریاں نظر آتی ہیں۔ نیلے، پیلے، سرخ، سفید، گلابی،، پیازی، سبز، کاسنی اور نہ جانے کن کن رنگوں کے پھول یہاں مکانوں کو مہکا رہے ہوتے ہیں۔ یہ پھولوں کا منظر گھر سے مرغزاروں اور کوہستانوں تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ مرغزار دراصل پہاڑیوں کے دامن میں پھیلے وہ میدان ہیں جو شاداب پھولوں سے اٹے پڑے ہیں۔ یہ مرغزار شگفتہ پھولوں سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ یہاں فطرت کا حسن ہر طرف بکھرا نظر آتا ہے۔ مرغزاروں کی تعداد شمار قطار سے باہر ہے بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ کشمیر کا ایک معتد بہ حصہ مرغزاروں پر ہی مشتمل ہے۔ یہ بڑے بھی ہیں اور چھوٹے بھی۔ مشہور مرغزار گلمرگ ہے جو تقریباً تین میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔ اس کے آس پاس کوہستانی سلسلہ ہے۔ سونا مرگ بھی مشہور ہے اور تگ بھگ چار میلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ امرناتھ کے علاقے میں بھی کئی مرغزار ہیں۔ مہادیو پہاڑ کے پاس بھی کئی مرغزار ہیں نیز شاجی مرگ، گوکل مرگ، توسہ مرگ، مہشہ مرگ، زجہ مرگ وغیرہ کو بھی خاصی شہرت حاصل ہے۔ ان مرغزاروں کے بغیر کشمیر کے حسن کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

برف پوش چوٹیاں:

وادیٔ کشمیر کے حسن میں چار چاند لگاتی ہیں کوہِ ہمالہ کی برفانی چوٹیاں۔ چوٹیوں کا یہ سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور ان کی دلکشی اور رعنائی دیکھنے کے لئے دنیا کے کونے کونے سے لوگ آتے ہیں۔ یہ چوٹیاں، پربتوں کی شہزادیاں معلوم پڑتی ہیں جو کبھی تو برف کا سفید لباس زیب تن کئے یورپ کی دلہن محسوس ہوتی ہیں اور کبھی رنگ برنگے پھولوں کا دوشالہ اوڑھے مشرق کی باحیا شرمیلی دوشیزہ۔ کوہستانی سلسلے کے مشہور پہاڑوں میں ایک ہری پربت ہے جس پر شارکا دیوی کا مندر ہے اور اسی پر ایک مسجد بھی ہے۔ مسجد کے اردگرد عبادت گزاروں اور گوشہ نشینوں کے

لئے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ ہری پربت کے مغرب میں ایک صوفی حضرت شاہ حمزہ، عرف مخدوم کا مزار ہے۔ پہاڑ کے گرد شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے حکم سے ایک دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ ہری پربت پہ شہنشاہ جہانگیر کے اتالیق اخون ملا شاہ کا مقبرہ ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت اسی پہاڑ پر اترا تھا اور یہیں اتر کر انھوں نے کشمیر کی سیر کی تھی۔

کوہِ ہرمکھ اپنی بلندی کے لئے مشہور ہے۔ یہ ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ یہ ہندوؤں کے لئے تیرتھ استھان بھی ہے۔ کوہِ بانہال کو بھی بلندی کے لئے شہرت حاصل ہے۔ یہ پیر پنچال کی شاخ ہے۔ یہ سری نگر کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور جموں و کشمیر کے درمیان ہے۔ یہ جموں کی طرف سے کشمیر میں داخل ہونے کا واحد راستہ ہے۔ کوہِ وجہ بال بھی سر بفلک ہے اور سری نگر سے تقریباً اٹھائیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ پہاڑ گھنے جنگلات اور شفاف جھرنوں کے لئے مشہور ہے۔ موسمِ بہار میں یہاں سیاحوں کی آمد بڑھ جاتی ہے۔

سونا مرگ اور دراس کے درمیان ایک بلند پہاڑ ہے، جسے مقامی لوگ زوجہ بال کہتے ہیں۔ یہاں سردیوں میں زبردست برف باری ہوتی ہے۔ کوہ کرشوا ایک جھیل کے پاس واقع ہے اور اس کا شمار بھی کشمیر کے اونچے پہاڑوں میں ہوتا ہے۔ سرینگر سے لگ بھگ سو میل کے فاصلے پر شمالی جانب کوہِ مہادیو ہے، جہاں مہادیو جی کا میلہ لگتا ہے۔ امرناتھ پربت کی بلندی تقریباً سولہ ہزار فٹ ہے اور یہ ہندوؤں کے لئے بے حد مقدس ہے۔ یہاں پورے ملک سے ہندو زائرین پوجا ارچنا کے لئے آتے ہیں۔ نانگا پربت بھی کشمیر کے معروف پہاڑوں میں سے ایک ہے۔ اس کی اہمیت تاریخی لحاظ سے ہے۔ یہاں ایک قدیم قلعے کے آثار ملے ہیں جس کے تعلق سے ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ دو ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ کشمیر کے دیگر معروف پہاڑ کوہِ پہلگام، کوہِ گلمرگ، کوہِ شنکر آچاریہ، کوہِ برار، کوہِ ماربل وغیرہ ہیں۔

گلپوش وادیاں:

پھول، پربت اور وادیاں کشمیر کی شناخت ہیں۔ کشمیر مختلف وادیوں میں بنٹا ہوا ہے۔

ان میں سے بعض وادیاں ہندستان کے ماتحت ہیں تو بعض پاکستان کے قبضے والے کشمیر میں۔ وادی گریز ایسی جگہ واقع ہے جس کے درمیان لائن آف کنٹرول ہے اور یہ دونوں ملکوں کے درمیان منقسم ہے۔ اس وادی میں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ یہاں کے باشندے مسلمان ہیں اور اپنی فطرت سے بے حد سیدھے سادے ہیں۔ نماز روزے اور مذہبی احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ ہر گاؤں میں مسجدیں ہیں۔ پیر ان کا روحانی پیشوا ہے جو عیدین اور نماز جمعہ کی امامت کرتا ہے، نکاح پڑھاتا ہے اور دیگر دینی معاملات میں ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہاں تصوف کے اثرات بے حد نمایاں ہیں۔ وادی گریز کے لوگ صرف موسمِ بہار اور گرمی میں اپنے کام کاج کرتے ہیں، باقی چھ مہینے گھروں میں الاؤ کے گرد کہانیاں سنتے سناتے گزار دیتے ہیں۔ یہاں چھ مہینے برف باری ہوتی رہتی ہے اور پورا علاقہ برف سے ڈھک جاتا ہے۔ سردی شروع ہونے سے قبل لوگ اناج، سوکھی گھاس، ایندھن اور مویشیوں کے لئے چارے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ یہ وادی بھی کشمیر کی دیگر وادیوں کی طرح بے حد خوبصورت ہے۔

وادیٔ لدروٹھ بارہ مولہ سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ اس وسیع و عریض وادی کو سدا بہار وادی کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں سدا بہار پودوں کی بہتات ہے اور ہر موسم میں یہاں حسن و جمال کے قافلے خیمہ زن نظر آتے ہیں۔ پہاڑوں کا سینہ چیر کر نکلنے والے جھرنے، شفاف چشمے اور بل کھاتے ندی نالے اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ یہاں کی قدرتی فضا میں کئی قسم کے ساز گونجتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر کئی جھلیں ہیں۔ پہلگام کے مقام پر کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں جمع ہوتی ہیں جو ایک الگ دل نشیں منظر پیش کرتی ہیں۔ وادی کی ساخت پیالہ نما ہے اور گھنے جنگلات سے گھری ہوئی ہے۔ خودرو پودے اور خوشنما پھول اس کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ وادیٔ لدروٹھ کے لوگوں کی زندگی کا انحصار کھیتی باڑی اور جانوروں کی پرورش پر ہے۔ بھیڑ بکریاں اور گھوڑے پالنا ان کا مشغلہ ہے۔ غریب لوگ مزدوری کرتے ہیں۔ یہاں کے بہار کے موسم میں سیاحوں کا تانتا لگا رہتا ہے، جس سے مقامی لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ برفباری میں پوری وادی سفید برفیلی چادر اوڑھ لیتی ہے، کچھ مشکل پسند سیاح اس موسم میں

بھی چلے آتے ہیں۔

وادئ سندھ بھی لدروٹھ کی طرح دلکش اور پر فضا ہے۔ حسن و جمال میں یہ بے مثل و بے مثال ہے۔ اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں یہاں کے ندی نالے جو آخر کار دریائے سندھ میں جا کر مل جاتے ہیں۔ اسی لئے اسے وادئ سندھ کہا جاتا ہے۔ اس کے حسن و جمال کا محور ایک ایسی ندی بھی ہے جو کسی الھڑ حسینہ کی طرح لہراتی بل کھاتی گزرتی ہے۔ اس کے کنارے ذائقہ دار پھلوں اور میووں کے درخت پھلوں اور پھولوں سے لدے نظر آتے ہیں۔ یہ وادی فلک بوس پہاڑوں سے گھری ہے اور ہر طرف دلکش و پر فضا مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

وادئ سونا مرگ بے حد خوشنما اور دلربا ہے۔ یہ سر بہ فلک پہاڑی چوٹیوں کے حصار میں ہے۔ موسمِ بہار میں اس کی دلربائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نچلے حصے میں ایک جھیل ہے اور وادی کے تمام ندی نالے اسی جھیل میں آ کر گرتے ہیں۔ اس جھیل سے بھی چھوٹی چھوٹی نہریں نکلتی ہیں جو آس پاس کے گاؤں کے باغات کو سیراب کرتی ہیں۔ یہاں سیب کے باغات بہ کثرت ہیں۔ اس کے علاوہ اسے دھان کی کھیتی کے لئے بھی جانا جاتا ہے۔ سونا مرگ یا سن مرگ کے بالائی حصے جنگلات سے بھرے ہوئے ہیں، جہاں رنگ برنگے پھول خوشنما منظر پیش کرتے ہیں۔

وادئ لولاب کو کشمیرِ صغیر یعنی چھوٹا کشمیر کہا جاتا ہے۔ یہ حسن و جمال میں جنت کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ یہاں ہر طرف پھول کھلے دکھائی دیتے ہیں اور چشموں کی موسیقی ریز آواز کانوں میں شہد گھولتی ہے۔ پھلدار درخت ہر چہار جانب سایہ فگن دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کا ہر منظر وجد آفریں اور روح پرور ہے۔ یہاں قدم قدم پر بل کھاتی ندیاں، گنگناتے چشمے، دلکش سبزہ زار اور دل نشیں مرغزار ہیں۔

دریا جھیلیں اور چشمے:

منزلِ عاشقاں مہبطِ دلبراں ماحصلِ دل پہ کشمیر کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا

جب تک کہ یہاں کی گنگناتی جھیلوں اور مسکراتے چشموں کا ذکر نہ ہو جائے۔ یہاں کی وادیوں، کھیتوں، مرغزاروں اور گل زاروں کا حسن انھیں جھیلوں، چشموں، جھرنوں اور ندی نالوں کا مرہونِ منت ہے۔ یہیں سے تمام باغات کو پانی ملتا ہے اور جنتِ ارضی کا حسن قائم رہتا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حسنِ کشمیر کی زندگانی پانی کی روانی سے ہے۔

کشمیر کا سب سے اہم دریا جھیلم ہے۔ یہ کبھی خشک نہیں ہوتا اور یہی تمام چھوٹے بڑے ندی نالوں کو پانی سپلائی کرتا ہے۔ ان ندیوں پر پل بنے ہوئے ہیں اور جہاں تہاں کشتیاں تیرتی نظر آتی ہیں۔ یہ کشتیاں بھی مختلف انواع واقسام کی ہوتی ہیں۔ سائز بھی ان کا مختلف ہوتا ہے۔ سیاح ان کشتیوں پر سوار ہو کر یہاں کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

کشمیر میں بے شمار جھیلیں ہیں جو صاف وشفاف پانی سے لبریز ہیں۔ ان میں سب سے مشہور سرینگر کی ڈل جھیل ہے۔ یہ شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ اسے کشمیر کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ یہاں پوری وادی کی رعنائیاں سمٹ آتی ہیں۔ اس جھیل میں پہاڑوں اور چشموں سے پانی آکر گرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لمبی چوڑی جھیل کبھی خشک نہیں ہوتی۔ ڈل اپنے حسن اور خوبی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ یہاں کشتیوں، شکاروں اور ہاؤس بوٹوں کا منظر خوشنما ہوتا ہے۔ لوگ ان میں سوار ہو کر جھیل کی سیر کرتے ہیں۔ اس جھیل کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں اس کے دو جزیرے جن میں سے ایک کو روپا لنک یعنی چاندی کی لنکا اور دوسرے کو سونا لنک یعنی سونے کی لنکا کہا جاتا ہے۔ سونا لنک جزیرہ سلطان زین العابدین بڈشاہ نے بنوایا تھا۔ روپا لنک جزیرے کو سلطان حسین شاہ چک نے بنوایا تھا۔ یہاں ایک محل بھی تھا۔ ڈل جھیل ایک پر فضا مقام ہے۔ اس کے پانی کے متعلق اہل کشمیر رطب اللسان ہیں۔ کشمیری ادبیات میں اس کی تعریف ملتی ہے، مگر اب ہاؤس بوٹوں سے نکلنے والی غلاظت نے اسے صحت کے لئے نقصاندہ بنا دیا ہے۔

کشمیر کے حسن میں اضافہ کرنے والی ایک اور جھیل ولر ہے۔ یہ ڈل کے مقابلے بڑی ہے اور وسیع بھی ہے۔ یہ کشمیر کی سب سے بڑی جھیل ہے اور قدرتی مناظر وحسن وزیبائی میں ڈل کے مشابہ ہے۔ حسن منظر کے علاوہ اس کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ جھیل کے بیچ میں سلطان زین

العابدین بڈشاہ کا تعمیر کردہ جزیرہ ہے جس میں پرانی عمارتیں آج بھی موجود ہیں اور فن تعمیر کی تاریخ زبانِ حال سے بیان کر رہی ہیں۔ موسمِ بہار میں سیاحوں کی آمد بڑھ جاتی ہے اور یہاں میلہ سا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کچھ ہی فاصلے پر بابا شکرالدین کا مزار ہے جو مرجعِ خلائق ہے۔ ولر کے قریب ہی راجہ اونتی ورما کے دارالسلطنت سوپور کے آثار ہیں۔ اسے راجہ کے وزیر سویہ نے تعمیر کرایا تھا۔

جھیل گنگابل بھی کشمیر کی شفاف جھیلوں میں سے ایک ہے۔ یہ خوبصورت جھیل کوہِ ہرمکھ کے دامن میں واقع ہے۔ دلکشی کے علاوہ اس کی خصوصیت مذہبی بھی ہے۔ اسے مقامی ہندو گنگا کی طرح مقدس مانتے ہیں۔ یہاں ساون میں ہر سال میلہ لگتا ہے جس میں وہ اپنے مُردوں کی استھیاں بہاتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کا راستہ ذرا پر پیچ ہے۔

جھیل مانسبل صفاپور کے قریب، سرینگر سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ اسے تین طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے اور چوتھی طرف سے کچھ نہریں نکلتی ہیں جو آس پاس کے دیہاتوں تک جاتی ہیں اور باغات و کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں۔ اس جھیل کے قریب خوبصورت مناظر بکھرے پڑے ہیں اور موسمِ بہار میں کھلنے والے پھول اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ جہانگیر نے یہاں ایک محل تعمیر کرایا تھا علاوہ ازیں کچھ قدیم کھنڈرات بھی یہاں موجود ہیں۔

چشمۂ شاہی میراکدل سے تھوڑے فاصلے پر ہے اس کے حسن کی وجہ سے اسے چشمۂ کوثر سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

چشمۂ کوثر اگر خواہی کہ آید در نظر
لطف آب خوشگوارِ چشمۂ شاہی نگر

یہ چشمہ ایک خوبصورت باغ کے درمیان واقع ہے۔ آس پاس چنار کے قدیم درخت کھڑے ہیں۔ یہ چشمہ عہد قدیم کی یادگار تو ہے ہی، ساتھ ہی چنار کے درختوں کے تعلق سے یہاں کے لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ بھی مغل عہد سے پہلے کے ہیں۔ آس پاس ہر طرف سرسبز و شاداب پودے اور لہلہاتے سبزہ زار اور رعنائی بکھیرتے پھول ہیں۔ چشمۂ شاہی کا پانی صاف شفاف اور صحت

افزا ہے۔ چشمہ کی عمارت شہنشاہ شاہجہاں نے تعمیر کرائی تھی اور یہ اپنے بنانے والے کے ذوق کا پتہ دیتی ہے۔ چشمہ ویری ناگ، چشمہ اچھ بل، چشمہ سوندھ براری اور چشمہ بھون، کشمیر کے معروف چشمے ہیں۔

کشمیر جنت نظیر کے چشموں اور جھیلوں کی اگر پوری تفصیلات بتائی جائیں تو اس کے لئے ایک دفتر کم پڑ جائے۔ اسی طرح اس پورے خطے کے حسن و جمال کو بیان کرتے وقت الفاظ کی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اسے بس دیکھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے لفظوں میں بیان ممکن نہیں۔

جو شخص قناعت کو پالیتا ہے اُس پر کبھی دُکھ کا سایہ نہیں پڑتا۔

(مکاشفۃ القلوب)

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں
خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست
قیامت میں تماشا بن گیا میں

اقبالؔ

فردوس برروئے زمیں یا وادئ محبت

عامیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ شادابی کہاں
کیا ہے جنت؟ چند حوریں اک چمن دوندیاں
خیر زاہد کی رعایت سے کہتا ہوں کہ ہاں

عالم بالا پہ ہے پرتو اسی کشمیر کا:

معروف کشمیری شاعر پنڈت دینا ناتھ چکن مستؔ کے اس خیال کو شاعرانہ تعلّی پر محمول کریں تو بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس وادئ گل و لالہ کے حسن کی تعریف کے لئے ذخیرۂ الفاظ کم پڑنے لگتے ہیں۔ جنت ارضی، فردوس برروئے زمیں، جنت نظیر، خلدزار، چمن

زار، سبزہ زار، مرغزار، فردوسِ بریں اور ایرانِ صغیر جیسے بے شمار ناموں سے اس وادی کو یاد کیا جاتا ہے مگر پھر بھی یہ احساس رہتا ہے کہ اس کے حسن کی حقیقی معنوں میں تعریف نہیں ہو پائی۔

اللہ تعالیٰ کی فیاضیاں شمار وقطار سے باہر ہیں۔ آسمان، زمین، چاند، سورج، ستارے، کہکشاں کا جھرمٹ، کائنات کی آرائش وزیبائش، سطحِ زمین میں بکھرے ہوئے عقیق وزمرد، اور روئے زمین پر نکھرے ہوئے چمن زار وگلزار۔ ان نعمتوں سے انکار ممکن نہیں مگر صناعی کا ایک عظیم ترین نمونہ کشمیر ہے، جس کے مرغزاروں پہ کہکشاں کا حسن قربان، جس کے گل ولالہ پر آفتاب وماہتاب نثار، جس کے چشموں کو حوضِ کوثر سے نسبت ہے اور جس کی ندیاں حورانِ بہشتی کے کمر کے بل کی طرح مڑتی ہیں۔ جہاں گلاب کی رنگت پریوں کی رنگت کو شرمندہ کرتی ہے۔ جہاں یاسمن کی سفیدی غلمانِ جنت کی سادگی کو منفعل کرتی ہے۔ کشمیر کا ذرہ ذرہ حسن کی لازوال دولت سے معمور ہے اور اس وادیٔ دلفریب کے باشندے بھی حسین ہیں۔ یہاں قدم قدم پر فطرت کی جلوہ سامانیاں ہیں۔ ہر طرف رقصِ بہاراں ہے۔ ایک بار اس فردوسِ بریں کا دیدار کرنے والا آخری دم تک اسے فراموش نہیں کرسکتا۔ تاحدِ نظر حسنِ فطرت کے نظارے، پھولوں کی شکل میں کھلے تارے، چمن زاروں میں رقصِ بہاراں، مرغزاروں میں کیفِ نگاراں، چناروں کے آتش پارے، ندیوں کے بہتے دھارے، آبشاروں کے نغمے، گنگناتے چشمے، فطرت کے جلو میں مچلتی جوانیاں، زلفوں کی گھٹاؤں کی اٹھکیلیاں، فانوسِ فطرت کی تجلیاں، پھولوں بھری وادیاں، طلوع وغروبِ آفتاب کا منظر، مہتاب کا پیہم سفر، جھیلوں میں تیرتے کنول کے نظارے، خوبصورت ہاؤس بوٹ اور دلکش شکارے، کسی محبت بانٹتے صوفی جیسے پھلدار درخت اور سفید ریش سنت جیسے برف پوش پہاڑ۔ ہر منظر دامنِ دل کو کھینچتا ہے کہ جا اینجا است۔ شاید نقاشِ فطرت کے انھیں نقوش کو دیکھ کر وفورِ جذبات میں کسی نے کہا تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

کشمیر حسن وعشق کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ حسن کی بنیاد محبت ہے۔ حسن جس چیز

میں ہو وہ عالم کو گرویدہ بنا لیتی ہے۔ وہ مکاں ہو یا مکیں، زماں ہو یا زمیں، حسن کی تجلیاں خواہ جہاں ہوں مرکزِ نگاہ اور مہبطِ الفت بن جاتی ہیں۔ یہی محبت توحید و شہادت کی اساس ہے۔ اسی سے جلوۂ طور اور معراجِ حضور ہے۔ اسی محبت کی حکمرانی حرا سے ہمالہ تک ہے۔ انسانِ کامل وہ ہوتا ہے جو اپنے خالق سے محبت کرتا ہے اور خالق اپنی مخلوق سے۔ یہی محبت اس کائنات کی بنیاد ہے اور ساری کائنات اسی مرکزی نقطے کے گرد محوِ گردش ہے۔ اس جذبے سے فیاضِ قدرت نے کشمیر کو کچھ زیادہ ہی نوازا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کشمیر نے دنیا میں محبت بھی اسی مقدار میں تقسیم کی جس مقدار میں خوش رنگ ذائقے دار سیب تقسیم کئے اور جس مقدار میں زعفران کی خوشبودار پنکھڑیاں تقسیم کیں۔

حسن و عشق کی جلوہ سامانیوں سے کشمیر کا ذرہ ذرہ تاباں ہے۔ فطرت کی نیرنگیوں سے یہاں کا پتہ پتہ شاداں ہے۔ پھول تو ساری دنیا کے خوبصورت ہوتے ہیں مگر یہاں تو کانٹوں کا بھی اپنا حسن ہے۔ یہ کانٹے اگر دل میں چبھ جائیں تو درد و کسک میں ڈوبی ہوئی وہ تان نکلتی ہے جو لافانی ہوتی ہے۔ دل کی یہ خلش کسی کو حبہ خاتون تو کسی کو اِرنی مال بنا دیتی ہے۔ کسی کو نورالدین رشی تو کسی کو للہ عارفہ بنا دیتی ہے۔ جس خطۂ ارضی کے خار اتنے کرشماتی ہوں اس سرزمین کے پھولوں کا کیا کہنا۔

کشمیر کی ہر چیز دل نشیں ہے، ہر شے سرور آگیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں بسنے والے انسان بھی حسن و جمال کی چلتی پھرتی مورتیں ہیں۔ سڈول اور متناسب جسم، نرگسی آنکھیں، گلاب جیسے شاداب چہرے، پنکھڑیوں جیسے سرخ ہونٹ اور دمکتی پیشانیاں انکی خصوصیت ہیں۔ گویا یہ جنتِ ارضی کے وہ حور و غلمان ہیں جن سے یہ لالہ زار صدرشک جنت ہے۔

❖○❖

چین و عرب ہمارا، ہندستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے، سارا جہاں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبالؔ

کشمیری اقوام تاریخ کے آئینے میں

برصغیر ہندوپاک کی اقوام کومختلف نسلوں اور قوموں کا آمیزہ کہا جاتا ہے مگر کشمیریوں کے متعلق عام مورخین اور ماہرین کا خیال ہے کہ وہ سب سے زیادہ خالص آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نہیں پتہ چل پایا کہ وہ کب کشمیر آئے اور کس راستے سے ان کی آمد ہوئی نیز ان کی آمد کا سبب کیا تھا۔

آریہ کون؟:

یہ سوال عام طور پر پوچھا جاتا ہے کہ آریہ کون ہیں اور وہ برصغیر میں کہاں سے آئے تھے؟ ان کا مسکن اصلی کونسی سرزمین تھی۔ اس سلسلے میں مختلف ماہرین کی مختلف رائیں ہیں۔ ایک مشہور فرانسیسی محقق گستاوَلی بان نے اپنی کتاب 'تمدن ہند' میں اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''لفظ آریہ کا اطلاق ان اقوام پر ہوتا ہے جن کی جلدیں سفید اور بال سیاہ تھے۔ یہ اقوام ایک ہی زبان بولتی تھیں، جس کا نام آریک تھا۔ یہ اصل زبان تو مفقود ہوگئی ہے لیکن سنسکرت اسی سے مشتق ہے۔ آریہ اقوام لگ بھگ پندرہ سو سال قبل مسیح میں کابل کے دروں میں سے ہندستان (پاک و ہند، نیپال، بنگلہ دیش) آئیں۔ یہ کچھ تو خانہ بدوش تھیں اور کچھ بستیوں میں رہنے والیں۔ انھیں فن زراعت کا علم تھا اور اکثر ابتدائی اقوام کی طرح ان کا متخیلہ نہایت ہی زوردار تھا۔ یہ ان قدیم عبرانیوں سے بہت مشابہ تھیں، جن کا ذکر ہرووط نے کیا ہے۔ آریہ اقوام بتدریج دریائے سندھ سے گنگا تک آئیں اور اس کے بعد برہمپتر تک پھیل گئیں۔ راہ میں انھوں نے سیاہ فام اور سیدھے بالوں والی اقوام اور نیز تورانیوں کو جو، اُن سے پہلے یہاں مقیم تھے زیر کیا اور بتدریج اس خطے میں بس گئیں۔''

(تمدن ہند، صفحہ-۲۳۹)

اصل میں برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل تاریخ لکھنے کا رواج نہیں تھا اور علم بھی ایک خاص طبقے تک ہی محدود تھا۔ دوسرے طبقوں کو لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں تھی لہٰذا پرانے زمانے کے تاریخی حقائق کا پتہ لگ پانا تقریباً ناممکن ہے۔ کچھ مذہبی کتابوں اور عوامی روایتوں سے بعض باتوں کی جانکاریاں ملتی ہیں جن پر پوری طرح یقین نہیں کیا جاسکتا۔ آریوں کی آمد بھی اسی عہد میں ہوئی اور اس دور میں جو کچھ ہوا وہ پردۂ خفا میں ہے۔ آریوں کی بعض باتوں کا پتہ ویداور منوسمرتی جیسی کتابوں سے چلتا ہے۔ لیکن ان کتابوں کو محفوظ نہیں کہا جاسکتا۔ ان میں تحریف کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ بالخصوص اس لئے کہ انھیں کتابی شکل ماضی قریب میں ملی ہے۔ یہ کتابیں برہمنوں کے ذہن میں تھیں۔ جن سے پوچھ پوچھ کر ان کتابوں کو مرتب کیا گیا۔ مورخین کا قیاس ہے کہ آریہ اقوام کا وطن ممکن ہے ایران رہا ہو۔ گستاؤلی بان لکھتے ہیں:

''یہ مسئلہ کہ اقوام آریہ کا جنھوں نے ہند کی تاریخ میں اتنا بڑا حصہ لیا، اصلی

وطن کہاں تھا؟ اس وقت تک معرض بحث میں ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں
کہ کسی قدیم زمانے میں اصلی آریہ ترکستان میں دریائے جیجوں کے قریب
میں رہتے تھے اور انکی دو بڑی قسمیں تھیں ایک تو ان میں سے یورپ میں
جا بسی اور دوسری ایران کی طرف آئی۔ ایران، بلخ اور سعدانیہ کے ملک میں
مدت تک رہنے کے بعد یہ اقوام جنوب کی طرف مڑیں۔ اور ہندوکش کے
پار ہوکر ہندستان تک پہنچیں۔ اگر ان قیاسات کو مان لیا جائے تو یورپی اور
ہنود (برصغیر کے باشندے) دونوں ایشائی اور متحد النسل اقوام ہیں۔"

(تمدن ہند (گستاؤلی بان) صفحہ-۲۳۹)

آریہ قومیں پورے برصغیر میں پھیل گئی تھیں۔ ان کے سخت قوانین نے انھیں قدیم
ہندستانی اقوام سے ملنے جلنے سے الگ رکھا مگر دھیرے دھیرے ان کا اختلاط ہوا اور اب اصل
آریوں کی پہچان بھی ممکن نہیں۔ مگر ماہرین کا ماننا ہے کہ یہاں سب سے کم مخلوط نسل کے آریائی
کشمیری ہیں۔ وہ اس خطے کے عام باشندوں سے ذرا مختلف ہیں۔ گستاؤلی بان کے مطابق:

"یہاں ہمیں ایک ایسی قوم ملتی ہے جو گرد و نواح کی اقوام سے اسی قدر مختلف
ہے، جیسی کشمیر کی وادی تمام دنیا کے ملکوں سے۔ کشمیریوں کا نام صرف اسی
وادی کے باشندوں پر صادق آتا ہے۔ ملک ہند کے باشندوں میں کشمیری
جسمانی خصائص کے لحاظ سے سب سے زیادہ عجیب اور سفید رنگ ہیں۔ ان
کی عورتوں کا حسن شہرہ آفاق ہے۔ جلد انکی نرم اور صاف ہے۔ ناک
خمدار، بال داڑھی گھنی۔ قد میں یہ زیادہ لمبے نہیں ہیں، لیکن مضبوط ہیں یہ
زیادہ جری نہیں ہیں لیکن ان کی صنعتی قابلیت تعجب خیز ہے۔ یہی اس مشہور
شال کو بنانے والے ہیں جو ساری دنیا میں پہنچ گئی اور یہیں وہ تانبے پر مینا
کاری کا کام بنتا ہے جسکی نقل اس وقت تک یورپ نہ کرسکا۔ اصلیت کے
لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر کے باشندے اقوام آریہ کی خالص اولاد

ہیں اور ان کے اعلیٰ طبقات میں تبّتی ملاپ نہایت خفیف ہے۔ یہ سب مسلمان ہیں لیکن ذات کی رسم ان میں موجود ہے۔ کشمیری زبان فارسی اور سنسکرت سے مرکب ہے۔''

(تمدن ہند، (گستاؤلی بان) صفحہ۔۱۲۵۔۱۲۶)

ان تحقیقات کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ کشمیری آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کشمیر میں پنڈتوں کی جو ذاتیں زیادہ مشہور تھیں، وہ تھیں کچلو، غمخوار، کول، چھچھ بلی، مدن، ہکسر، تکو، مٹو، رازداں، رینہ، دتاتریہ، کاک، درو غیرہ۔ یہ سبھی برہمن ذاتیں تھیں مگر یہاں غیر برہمن بھی تھے۔ یہاں اسلام قبول کرنے والوں میں سبھی باشندے شامل تھے۔ اگر جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی کشمیری، ایرانیوں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن کشمیر میں اسلام پھیلنے کے بعد کشمیریوں میں بھی نسلی ملاوٹ ہوئی البتہ اس ملاوٹ کے بعد بھی ان کی شکل وصورت اور جسمانی بناوٹ میں کوئی خاص فرق نہیں آیا کیونکہ یہ ملاوٹ جن اقوام کے ساتھ ہوئی وہ بھی آریائی تھیں یا کم از کم آریائی اقوام سے بہت قریب تھیں۔ یہاں اسلام صوفیہ کی تبلیغ سے پھیلا اور یہ صوفیہ ایران اور وسط ایشیا سے تعلق رکھتے تھے۔ ان صوفیہ نے یہیں کشمیر میں رہائش اختیار کی اور شادی بیاہ بھی یہاں کی اقوام میں کیں۔ دوسری بات یہ کہ ان صوفیہ کے ساتھ ان کے مریدین بھی بڑی تعداد میں کشمیر آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، نیز کچھ لوگ مغلوں کے حملے سے بھی پریشان ہو کر وسط ایشیا سے اس خطے میں آئے تھے۔۔ یہاں آنے والوں نے یہیں شادی بیاہ کی اور یہاں سے واپس نہیں گئے۔ پھر مختلف بادشاہوں کے زمانوں میں یہاں ایران اور وسط ایشیا کے لوگوں کا آنا جانا جاری رہا۔ انھوں نے کشمیر میں رہائش اختیار کی اور اگر کشمیر کی تہذیب پہ کچھ اثر ڈالا تو کچھ اثرات قبول بھی کیے۔ مختلف اسباب کی بنیاد پر اگرچہ کشمیریوں میں نسلی اختلاط ہوا مگر اس کے باوجود کوئی بڑی تبدیلی ان میں رونما نہیں ہوئی۔ جو قومیں یہاں آئیں ان کا ایک اجمالی خاکہ ہم یہاں پیش کریں گے، مگر اس سے پہلے ایک بات بتانا بے جا نہ ہوگا کہ صدیوں کے عمل کے باوجود کشمیر میں نسلی تبدیلی نہیں آئی البتہ یہ خطہ آج کل ایک ایسے بدلاؤ سے گزر رہا ہے جو بہت

خاموشی کے ساتھ رہا ہے۔ آج کل اس خطے میں بعض سماجی اسباب کی بنیاد پر ریاست کے باہر سے لڑکیاں شادی کے لئے لائی جارہی ہیں۔ باہر سے آنے والی دلہنوں میں بڑی تعداد بنگالی اور آسامی لڑکیوں کی ہے۔ ایسا محسوس ہورہا ہے کہ جو نسلی بدلاؤ کا کام صدیوں میں نہیں ہو پایا اب وہ ایک قلیل مدت میں ہوجائے گا۔

سادات کشمیر:

کشمیر میں اسلام قبول کرنے والی تمام ذاتوں کے افراد کو عموماً شیخ کہا گیا۔ ان کے نام کے ساتھ اب بھی ان کے پرانے ٹائٹل جڑے ہوئے ہیں جس سے ان کی قدیم برادری یا گوتر کی پہچان ہوجاتی ہے۔ مگر باہر سے آنے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی اور وہ مختلف علاقوں سے تھے لہٰذا ان کی تہذیب اور زبان کے علاوہ بھی ان میں کئی چیزیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ خاص بات ہے کہ اسلام میں ذات برادری جیسی کوئی بات تو تھی نہیں لہٰذا وہ جہاں گئے وہیں کی اقوام میں شادی بیاہ کیا اور اس طرح سے نسلی اختلاط بہت زیادہ ہوا۔

کشمیر میں آنے والے سادات یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل پاک سے تھے مگر وہ کئی الگ الگ خطوں سے آئے تھے لہٰذا ان میں نسلی اختلاط ہوتا رہا تھا۔ یہاں آنے والے سادات میں سرفہرست سادات ہمدانیہ ہیں۔ یہ مبلغ اسلام حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں یا ان لوگوں کی اولاد سے ہیں جو انکے ساتھ وادیٔ کشمیر میں وارد ہوئے تھے۔ تاریخ کی کتابوں کے مطابق شاہ ہمدان کے ساتھ سات سو کے قریب سادات کشمیر آئے تھے۔ بعد میں شاہ ہمدان کے صاحبزادے حضرت میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے اور ان کے ساتھ بھی سادات کی ایک بڑی جماعت تھی جو سادات ہمدانیہ کہلائی۔ خود میر محمد ہمدانی نے سکندر بت شکن کے نومسلم وزیر سویہ بھٹ (سیف الدین) کی بیٹی سے شادی کی تھی۔

سادات کی ایک جماعت منطقی اور بیہقی کہلاتی ہے۔ یہ حضرت سید حسین منطقی علیہ الرحمہ کی طرف منسوب ہیں۔ خراسان کے بیہق علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک صوفی تھے اور

سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کے دور میں کشمیر آئے تھے۔علم منطق میں مہارت کی وجہ سے منطقی کہے جاتے تھے۔ان کے بعدان کی اولاد بھی منطقی کہلائی۔

سادات اندرابیہ کا تعلق حضرت سید احمد اندرابی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ یہ جگر گوشۂ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی نسل پاک سے تھے اور اوران کا خاندان افغانستان کے علاقہ اندراب میں آبسا تھا۔سید احمد اندرابی رحمۃ اللہ علیہ،امیر کبیر میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کے ساتھ کشمیر تشریف لائے تھے۔وہ امیر کبیر کے بھانجے بھی تھے۔شاہ ہمدان کے کشمیر سے واپس جانے کے بعد بھی وہ وادی میں رہے اوران کی اولاد آج بھی یہاں موجود ہے جوسادات اندرابیہ کہلاتی ہے۔

کشمیر میں ساداتِ نقشبندیہ کی دوشاخیں ہیں۔ایک تو خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں جو جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں کشمیر آئے۔دوسرے خاندان کے بانی حضرت خواجہ عبدالرحیم نقشبندی احراری ہیں جومحمد شاہ بادشاہ غازی کے عہد حکومت میں کشمیر آئے تھے۔

سادات قادریہ گیلانیہ کا تعلق حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہے۔کشمیر میں اس خاندان کے دو بزرگ جو دونوں بھائی بھی تھے تشریف لائے تھے۔ان دونوں بزرگوں کے نام شاہ ابوالحسن اور شاہ محمد فاضل قادری (رحمہما اللہ) تھے۔ یہ دونوں بھائی چھ واسطوں سے غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کی نسل میں تھے۔ان کی وادیٔ کشمیر میں آمد اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں ۱۰۹۰ھ میں ہوئی اوران کی اولاد آج بھی گیلانی سادات کہلاتی ہے۔

سادات رضوی کا تعلق حضرت سید حسین رضوی علیہ الرحمہ کی اولاد سے ہے۔یہ بزرگ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر تشریف لائے۔بادشاہ نے ان کی خاطر ومدارات کی اورانھیں رہنے کے لئے زینہ گیر کے علاقے میں جگہ دی۔یہ امام علی رضا علیہ الرحمہ کی اولاد سے تھے۔

سید محمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تعلق رکھنے والوں کو رفاعی سید کہا جاتا ہے۔یہ

بزرگ اصفہان کے رہنے والے تھے اور بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر تشریف لائی تھے۔ ابتدا میں سرینگر میں قیام رہا مگر جب عوام کا ہجوم بڑھنے لگا اور علمی و دینی مشاغل میں دشواریاں ہونے لگیں تو بارہ مولا چلے گئے۔ یہیں خانپورہ میں مزار ہے۔

سادات دوارکی، کا تعلق علامہ میر سید داؤد رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہے۔ یہ بغداد کے قصبہ دوارک سے تھے اور کچھ دن ہرات میں رہنے کے بعد کشمیر چلے آئے تھے۔ یہ بھی سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے میں یہاں آئے تھے اور ایک خانقاہ و مدرسہ بنا کر تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کی خانقاہ، خانقاہ دوارکیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

سادات دہ بیدی کا سلسلہ نسب مخدوم اعظم سید احمد کاشانی سے ملتا ہے۔ اس خاندان کو بھی کشمیر میں عروج حاصل ہوا اور اس میں بڑے بڑے اہل علم و عرفان پیدا ہوئے۔ خواجہ محمد ہاشم، خواجہ صالح، خواجہ سید وفا، خواجہ محمد طاہر اسی خاندان کے معروف افراد گزرے ہیں۔

ساداتِ بخاری، سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔ ان کی اولاد سے سید علاء الدین بخاری، سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں کشمیر تشریف لائے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ وہ سبھی زیادہ بال بچے والے تھے۔ انھیں حکومت کی طرف سے جاگیریں ملی ہوئی تھیں مگر اس کے باوجود کھیتی باڑی کر کے گزارا کرتے تھے۔

ساداتِ جلالی، امام زین العابدین کی اولاد سے ہیں۔ ان کے جد اعلیٰ سید حسین سبزواری بن سید علی ہیں۔ ان میں قادریہ سلسلہ رائج رہا ہے مگر عقائد سے اب یہ شیعہ ہیں۔ حالانکہ پہلے یہ سنی تھے اور اس خاندان میں ایک بزرگ سید جلال الدین قادری گزرے ہیں۔

اوپر جن سادات خاندانوں کا ذکر ہوا وہ معروف گھرانے ہیں، مگر ان کے علاوہ بھی سادات کے بہت سے خاندان کشمیر آئے اور یہیں بس گئے۔ یہ خاندان، سلاطین کے زمانے میں کرمان، خوارزم، تبریز، بدخشاں، گردیز وغیرہ ممالک سے آئے تھے۔ یہ آج بھی اپنے انھیں علاقوں کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔

سادات کے علاوہ بھی کئی عرب اور غیر عرب اقوام کشمیر آئیں اور یہیں کو ہو کر رہ گئیں۔

ان میں ایک علوی بھی ہیں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے امام محمد حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔اس خاندان کے خواجہ احمد یسوی رحمۃ اللہ علیہ ترکستان کے علاقہ یس یا یسو سے کشمیر تشریف لائے تھے۔ یہ نقشبندی سلسلے کے بزرگ تھے اور ۱۱۱۴ھ میں انتقال فرمایا۔

کشمیر کے باہر سے یہاں آکر بسنے والوں میں قریشی حضرات بھی شامل ہیں۔تاریخ کی بعض کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر آکر بسنے والے پہلے قریشی کا نام سید محمد قریشی رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ یہ حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔قریشی بزرگوں میں ایک بزرگ خواجہ بہاء الدین فاروقی بھی تھے، جو اکبری عہد کے امیر ہونے کے باوجود دنیا پر دین کو ترجیح دیتے تھے۔ کشمیر میں کئی قریشی خاندان ہیں البتہ ان میں کم ہی ایسے ہیں جنھیں شہرت حاصل ہے۔

کشمیر میں آکر بسنے والے غیر عرب لوگوں میں افغان بھی شامل ہیں۔افغانستان کے کئی قبیلے یہاں آکر بسے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کشمیر میں بسے افغانی قبیلوں میں چند کے نام یہ ہیں:

”ککی خیل، آفریدی، کنٹ یا کانٹھ، سدوزئی، یوسف زئی، سواتی، بنیری، خٹکی، بلوچ، بارک زئی، درانی، حسن زئی، خیبری، ہزارہ، کابلی، نیازی، ککے زئی، خان۔“

(تاریخ اقوام کشمیر (محمد الدین فوق) صفحہ-۱۹۲)

ان قبائل کے علاوہ بھی کچھ افغان قبائل کے افراد کشمیر میں پائے جاتے ہیں۔اسی کے ساتھ مغلوں سے تعلق رکھنے والوں کی بھی وادی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں مغلوں کی آمد مختلف ادوار میں ہوتی رہی ہے۔بعض محققین کا خیال ہے کہ امیر کبیر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کے ساتھیوں میں کئی مغل مشائخ بھی تھے، لیکن بیشتر مغلوں کی آمد مغل عہد حکومت میں ہی ہوئی۔اس وقت کشمیر میں جو مغل برادریاں پائی جاتی ہیں، ان کی تعداد سات ہے۔ان کے نام یوں ہیں:

”میر، بیگ یا مرزا، بانڈے، بچھ، گانی، جان، عشائی اور رفیقی۔(رفیقی در

حقیقت عشائی طبقہ کی ہی ایک شاخ ہے)

(تاریخ اقوامِ کشمیر، صفحہ-۲۰۸)

ان کے علاوہ بھی کچھ اقوام کے افراد کشمیر میں آکر بسے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ نیپال، سندھ، پنجاب، سرحد، دلی، اتر پردیش اور بہار و گجرات کے افراد بھی یہاں آکر بسے۔ گویہ اختلاط کم رہا مگر ہوا۔

تاریخی شواہد کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کشمیر کے باشندے کچھ نسلی اختلاط کے باوجود سب سے کم مخلوط نسل کے آریائی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنی جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے اس برصغیر کے دوسرے افراد سے مختلف ہیں۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابیں پیش نظر رہیں:

۱۔ تاریخ اقوامِ کشمیر (محمد الدین فوق)

۲۔ شباب کشمیر (محمد الدین فوق)

۳۔ تمدن ہند (گستاؤلی بان)

۴۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں (محب الحسن)

اگر تجھے زمانہ کوئی دکھ دے تو سمجھ لے کہ شروع ہی سے ایسا ہوتا ہے۔

(مکاشفۃ القلوب)

نہ تخت وتاج میں نہ لشکر وسپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا اِلٰہ میں ہے

اقبالؔ

کشمیر میں اسلام اور تصوف کی ابتدائی کرنیں

تشدد کی عمر مختصر ہوتی ہے اور عدم تشدد کی طویل۔ اسلام کی ابتدا ہی عدمِ تشدد اور اہنسا کے فلسفے کے ساتھ ہوئی تھی لہٰذا اسے ساری دنیا میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ مکہ معظّمہ میں جب رسول اکرم ﷺ نے اسلام کی دعوت کا کام شروع کیا تو آپ کے مخالفین نے تشدد کا سہارا لیا اور تشدد کے جتنے حربے تھے آپ اور آپ کے ساتھیوں پر آزمائے مگر آپ کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی اور عدمِ تشدد کے اس پیغام نے تشدد پسندوں کو بھی اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ رسول محترم ﷺ کی زندگی کے یہی طریقے تصوف کی بنیاد میں شامل ہیں۔ جن دنوں اللہ کے نبی کی زندگی تشدد پسندوں سے دفاع میں گزر رہی تھی وہ ایام بانیانِ سلسلہ حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمانِ غنی اور علی مرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نگاہوں کے سامنے تھے اور اسی طریق کی پیروی ہر زمانے کے صوفیہ نے کی۔

کشمیر میں اسلام:

کشمیر میں اسلام کی ابتدا بھی اسی طریقے پر ہوئی اور یہاں اسلام وتصوف کی کرنیں ایک ساتھ پہنچیں۔ حالانکہ بعض تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ مسلمان بستیاں اس سے قبل بھی یہاں بس گئی تھیں مگر یہ شاذ جیسی بات ہے باقاعدہ شروعات صوفیہ نے ہی کی۔ یہاں اسلام کی اشاعت صوفیہ کی مساعی کا نتیجہ ہے جو عدمِ تشدد کے حامی تھے اور دلوں کو جوڑنے کا کام کرتے تھے۔ وہ انسانیت کے علمبردار تھے اور ہر دکھی انسان کی مدد کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے، خواہ وہ کسی بھی مذہب ومسلک اور ذات ونسل یا زبان وتہذیب سے تعلق رکھنے والا ہو۔ کشمیر میں اسلام اور تصوف کی ابتدا چودھویں صدی عیسوی سے ہوئی یعنی برصغیر کے دوسرے خطوں کے مقابلے اسلام یہاں تاخیر سے پہنچا مگر حیرت انگیز طور پر بڑی تیزی سے اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں اسلام کا پیغام لے کر صوفیہ پہنچے تھے جو عدم تشدد اور محبت و بھائی چارہ کے قائل تھے اور ساری دنیا کو حسنِ ازل کی جلوہ سامانی سمجھتے تھے۔ ان صوفیہ کے لئے اللہ کی تمام مخلوقات برابر تھیں۔ کشمیر میں اسلام اور تصوف کی باقاعدہ ابتدا ۱۳۲۵ء کے آس پاس ہوئی مگر اسے سمجھنے کے لئے تھوڑا اور پیچھے جا کر تاریخ کے دریچے میں جھانکنا ضروری ہے۔

کشمیر کے علاقے باقاعدہ اسلام کی اشاعت کا آغاز تو حضرت حضرت بلبل شاہ سے ہوا مگر یہاں مسلمانوں کی آمد کے شواہد بہت پہلے سے ملتے ہیں۔ جس پہلے مسلمان کی یہاں آمد کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے وہ حمیم سامہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ قیاس ہے کہ یہ تابعی تھے اور انکی اولاد بعد میں وادی میں رہائش پذیر رہی۔ چونکہ مسلمانوں کا عام قاعدہ تھا کہ وہ جہاں رہتے تھے، وہاں مسجدوں کی تعمیر کرتے تھے اور اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کرتے تھے لہٰذا قرین قیاس ہے کہ حمیم سامہ اور ان کے اخلاف نے یہاں تبلیغِ اسلام کی کوششیں کی ہونگی۔ البتہ ان کے تعلق سے ''چچ نامہ''میں مختصر تذکرہ ملتا ہے۔

عرب تاجروں کا پرانے دور سے کشمیر، چین اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں آنا جانا رہا ہے۔ وہ چین جا کر مختلف قسم کی چیزوں کی خرید وفروخت کرتے تھے۔ اس کا تذکرہ مختلف

تاجروں کے سفرناموں میں ملتا ہے۔ بعض مسلمان تاجر یہاں شادیاں بھی کرتے تھے اور بعض نے یہاں مستقل طور پر قیام بھی کیا۔ ایک ایسے ہی گروہ کا ذکر مسٹر آرنلڈ نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب THE PREACHING OF ISLAM میں کیا ہے۔ انھیں ارغون کہا جاتا ہے۔ ان کے آباء واجداد نے غیر مسلم تبتی خواتین سے شادیاں کی ہیں اور یہ لوگ بھی ایسا کرتے ہیں۔ کشمیر میں بعض اقوام ایسی ہیں جن میں اسلام تاجروں کے ذریعے پہنچا تھا اور ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود غزنوی کے حملے کے وقت یہاں مسلمان موجود تھے، یہ الگ بات ہے کہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ تاریخ فرشتہ جلد اول کے مطابق سلطان مسعود غزنوی نے کشمیر کے قلعہ سرستی کا محاصرہ کیا تو اہل قلعہ نے صلح کرنا چاہا۔ سلطان بھی کچھ رقم بطورِ نذرانہ لے کر واپس جانا چاہتا تھا کہ مسلمان سوداگروں کی ایک درخواست اسے موصول ہوئی جس میں تحریر تھا ''ہم چند مسلمان تاجر اپنے وطن سے نکلے اور بدقسمتی سے ان کافروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان ہندوؤں نے تعصب کی بنیاد پر ہم پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے اور ہم سے ہمارا مال چھین کر کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا ہے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ اگر آپ نے ہندوؤں سے ان کی پیش کردہ شرائط پر صلح کر لی تو آپ کے جاتے ہی یہ ہندو ہم پر ظلم ڈھائیں گے اور زندہ نہ چھوڑیں گے۔'' اس درخواست کو پاکر سلطان نے قلعے کا محاصرہ جاری رکھا اور فتح کے بعد مسلمان تاجروں کا مال انھیں واپس کیا۔

کشمیر میں اسلامی سلطنت:

'تاریخِ کشمیر' کے مطابق ۱۳۰۷ء میں راجہ سہدیو نے کشمیر کی عنانِ حکومت سنبھالی۔ اس نے رام چندر نام کے ایک شخص کو فوج کی سپہ سالاری کا منصب عطا کیا۔ راجہ سہدیو کی تخت نشینی کے تقریباً بارہ سال بعد ایک سیاح مع اہل وعیال بارہ مولہ پہنچا اس کا نام شاہ میر تھا اور مذہبِ اسلام کا پیروکار تھا۔ یہ سوات کا باشندہ تھا اور نقل مکانی کر کے کشمیر آیا تھا۔ شاہ میر عابد وزاہد اور متقی قسم کا انسان تھا۔ راجہ نے الطافِ خسروانہ سے کام لیتے ہوئے اسے موضع دارہ ویر کی جاگیر عطا کی اور اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔ اسی زمانے میں تبت کا ایک شہزادہ بھی ترک وطن کر کے کشمیر

میں وارد ہوا، اس کا نام رنجن دیو یا رنچن دیو تھا۔ یہ اپنے چچا کے ظلم سے پریشان ہو کر کشمیر آیا تھا، جو تبت کا راجہ تھا۔ رنجن دیو نے رام چندر کی معرفت راجہ سہد یو تک رسائی حاصل کی۔ راجہ نے بکمالِ حوصلگی اسکے لئے بھی خزانہ شاہی سے وظیفہ مقرر کر دیا۔ راجہ نیک سیرت، فیاض اور عادل تھا مگر عوام مذہب سے بیزار تھے اور نیک وبد کی تمیز نہیں رکھتے تھے۔ اسی دوران ۱۳۲۳ء میں ایک تاتاری سردار ذولچو نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ ذولچو کو مورخین نے ذوالقدر خان بھی لکھا ہے۔ (یہ شاید ذولچو کا معرب ہے) یہ تاتاری قہر خداوندی بن کر جنتِ ارضی کے باشندوں پر ٹوٹا تھا۔ اس سے قبل اس نے پنجاب میں لوٹ مار کی تھی اور اس کے قتل وخونریزی کی داستان کشمیریوں تک پہنچ چکی تھی۔ راجہ سہد یو میں اس کے مقابلے کی تاب نہ تھی لہٰذا وہ راجدھانی چھوڑ کر بھاگ گیا۔ پورے ملک میں افراتفری مچ گئی اور اس نے آبادیوں میں آگ لگانا شروع کر دیا۔ جو لوگ سامنے آتے ان کے گھروں کو لوٹ کر انھیں قتل کر دیا جاتا۔ عورتوں اور بچوں کو بردہ فروشوں کے حوالے کر دیا جاتا۔ یہ سلسلہ لگ بھگ آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ موسمِ سرما شروع ہونے سے قبل ذولچو نے وادی سے باہر نکل جانا چاہا اور جو قیدی ساتھ تھے انھیں مال ومتاع کے ساتھ لے کر چل پڑا۔ ابھی کلہ کوہ کے مقام تک وہ پہنچا تھا کہ زبردست بارش اور زالہ باری شروع ہوگئی۔ اسی کے ساتھ موسم کا مزاج بدلا اور برف باری نے ذولچو کو تمام قیدیوں سمیت زندہ دفن کر دیا۔

ذولچو کے حملہ کے دوران رام چندر ہزاروں پناہ گزینوں کے ساتھ اپنے قلعے میں بند رہا مگر اس کے کیفرِ کردار تک پہنچنے کے بعد لوگ قلعے سے باہر آئے اور زندگی کی شروعات کی۔ اب کوئی مستقل حکومت کشمیر میں نہیں تھی اور نہ کوئی نظام باقی رہا تھا۔ ہر طرف بدانتظامی اور جنگل راج تھا۔ آئے دن کوہستانی علاقوں کے لٹیرے حملہ کر کے لوٹ پاٹ کرتے رہتے تھے۔ ذولچو کے حملہ کے بعد آبادی بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ ایسے میں لوگ رام چندر کے پاس فریاد لے کر آئے تو اس نے رنجن دیو کی سرکردگی میں ایک چھوٹا سا لشکر لٹیروں کی سرکوبی کے لئے بھیج دیا۔ رنجن دیو نے نہایت بہادری کے ساتھ ملک میں امن وامان قائم کر دیا۔ اسی کے ساتھ اس کی مقبولیت بھی عوام میں بڑھ گئی اور لوگوں نے اسکی مالی معاونت بھی کی۔ رنجن دیو نے عوامی مقبولیت دیکھی تو اقتدار کی

ہوس دل میں پیدا ہوگئی اور سازش کے تحت اس نے رام چندر کو قتل کرا کر خود تخت نشیں ہو گیا۔ اس نے رام چندر کی بیٹی کوٹہ رانی سے شادی کر لی اور آرام سے حکومت کرنے لگا۔ راجہ سہدیو نے دوبارہ اپنی حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ رنجن دیو نے شاہ میر کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور امور سلطنت کی ذمہ داری اس کے سر پر ڈال دی۔

راجہ رنجن دیو کا قبولِ اسلام:

رنجن شاہ یا راجہ رنجن دیو کا آبائی مذہب بدھ ازم تھا مگر وہ اپنے مذہب سے مطمئن نہیں تھا۔ اسے کسی ایسے مذہب کی تلاش تھی جو اسے روحانی طمانیت عطا کرے۔ وہ شاہ میر کو اسلامی طریقے سے عبادت کرتے دیکھتا اور اسلام کے متعلق جانکاری حاصل کرتا تھا۔ اس طرح اس کی دلچسپی اسلام میں بڑھتی گئی۔ ایک دن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کر دے گا۔ اسی دوران ایک صبح اس نے اپنا دریچہ کھولا تو ایک مسلمان صوفی پر اسکی نظر پڑی جو نماز فجر ادا کر رہا تھا۔ اس منظر نے اسے بہت متاثر کیا۔ وہ پہلے ہی اسلام سے آشنا تھا مگر اس درویش کی زیارت نے اس کے دل کی دنیا کو زیر زبر کر کے رکھ دیا۔ راجہ نے صوفی کو اپنے محل میں بلوایا اور مع اہل وعیال اس کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ راجہ کا اسلامی نام صدرالدین رکھا گیا۔ مذکورہ صوفی حضرت سید شرف الدین تھے، جنکا لقب بلال شاہ تھا اور کشمیر میں بلبل شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

راجہ رنجن دیو کے قبول اسلام کے ساتھ ہی کشمیر میں اسلام کی تیزی سے اشاعت شروع ہوگئی۔ اس کے ہزاروں امیروں، رئیسوں اور فوجیوں نے اسلام قبول کیا مگر سرکاری زبان سنسکرت رہی اور حکومت کے معاملات پنڈتوں کے ہاتھ میں ہی رہے۔ راجہ بے حد وسیع القلب تھا۔ وہ کسی کے مذہب سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا تھا، مگر حق پسند بھی تھا لہٰذا اسلام کی تعلیمات جب اس تک پہنچیں تو اس نے بلا چوں وچرا قبول کر لیا۔ راجہ کا یہ قدم سیاسی لحاظ سے غیر دانشمندانہ تھا کیونکہ عوام کی اکثریت ہندو یا بدھ مذہب کی پیروکار تھی، مسلمان اکا دکا ہی کشمیر میں نظر آتے

تھے مگر یہ راجہ کی حق پسندی تھی کہ اس نے جب اسلامی تعلیمات کو درست پایا تو اسلام قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

کشمیر کا پہلا صوفی:

راجہ رنجن دیو یا سلطان صدرالدین کے عہد سے قبل کشمیر میں مسلمان لائقِ اعتنا تعداد میں نہیں تھے اور نہ ہی کسی صوفی کے یہاں آنے کے تاریخی شواہد ملتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ایک دو صوفیہ پہلے بھی آئے ہوں مگران کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا لہٰذا حضرت بلبل شاہ کو ہی کشمیر کا پہلا صوفی سمجھنا چاہئے۔ آپ کے ذریعے جو کشمیر میں تصوف کی بنیاد پڑی وہ اتنی پختہ ثابت ہوئی کہ بعد میں اسی پر شاندار عمارت تیار ہوئی۔ ایسی عمارت جو آج بھی قائم ودائم ہے اور انشاء اللہ صبح قیامت تک قائم رہے گی۔ کشمیری آج بھی اہل تصوف سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں اور ان کی خانقاہوں اور مزارات کو نگاہِ احترام سے دیکھتے ہیں۔ بزرگان دین کے مزارات آج بھی کشمیر میں عوام کی عقیدت کا مرکز ہیں۔

تہذیبی انقلاب:

راجہ رنجن دیو کے قبولِ اسلام کا واقعہ کشمیر کی تاریخ کا سنگِ میل ہے۔ اس واقعے نے تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔ حالات کے دھارے کو بدل ڈالا اور لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کردیا۔ اس کے بعد کشمیر کی تہذیب بدلنے لگی اور ہر شئے پر اسلامی اثرات مرتب ہونے لگے۔ یہ محض سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ ثقافتی، معاشرتی اور لسانی انقلاب بھی تھا۔ اس کے بعد کشمیر کے حالات جس رفتار سے بدلے وہ بھی کم حیران کن نہ تھے۔ راجہ نے اپنے محل کے پاس ایک مسجد اور خانقاہ بنوائی۔ یہ وادی کشمیر کی پہلی باضابطہ مسجد اور خانقاہ تھی جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ممکن ہے یہاں اگر پہلے مسلمانوں کی آبادی ہوگی تو مسجد بھی ہوگی مگر یہ وہ مسجد تھی جس کا تذکرہ باقاعدہ ملتا ہے۔ حضرت بلبل شاہ کے حکم سے اسی خانقاہ سے لنگر بھی جاری ہوا جو اب بھی لنگر بابا بلبل شاہ

کے نام سے مشہور ہے۔ خانقاہ کے مصارف کے لئے کچھ گاؤوں کی آمدنی وقف تھی جو بہت بعد تک جاری رہی۔ بلبل شاہ کا تعلق سہروردی سلسلے سے تھا اور وہ شاہ نعمت اللہ شیرازی کے مرید تھے۔ بعض تاریخی روایتوں کے مطابق وہ تاتاری حملوں سے بچنے کے لئے کشمیر آئے تھے ۱۳۲۶ء میں بلبل شاہ کا انتقال ہوگیا مگر اس کے بعد بھی صوفیہ کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ کشمیر کی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں انقلابِ عظیم برپا کرنے والے رنجن دیو کا بھی ۱۳۲۷ء میں انتقال ہوگیا۔

شاہ میر کی تاج پوشی:

راجہ رنجن دیو یا سلطان صدرالدین نے اپنے پیچھے ایک بیٹا چھوڑا تھا، جسکی عمر چودہ سال تھی۔ بیٹے کا نام حیدر خان تھا لہٰذا تخت وتاج کے لئے ایک بار پھر تنازعہ شروع ہوگیا۔ سلطان کی بیوہ کوٹہ رانی بے حد قابل، باصلاحیت اور سیاسی سوجھ بوجھ والی عورت تھی۔ اس نے پہلے تو حیدر خاں کو تخت پر بیٹھایا مگر جب اعیانِ دولت نے مخالفت کی تو اس نے راجہ سہدیو کے بھائی اودیان دیو سے شادی کر کے اسے مسند آرائے سلطنت کیا۔ اس نے شاہ میر کو وزارت کا منصب عطا کیا اور حکومت کے کام کاج خود دیکھنے لگی۔ تقریباً پندرہ سال حکومت کرنے کے بعد اودیان دیو کا بھی انتقال ہوگیا تو اب کوٹہ رانی نے اپنے بھائیوں کی مدد سے خود مختار حکومت کی بنیاد ڈالی مگر حکومت کے ارکان نے مخالفت شروع کردی۔ تقریباً پچاس دن تک کوٹہ رانی کی حکومت چلی، اس دوران پورے ملک میں افراتفری پھیلی رہی۔ پھر امیروں اور رئیسوں نے اتفاقِ رائے سے شاہ میر کو حکمراں چن لیا اور عوام نے بھی اطاعت کی۔ کوٹہ رانی کے کچھ حامیوں نے مخالفت کی اور مقابلے پر آئے تو قتل ہوئے۔

شاہ میر، سلطان شمس الدین کے لقب سے تخت نشیں ہوا اور کوٹہ رانی اندرکوٹ میں بیٹھی حکومت حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ سلطان نے اس مخالفت کے خاتمے کی یہ تدبیر سوچی کہ وہ کوٹہ رانی سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ رکھے مگر اس نے انکار کردیا۔ بعد میں اس نے مصلحت کے تحت سلطان سے شادی کرلی اور سرینگر آگئی، لیکن مسلسل محرومیوں کی شکار کوٹہ رانی

نے کچھ ہی دن بعد خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔

سلطان شمس الدین کو ہی کشمیر میں اسلامی سلطنت کا بانی سمجھنا چاہیئے کیونکہ راجہ رنجن دیو اگرچہ کشمیر کا اولین مسلم حکمراں اور بانیٔ اول بھی تھا مگر اس کے بعد حکومت کی بنیاد کمزور پڑ گئی تھی اور راجہ کے انتقال کے بعد وہ جوش وخروش بھی باقی نہیں رہا تھا جو شروع میں تھا۔ حالانکہ اس دوران بھی اسلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا اور سلطان شمس الدین کی تخت نشنی نے ایک بار پھر پرانے جوش اور ولولے کو بیدار کر دیا تھا۔ نیز یہ حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم ہوئی تھی اور سلطان کا خاندان یہاں ایک طویل مدت تک حکمراں رہا۔

شاہ میر کا سفر:

کشمیر میں اسلامی سلطنت کے بانی شاہ میر عرف سلطان شمس الدین کا اصلی وطن افغانستان کا علاقہ سوات تھا۔ اسکی کشمیر میں آمد ایک مسافرِ بے مایہ کی طرح ہوئی تھی اور اس نے ترقی کرتے ہوئے یہاں کی سلطنت حاصل کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب پورے بھارت پر خلجی اور تغلق خاندان حکومت کر رہے تھے۔ 'تاریخ کشمیر' (محمد دین فوق) کے حاشیئے کے مطابق شاہ میر کے جدامجد ایک خدارسیدہ بزرگ اور صاحبِ کشف وکرامت صوفی تھے۔ ان کا نام سائیں قور شاہ تھا۔ جب قور شاہ کے بیٹے شاہ طاہر کے یہاں شاہ میر کی پیدائش ہوئی تو انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بچہ کشمیر کا بادشاہ بنے گا اور اسی کی اولاد صدیوں تک حکومت کرے گی۔ شاہ میر نے بڑے ہو کر یہ پیشین گوئی سنی تو اپنے اہل وعیال کے ساتھ کشمیر کا رختِ سفر باندھا اور بے سروسامانی کے عالم میں یہاں پہنچے اور ایک دن وہ آیا جب کشمیر کی حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی۔ ایسا تاریخ میں کم ہوا ہے جب کوئی معمولی سپاہی ترقی کرتا ہوا نپولین بونا پارٹ یا صدام حسین بنا ہو یا کوئی غلام ترقی کرتا ہوا سبکتگین والتمش بنا ہو۔

شاہ میر نے سلطان شمس الدین بننے کے لئے کشمیر میں بیس سال گزارے۔ حالانکہ اس کی حکومت محض تین سال پانچ مہینے رہی مگر اس درویش صفت بادشاہ نے کشمیر میں انقلاب برپا

کر دیا۔ رنجن دیو کا قبولِ اسلام شاہ میر کی کوشش کا ہی نتیجہ تھا اور اس نے اپنی وزارت کے ایام میں رعایا کا بھرپور خیال رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ میر کو تخت نشینی کے بعد عوام کو اپنے ماتحت لانے میں زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ رعایا پہلے ہی سے گرویدہ تھی۔ شاہ میر کی شخصیت میں چونکہ درویشانہ خصائل تھے لہٰذا اس نے عوام کو عیال اللہ سمجھا اور اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں ان کے لئے جو بھی ممکن تھا کیا۔ عوام پر ٹیکس کا بوجھ پہلے ہی کم تھا مگر اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اس میں مزید کمی کر دی۔ اس نے عدل وانصاف سے کام لیا اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ نیک برتاؤ کیا۔

اسلام کشمیر میں قلندرانہ لباس میں پہنچا اور اسے یہاں تک لانے والے شاہ میر اور بلبل شاہ جیسے وہ نیک دل افراد تھے جن کا اصولِ زندگی 'دست در کار و دل در یار' تھا۔ ان کے عقائد واعمال نے عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ انھوں نے اپنے آرام وآسائش کا خیال کئے بغیر اللہ کی مخلوق کے لئے کام کیا۔ مسجدیں بنوائیں، خانقاہیں تعمیر کرائیں، لنگر جاری کئے، مسافر خانے بنوائے اور عوام کو فائدہ پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ دین کی بنیاد اگر تشدد پر ہوتی تو یہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا مگر اسکی بنیاد عدم تشدد، انسانی مساوات، بھائی چارہ، اخلاق اور محبت پر قائم ہے اور اسے فنا نہیں۔

❖○❖

اس مضمون میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ تاریخِ کشمیر (محمد دین فوق)
۲۔ تاریخِ فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ)
۳۔ برصغیر میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ (مفتی محمد مشتاق تجاروی)
۴۔ چچ نامہ
۵۔ THE PREACHING OF ISLAM

بندہ قیامت کے دن اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

(حدیث)

تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ اِن خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اقبالؔ

شاہ ہمدان: جنھوں نے کشمیر کو چمن زار تصوف بنا دیا

تصوف کی غرض و غایت انسان کو انسانِ کامل بنانا ہے، اسے اخلاق اللہ سے مزین اور اوصاف اللہ سے متصف کرنا ہے۔ شاہ ہمدان خود ان خوبیوں سے متصف تھے اور نہ جانے کتنے لوگوں کو ان اوصاف کا حامل بنا دیا۔ کشمیر میں عشق و عرفان کی جو ضیا پاشیاں ہوئیں ان میں بہت بڑا حصہ شاہ ہمدان کا تھا۔ وہ چراغ جو حضرت بلبل شاہ نے روشن کیا تھا، شاہ ہمدان نے اسے مشعل بنا دیا اور جس سے کئی دوسری مشعلیں بھی روشن ہوئیں۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پورے کشمیر میں ہدایت و معرفت کے ہزاروں چراغ جل اٹھے اور وادی سے جہالت و گمرہی کے اندھیرے دور ہونے لگے۔

شاہ ہمدان کون؟:

شاہ ہمدان کا اصل نام سید علی ہمدانی تھا۔ انھیں علی ثانی اور امیر کبیر کے لقب سے بھی یاد

کیا جاتا ہے، لیکن کشمیری عام طور پر انھیں شاہ ہمدان کے نام سے پکارتے ہیں۔ آپ ایران کے علاقہ ہمدان کے رہنے والے تھے اور ایک حسنی سادات خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ظاہری اور باطنی علوم میں بے مثال اور تقویٰ و پرہیزگاری میں لاثانی تھے۔ عبادت و ریاضت، ذکر و فکر آپ کا شعار تھا۔ کبھی خلوت گزیں ہو کر عبادت میں مصروف رہتے تو کبھی حکمِ الٰہی سیرو افی الارض کی تعمیل کے لئے لمبے سفر پر نکل پڑتے۔ اکیس سال تک دنیا کی سیر کرتے رہے اس دوران سینکڑوں اولیاء، ہزاروں علماء اور بے شمار ماہرین علوم و فنون سے ملاقاتیں کیں۔ یہ امیر تیمور کا ابتدائی دور تھا اور یہ ظالم سردار جب آپ کے درپئے آزار ہوا تو سات سو مریدین کی جماعت کے ساتھ شہر سے نکل پڑے۔ شاہ ہمدان اپنے مریدین کے ساتھ ۱۳۷۲ء میں پہلی بار کشمیر تشریف لائے۔ یہ سلطان شہاب الدین کا عہد حکومت تھا۔ وہ دوسری بار سلطان قطب الدین کے دور حکومت میں ۱۳۷۹ء میں آئے۔ پہلے سفر میں چھ ماہ اور دوسرے سفر میں تقریباً ڈھائی سال ان کا وادی میں قیام رہا۔ وہ تیسری بار ۱۳۸۵ء میں یہاں آئے مگر چند دن میں ہی خرابی صحت کی وجہ سے واپس ہو گئے۔ شاہ ہمدان رحمہ اللہ علیہ نے اپنے تینوں سفروں کے درمیان تقریباً تین سال کشمیر میں گزارے۔ تین سالکی مدت یوں تو بہت قلیل ہوتی ہے مگر جذبۂ صادق نے ان تین برسوں کے اندر جو کارنامے انجام دیئے وہ تین صدیوں تک ممکن نہ تھا۔ شاہ ہمدان نے اپنے چند روزہ قیامِ کشمیر کے دوران جو اثرات چھوڑے وہ بہت عظیم اور دیرپا تھے۔ انھوں نے نہ صرف مذہبی انقلاب برپا کیا بلکہ صنعتی، معاشی اور معاشرتی انقلاب بھی برپا کیا جس کے اثرات بعد میں کشمیریوں کی زندگی پر مزید گہرے ہو گئے اور آج بھی کشمیر کی تہذیب میں شاہ ہمدان کی تحریک کا رنگ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

مصلحِ کشمیر:

شاہ ہمدان چونکہ ایک صوفی کے ساتھ ساتھ ایک عالم و فاضل اور باتدبیر انسان تھے لہٰذا ان کا ہر کام بے حد منظم طریقے سے انجام پایا اور انھوں نے بہت تھوڑی مدت میں وہ کر دکھایا جس

کے لئے شاید صدیاں بھی کم پڑ جاتیں۔آپ کا بڑا کارنامہ تو یہ رہا کہ وہ ہزاروں لوگ جنھوں نے بابا بلبل شاہ کی تعلیمات سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرلیا تھا مگر ان کی اصلاح نہیں ہو پائی تھی ان میں سے چند زندہ تھے ان کی اصلاح کی۔اسی کے ساتھ ان کے بعد کی نسل جو اسلامی تہذیب وتمدن سے ناآشنا تھی اسے آپ نے اسلامی روح سے آشنا کرایا۔ان کی ظاہری اور باطنی اصلاح کے لئے سلسلہ تصوف کی شروعات کی۔آپ سلسلہ کبرویہ سے تعلق رکھتے تھے۔آپ کی کشمیر آمد سے اس سلسلۂ طریقت کو وادی میں پھیلنے کا موقع ملا اور عوام کو روحانیت کے قریب لاکر ان کی اصلاح کا کام شروع کیا۔وہ غلط اور غیر اسلامی رسوم ورواج جو کشمیر کے نومسلموں اور ان کی اولاد میں رائج تھے،شاہ ہمدان کی جدوجہد سے ان کی روک تھام ہوئی۔عام لوگوں کی مستقل تعلیم وتربیت کے لئے ان کی کوششوں سے مدرسوں کا قیام عمل میں آیا،جن کے فارغین نے دوسروں کی ہدایت ورہنمائی کی اور خود بھی مدرسے قائم کئے۔شاہ ہمدان کی خواہش تھی کہ وادی میں بڑے پیمانے پر مدرسے قائم ہوں جہاں قرآن وحدیث کا درس دیا جائے۔اس مقصد کی تکمیل کے لئے مدرسۃ القرآن کا قیام عمل میں آیا۔آپ کے ساتھیوں میں علوم اسلامیہ کے ماہرین بھی تھے انھیں کے ذمے مدرسے کی خدمت سونپی گئی اور اس مدرسے کے پہلے ناظم ابوالمشائخ مولانا محمد سلیمان علیہ الرحمہ کو بنایا گیا۔انھیں امام القراء کے خطاب سے نوازا گیا اور ان کی نگرانی میں ماہرین علومِ اسلامیہ نے طلباء کی تعلیم وتربیت کا کام شروع کردیا۔

حضرت شاہ ہمدان کی تحریک پر ایک اور مدرسہ قائم ہوا جس کا نام عروۃ الوثقیٰ تھا۔اس مدرسے کے لئے سید جمال الدین محدث رحمۃ اللہ علیہ نے خاص طور پر جدوجہد کی۔وہ خود دینی علوم کے ماہر تھے اور یہاں طلباء کی تعلیم وتربیت کیا کرتے تھے۔یہاں سینکڑوں تشنگان علم ایک ساتھ علم حاصل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ایک تعلیمی ادارہ خود سلطان قطب الدین نے قائم کیا تھا جسمیں دور دراز کے طلباء علم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔اس مدرسے کی ذمہ داری بھی شاہ ہمدان کے رفقاء میں سے ایک بزرگ کے سپرد تھی۔اس مدرسے کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔یہاں دور دراز علاقوں سے طلباء آیا کرتے تھے جن کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کی ذمہ داری سرکار

اٹھایا کرتی تھی۔ یہ ادارہ سیکڑوں سال تک کام کرتا رہا اور سکھوں کے دور میں تباہ ہو گیا۔

شاہ ہمدان علیہ الرحمہ اپنے عہد میں میدانِ تصوف کے شہسوار تھے۔ جن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا انکی تعداد شمار سے باہر ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق صرف کشمیر میں ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد سینتیس ہزار (۳۷۰۰۰) سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیریوں کی بڑی تعداد آج بھی ان سے بے حد عقیدت رکھتی ہے اور ان کی خانقاہ جسے خانقاہ معلیٰ کہا جاتا ہے، اسے لوگ عقیدت سے کعبۂ ثانی کہتے ہیں۔ یہ کشمیر کی ان دو مقدس جگہوں میں سے ایک ہے، جہاں عوام کا ازدہام ہوتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ عقیدت سے جمع ہوتے ہیں۔

اقتصادی رہنما:

شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ نے کشمیریوں کی نہ صرف روحانی اور علمی سرپرستی کی بلکہ انھیں معاشی اور اقتصادی طور پر بھی مضبوط کیا۔ انھوں نے کئی ایسی دستکاریوں اور صنعتوں وحرفتوں سے وادی کے لوگوں کو روشناس کرایا جس سے یہ ناواقف تھے۔ یہی دستکاریاں اب کشمیر کی پہچان بن چکی ہیں اور ان کی تجارت سے ملک کو سالانہ کروڑوں روپئے کا زرمبادلہ آتا ہے۔ قالین سازی، شال بافی، پارچہ بافی، ظروف سازی، تذہیب اور خطاطی ایسے فنون تھے جن سے اہل کشمیر اب تک نا آشنا تھے۔ شاہ ہمدان اور ان کے رفقاء کے ذریعے پہلی بار وادی کے باشندے ان فنون سے آشنا ہوئے۔ آپ کے ہمراہیوں میں ہر قسم کے افراد تھے۔ جو لوگ ان فنون کی جانکاری رکھتے تھے انھوں نے کشمیریوں کو سکھایا اور اہلِ کشمیر نے اس میں مہارت حاصل کی نیز اسے اگلی نسل کو منتقل کیا۔ یہ تمام فنون اب کشمیریوں کی معاشرتی زندگی کا اہم ترین حصہ ہیں اور ان کی معاشیات کے ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ کشمیری شال اور گرم کپڑے ساری دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہاں میشے پیپر سے برتن اور دوسری چیزیں بنا کر اس پر نقش ونگار کیا جاتا ہے اور اسے ساری دنیا میں فنکاری کے نمونے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ سامان ہر بڑے اور عالیشان ڈرائنگ روم کی زینت ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال صرف سجاوٹ کے لئے کیا جاتا ہے۔ کشمیری

خطاطی بھی اپنی باریکی اور ندرت کے لئے مشہور ہے۔اسی طرح خطاطی میں سونے کے پانی کا استعمال بھی ایرانیوں کی ایجاد ہے، جو کشمیر میں عام ہوا۔ان فنون کے علاوہ بھی کئی فنون تھے جو شاہ ہمدان اوران کے رفقاء اپنے ساتھ کشمیر لائے تھے۔یہ تمام فنون آج کشمیر کی شناخت بن چکے ہیں اورانھیں اب کشمیر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔آج بھی کشمیر کی دستکاریوں پر ایرانی اثرات بہت واضح ہیں۔کشمیر میں آکران میں کچھ وقت اور حالات کے مطابق بدلاؤ ضرور آیا مگراس کی بنیادی باتیں آج بھی وہی ہیں۔ان کے اصلی خطوط اور نقش میں فرق نہیں آیا ہے۔ایرانی صوفیہ کے ذریعے کشمیر میں فارسی زبان وادب بھی آیا اوراسے کشمیری مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی اپنایا۔یہاں فارسی کے جو معتبر شعراء گزرے ہیں ان میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہی شامل ہیں۔یہی ایرانی اثرات تھے جن کے سبب اس سرزمین کو ایرانِ صغیر کہا جانے لگا آج بھی کشمیر پر ایرانی اثرات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔یہاں کی زبان میں فارسی کے الفاظ اور تراکیب شامل ہیں۔یہاں کھانے پینے کی چیزیں بھی ایرانی رنگ میں رنگ گئیں اور جو خاص کھانے کی ڈشیز ایران میں پکائی جاتی ہیں وہی کشمیریوں کے باورچی خانے کی زینت بھی بنیں۔یہاں تک کہ کشمیر میں ان کے نام تک نہیں بدلے۔شاہ ہمدان کے انھیں اثرات کو دیکھتے ہوئے مشہور کشمیری پنڈت شاعر علامہ اقبال نے 'جاوید نامہ' میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

سید السادات سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیرِ امم

تا غزالی درسِ اللہ ہو گرفت
ذکرِ او از دودمان او گرفت

مرشدِ آں کشورِ مینو نظیر
میر درویش سلاطیں رامشیر

خطہ را آں شاہ دریا آستیں
داد علم وصنعت وتہذیب ودیں

آفرید آں مرد ایرانِ صغیر

باہنر ہائے غریب ودلپذیر

یک نگاہ او کشاید گرہ

خیزوتیرش رابدل راہی بدہ

امام تصوف:

شاہ ہمدان بنیادی طور پر ایک صوفی تھے اور کبروی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ محمود المز دقانی سے بیعت تھے۔ انھیں سے خرقۂ خلافت بھی حاصل ہوا تھا۔ وہ اسی سلسلے میں طالبانِ حق اور سالکانِ معرفت کی تربیت کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''ایک سالک کو چاہے کہ وہ اہل دل اور اہلِ کشف وشہود کے وارداتِ قلبی سے بہرہ ور ہو۔'' تصوف کو وادئ کشمیر کے گھر گھر پہنچانے میں آپ نے پیغمبرانہ کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آپ کو قطبِ ربانی، غوثِ صمدانی، بانئ مسلمانی اور علی ثانی کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

شاہ ہمدان علیہ الرحمہ نے ظاہرداری اور جاہ طلبی کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہیں دی اور خلوصِ نیت کے ساتھ اللہ کی مخلوق کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی پوری زندگی تصوف کی نشرواشاعت میں گزری اور لاکھوں تشنگانِ عشق وعرفان کو جامِ معرفت سے سیراب کیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں کئی کتابیں بھی تحریر کیں۔ ان کی تحریر کردہ بیشتر کتابیں تصوف کے موضوع پر ہیں۔ منازل السالکین، دہ قاعدہ، مودۃ القربیٰ، منہاج العارفین،، مقامِ صوفیہ، درویشیہ، حلِ مشکل، فضل الفقراء، صفۃ الفقراء، تلقینیہ، عقبات، منامیہ،، ہمدانیہ اور رسالہ فی آداب الشیوخ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ سبھی کتابیں تصوف کے موضوع پر ہیں۔ ان کی کل تصانیف ایک سودس کے قریب ہیں۔ جن میں بیشتر فارسی میں ہیں کچھ کتابیں عربی میں ہیں۔ ان تمام نگارشات کا مقصد سالکانِ راہ طریقت کی رہنمائی ہے۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی تحریروں کو سمجھنے والے ایک

صدی بعد پیدا ہونگے۔

شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ تھا کہ جس طرح انسانی سانسیں بے شمار ہیں اسی طرح خدا تک رسائی کے راستے بھی بے شمار ہیں، لیکن یہ راستے تین طریقے سے کھلتے ہیں۔ پہلا طریقہ اربابِ معاملات کے لئے ہے، یعنی لین دین میں دیانتداری کا خیال رکھنا۔ نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کی ادائیگی کرنا۔ یہ عام مسلمانوں کا راستہ ہے۔ دوسرا راستہ اربابِ مجاہدہ کا ہے۔ یہ راستہ بری عادات کو بدل ڈالنے، کثرت کے ساتھ مجاہدہ، نفس کشی اور تزکیہ قلب سے کھلتا ہے۔ تیسرا طریقہ طالبانِ حق اور عارفین کا ہے، جو توبہ توکل، زہد، قناعت، مراقبہ اور صبر رضا کا راستہ ہے۔ اس راستے پر چلنے والوں کو جلد وصالِ حق حاصل ہوتا ہے۔

شاہ ہمدان، نظریۂ وحدت الوجود کے قائل تھے یعنی ان کا مسلک تھا کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت ہے، جس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ عام لوگ اسے سمجھنے سے قاصر ہیں لہٰذا وہ اختلاف کا شکار ہیں۔ وہ اولیاء اللہ کے سینوں کو انوارِ الٰہی کا مظہر اور اسرارِ الٰہی کا سمندر سمجھتے تھے۔ وہ ابنِ عربی کے نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں اور اپنی تحریروں میں انکی تقلید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے ابنِ عربی کی تصنیف فصوص الحکم کی شرح لکھی تھی اور خود نظریۂ وحدۃ الوجود کے اثبات میں ''رسالہ وجودیہ'' تحریر فرمایا۔ کبروی سلسلے کے بیشتر صوفیہ مزامیر کے ساتھ سماع کے قائل تھے، شاہ ہمدان بھی انھیں صوفیہ میں شامل ہیں۔ اس سلسلے میں محفلِ سماع کا انعقاد عام بات ہے۔ ان محفلوں میں صوفیہ سماع کے ساتھ رقص بھی کیا کرتے تھے اور وجد وحال ان محافل کا خاص حصہ ہیں۔ ان کی متعدد تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ موسیقی کے ساتھ سماع کے قائل تھے۔

ادیب وشاعر:

شاہ ہمدان ایک زبردست عالم دین کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ عربی لٹریچر پر بھی انھیں عبور حاصل تھا اور انکی کئی تصانیف عربی زبان میں ہی ہیں۔ ان کی تحریریں اگرچہ عموماً تصوف کے موضوع پر ہیں مگر تفسیر، حدیث اور ادب پر بھی

انھوں نے خاصا لکھا ہے۔ شاہ ہمدان جہاں ایک بہترین نثر نگار تھے وہیں ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے اور علائی تخلص کرتے تھے۔ ان کی شاعری پر بھی تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور کئی بار تصوف کی باریکیوں سے ناواقف شخص کے لئے ان کے کلام کو سمجھ پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

از کنارِ خویش می یابم دمادم بوئے یار
زاں ہمی گیرم بہر دم خویشتن را در کنار
چوں کنارم را میانے نیست زاں حیرتم
کانچناں نازک میانی، ہست دایم در کنار

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

چندیں ہزار بیدل بر بوئے آں سعادت
دلہا نثار کردند، جانہا بباد دادند
مستانِ حضرتش را آرامگہ بلاشد
درصد ہزار نعمت بر بادِ دوست شادند
اربابِ ذوق درغم تو آرمیدہ اند
وزِ شادئ نعیم دوعالم رمیدہ اند
سری کز سرمعنیٰ باخبر شد
درو گنجائش شادی وغم نیست
جہاں از عکس رویش گشت روشن
اگر اعمیٰ نہ بیند ہیچ غم نیست

شاہ ہمدان جب کشمیر سے اپنے تیسرے سفر کے بعد لوٹ رہے تھے تو آپ بیمار تھے۔ افغانستان کے علاقہ ہزارہ میں تھے کہ وقت اجل آ پہنچا اور وادئ کشمیر کو بیدار کرنے والا یہ بوریہ نشیں

ہمیشہ کیے لئے خواب راحت سے ہم کنار ہو گیا۔ یہ ۱۳۸۴ یا ۱۳۸۵ء کا دور تھا مگر آپ کے جسدِ مبارک کو ترکستان کے ختلان لے جا کر دفن کیا گیا جہاں آج بھی آپ کا مزار زیارت گاہِ خلائق ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❖○❖

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ شاہ ہمدان حیات اور کارنامے (ڈاکٹر شمس الدین احمد)

۲۔ رودِ کوثر (شیخ محمد اکرام)

۳۔ برصغیر میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ

راہِ اسلام (شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء)

کلیاتِ اقبال

تذکرہ اولیاءِ کشمیر

عارف وہ کہ تو خاموش رہے اور وہ دل کی بات کہہ دے۔

(جنید بغدادی)

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمی محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اقبالؔ

عظمتِ تصوف کی نشانی میر سید محمد ہمدانی

شاہ ہمدان امیر کبیر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ نے وادیٔ کشمیر میں تصوف کی اشاعت کا جو کارنامہ انجام دیا وہ انھیں کا حصہ ہے مگر ان کے صاحبزادے سید محمد ہمدانی اور ان کے خلفاء ومریدین نے اس مشن کو مزید آگے بڑھایا۔ ان کے جو خلفاء وادی میں بس گئے تھے، ان میں ایک معروف نام میر سید حسین سمنانی کا ہے۔ آپ کو امیر کبیر نے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لئے کشمیر روانہ کیا تھا اور جب آپ نے یہاں کے حالات کا مشاہدہ کر کے انھیں مطلع کیا تو امیر کبیر یہاں تشریف لائے تھے۔ میر سید حسین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے کشمیر میں بود و باش اختیار کرلی اور اپنی باقی ماندہ زندگی تصوف کی اشاعت اور بندگانِ خدا کی خدمت میں گزار دی۔

شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے مریدین میں ایک بزرگ شیخ سلیمان کشمیری تھے، جن کا شمار وادی کے امیروں میں ہوتا تھا۔ یہ نو مسلم تھے اور قرآن مقدس حفظ کرلیا تھا۔ اپنا پرانا مذہب

چھوڑنے کی وجہ سے ان کے رشتے داران کی مخالفت کرتے تھے اور کئی بار انھیں ایذائیں دیا کرتے تھے لہٰذا یہ وطن چھوڑ کر شاہ ہمدان کی خدمت میں چلے گئے تھے۔ جب آپ کشمیر آئے تو شیخ سلیمان بھی آئے اور اب چونکہ حالات درست ہو گئے تھے لہٰذا یہیں ٹھہر کر اپنے پیر و مرشد کے مشن کو آگے بڑھانے لگے۔

خلیفہ امیر کبیر محمد کاظم نے بھی اپنے پیر و مرشد کے مشن کو آگے بڑھانے میں اہم رول نبھایا۔ آپ سید قاضی کے نام سے مشہور ہوئے اور آپ کی تحویل میں شاہ ہمدان کا کتب خانہ تھا۔ سید قاضی نے اپنا وقت لتا پور کے علاقے میں بتایا۔ یہاں کے باشندے آپ ہی کے ذریعے اسلامی تعلیمات سے آشنا ہوئے اور تصوف کا درس بھی آپ ہی کی بدولت انھیں ملا۔

شاہ ہمدان کے دیگر رفیقوں میں سید جمال الدین بخاری شامل تھے، جو بلند پایہ مفسر اور محدث تھے۔ سید احمد تھے جو متبحر عالم تھے۔ سید فخر الدین اور سید رکن الدین تھے جو فقہ کے ماہر تھے۔ سید نور الدین بدخشی، ملا قوام الدین بدخشی اور شیخ محمد الشامی اسلامی علوم کے ماہر اساتذہ و مصنفین تھے۔ ان سبھی حضرات نے وادی کشمیر کو وادیٔ تصوف بنانے میں اہم کردار نبھایا۔

وادیٔ کشمیر میں شاہ ہمدان کے مشن کو آگے بڑھانے والے کئی افراد تھے مگر سب سے زیادہ جس شخص پر یہ ذمہ داری تھی وہ تھے آپ کے صاحبزادے سید محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ۔ امیر کبیر نے انتقال سے چند روز قبل آپ کو کشمیر جانے کی وصیت کی تھی۔ سید محمد ہمدانی نے اپنے والد کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اپنی باقی ماندہ زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں تصوف کی اشاعت کرتے ہوئے گزار دیا۔ ہزاروں افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور لاکھوں نے فیوض و برکات حاصل کیے۔ آپ بھی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کشمیر آئے اور ایک روایت کے مطابق بارہ سال جبکہ دوسری روایت کے مطابق بائیس سال تک یہاں قیام فرمایا۔ سلطان سکندر کے وزیر سو یہ بھٹ کی بیٹی سے آپ نے نکاح کیا۔ اس طرح آپ کا کشمیر کے ساتھ روحانی کے ساتھ ساتھ جسمانی تعلق بھی ہو گیا۔ آپ کے تین سو رفقاء میں علماء و زہاد کی بڑی تعداد تھی جو ہر طرف پھیل گئے تھے اور عوام کی ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ ان صوفیہ نے جہاں گفتار و کردار سے تصوف کا درس

دیا وہیں مساجد و مدارس اور خانقاہوں کا سلسلہ پوری وادی میں پھیلا دیا جو لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بنیں، ان میں سے بعض آج بھی باقی ہیں اور فیوض و برکات جاری ہیں۔

نفاذ شریعت:

میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان سکندر کا زمانہ پایا۔ سلطان آپ کو اپنا پیر و مرشد مانتا تھا اور آپ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ آپ کے زیر اثر سلطان نے اپنی مملکت کے حدود میں شرعی احکام کا نفاذ کیا۔ آپ کا زور شریعت اور طریقت دونوں پر تھا لہٰذا آپ کے کہنے پر سلطان وادی میں شراب، جوا اور رقص و سرود پر پابندی عاید کردی۔ شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے برخلاف آپ مزامیر کے ساتھ سماع کے قائل نہیں تھے، لہٰذا سلطان سکندر کے عہد میں پوری وادی میں کہیں بھی موسیقی کے ساتھ سماع کی اجازت نہیں تھی۔ ڈھول اور دوسری قسم کے باجے بھی نہیں بج سکتے تھے۔ صرف فوجی باجے کی اجازت تھی۔ میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے وادی میں جہاں راہ طریقت پر چلنے والے سالکوں کی تعداد بڑھی وہیں شریعت کا نفاذ بھی سختی کے ساتھ ہوا، اور وہ غلط رسوم جن کا اب تک سماج سے خاتمہ نہیں ہوا تھا آپ کے اثر سے ان کا قلع قمع ہوا۔ خاص طور پرستی کی ظالمانہ رسم جو وادی کے ہندوؤں میں رائج تھی اسکی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی۔ اس طرح آپ اپنے والد کے سچے جانشیں ثابت ہوئے اور انکی تمنا کی برآری میں کوئی کسر آپ نے نہیں چھوڑی۔

مذہب میں جبر نہیں:

میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی اعتبار سے غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچایا اور انھیں ظلم و ستم سے بچایا۔ دراصل سلطان سکندر کا وزیر سویہ بھٹ تھا، جس نے آپ کے سامنے اسلام قبول کرلیا تھا اور اس کا نیا نام سیف الدین رکھا گیا تھا۔ یہ اپنے نئے مذہب کے معاملے میں جتنا پرجوش تھا اتنا ہی اسے اپنے پرانے مذہب سے نفرت تھی۔ اس نے کئی مندروں کو مسمار کرادیا تھا

اور غلط رسموں، رواجوں پر سختی کرتا تھا۔ اس سختی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے پرانے ہم مذہب اس کے تبدیلی مذہب کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے تھے۔ میر سید محمد ہمدانی کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے ایسا کرنے سے منع فرمادیا اور کہا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ''لا اکراہ فی الدین'' اس لئے مذہبی معاملے میں کوئی زبردستی نہیں کی جاسکتی۔ نہ کسی کا مذہب زبردستی بدلوایا جاسکتا ہے اور نہ کسی مندر کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ آپ کے حکم کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔

علمی کارنامے:

میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ قلم بزرگ تھے۔ سلطان سکندر کی فرمائش پر انھوں نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان کی بیشتر کتابیں علم تصوف میں ہیں۔ ایک رسالہ 'منطق' صرف ایک رات میں تصنیف فرمایا اور 'رسالہ سکندری' مشہور ہے، لیکن تصنیف وتالیف کی طرف بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ ان کی توجہ کا اصل مرکز مدارس، مساجد اور خانقاہیں تھیں۔ ان کے کہنے پر سلطان سکندر نے اس جانب توجہ دی اور کئی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ کشمیر کی پرشکوہ جامع مسجد بھی انھیں میں شامل ہے۔ یہ مسجد، زینہ کدل مسجد کے قریب ہے اور ساری دنیا میں اپنی طرز تعمیر کے لئے مشہور ہے۔ اسکے علاوہ ہے جسے سلطان سکندر نے اسی جگہ پر تعمیر کرایا جہاں شاہ ہمدان پہلی بار ٹھہرے تھے۔ یہ خانقاہ بھی اپنی مخصوص طرزِ تعمیر کے لئے شہرت کی حامل ہے۔ اس کی تعمیر میں سلطان نے خود اپنے ہاتھوں سے اینٹیں اٹھائیں۔ سرینگر میں مدرسہ سلطان سکندر کا قیام بھی اسی عہد میں عمل میں آیا۔

۱۳۹۷ء میں میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے کشمیر کو خیر آباد کہا اور حج کے لئے روانہ ہوئے۔ واپسی میں ختلان چلے گئے، جہاں آپ کے والدِ محترم کا مزار ہے۔ یہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے جنازے میں کشمیر کے لوگ بھی شامل تھے۔

❖○❖

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں کی مدد لی گئی ہے:

۱۔ شاہ ہمدان حیات اور کارنامے (ڈاکٹر شمس الدین احمد)
۲۔ تذکرہ اولیاء کشمیر
۳۔ واقعات کشمیر
۴۔ تاریخ کشمیر

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اقبالؔ

وادی کے رشی بزرگ اور شیخ نورالدین رشی

بابا بلبل شاہ، سید علی ہمدانی، میر محمد ہمدانی اور ان کے رفقاء نے کشمیر میں ایک روحانی ہلچل پیدا کردی تھی۔ یہ تمام صوفیاء ایران، عراق اور ترکستان کی طرف سے آئے تھے اور سلطان سکندر کے عہد میں تو صوفیاء اور علماء کی آمد میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ اس طرح کشمیر میں مکمل روحانی فضا قائم ہوگئی تھی، حالانکہ یہ سرزمین ابتدا سے ہی رشی بھومی کے طور پر مشہور رہی ہے اور اسلام سے قبل بھی یہاں مختلف مذاہب کے زہاد گوشۂ تنہائی کو آباد کئے رہتے تھے۔ مختلف سادھوسنت ترکِ دنیا کر کے ذکروفکر اور گیان ودھیان کے لئے آیا کرتے تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق کشمیر کی کھوج بھی ایسے ہی تارکین دنیا نے کی تھی اور انھیں کے ذریعے یہ خطہ آباد ہوا تھا۔ اسلامی تصوف رہبانیت کی اجازت نہیں دیتا ہے مگر یہاں بھی ذکروفکر کا حکم ہے اور مخلوق خدا کی خدمت کے ذریعے خدا تک رسائی کا تصور پایا جاتا ہے۔ شاید اسی چیز نے اہل کشمیر کو زیادہ

متاثر کیا اور انھوں نے روحانی تسکین کے لئے تصوف کو حرزِ جاں بنایا۔

مسلمان رشی:

مشرقِ وسطیٰ سے آنے والے صوفیاء کے اثرات سے کشمیر میں مقامی صوفیہ کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا، جسے لوگ بے حد احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان صوفیہ کو مسلمان رشی کہا جاتا تھا اور ہندو مسلمان دونوں ہی انھیں خدا کا برگزیدہ بندہ تصور کرتے اور محترم سمجھتے تھے۔ یہ رشی یا درویش ان نومسلموں کی اولاد تھے جنھوں نے ماضی قریب میں اسلام قبول کیا تھا۔ ایسے رشیوں میں سب سے زیادہ شہرت شیخ نورالدین کو ملی، جنھیں ہندو، نندہ رشی کہتے تھے۔ شیخ نورالدین رشی کے والد بھی ایک مسلمان رشی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، جنھیں لوگ یاسمن رشی کہتے تھے۔ ان رشیوں نے بھی وادی میں اسلام اور تصوف کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

مسلمان رشیوں پر کئی بار ہندوانہ اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں اور تصوفِ اسلامی میں ہندوانہ ویدانت کا امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر بابا داؤد خاکی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شیخ نورالدین ریشی پیرِ جمع ریشیاں
زاہد خوش بود باحق داشت بسیار اشتغال
بود با تجرید و تفرید اہلِ صوم دہر نیز
تارک لحم و بصل، شیر و عسل بسیار سال
صاحبِ کشف و کرامت بود و نطقِ خوب داشت
ہم اویسی بود گفت ایں داؤدئ صاحب مقال

مندرجہ بالا اشعار میں شیخ نورالدین رشی کی تعریف میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ وہ پیاز، گوشت، دودھ اور شہد کو بہت دنوں سے چھوڑے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ

ہندو یا بدھ مذہب کے اثرات ہیں۔ اسلام میں ان چیزوں کے چھوڑنے کا کوئی مطلب نہیں ہے، یہ حلال اور پاکیزہ ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے انھیں خود استعمال کیا اور ان کی خوبیاں بھی بیان فرمائیں۔ البتہ پیاز سے اس کی بدبو کی وجہ سے پرہیز کیا کرتے تھے۔

شیخ نورالدین رشی ۱۳۷۷ء میں پیدا ہوئے اور سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہدِ حکومت (۱۴۳۸ء) میں انتقال فرمایا۔ آپ کی قبر چرارِ شریف میں ہے، جہاں زائرین کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ شیخ کو کشمیر کا ایک بڑا ولی تصور کیا جاتا ہے۔ ریشی نامی اور نورنامہ ان کے احوال میں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں ان کے ملفوظات بھی شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے للہ عارفہ کا دودھ پیا تھا۔ للہ عارفہ خود بھی ایک مجذوب صفت عورت اور بلند پایہ شاعرہ تھی۔ شیخ نورالدین رشی اچھے شاعر تھے اور عارفانہ کلام لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے للہ عارفہ کا دودھ پیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق جب شیخ نورالدین پیدا ہوئے تو اپنی ماں کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ ان کے والد سالارالدین پریشان ہوئے اسی بیچ للہ عارفہ ان کے گھر آئی اور اپنا دودھ پلانے لگی۔ وہ کشمیری زبان میں کہہ رہی تھی' جب پیدا ہونے میں شرم محسوس نہیں کی تو دودھ پینے میں کیا عار؟'

للہ عارفہ:

للہ عارفہ کو ایک صوفی اور شاعر کے طور پر بہت شہرت حاصل ہوئی۔ وہ تارک الدنیا تھی اور پوری زندگی تزکیۂ نفس کرتی رہی۔ للہ عارفہ نے عرفان حق کے لئے دنیا اور اسکی لذتوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ہزاروں افراد کو ہدایت کی روشنی عطا کی۔ للہ عارفہ کی شاعری آج بھی کشمیر میں پسند کی جاتی ہے۔ اس کی شاعری میں عرفانِ ذات کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے شعر وسخن میں جامِ معرفت پیش کرتی تھی۔ روایت ہے کہ للہ عارفہ کی پیدائش ۱۳۳۵ء میں سرینگر سے قریب پاندرتھان نامی گاؤں میں ہوئی تھی۔ وہ ایک زمیندار ہندو خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی ایک جاہل کسان سے ہوگئی

تھی، جو پام پور کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنی ظالم ساس کے مظالم سہے اور ایک دن سب کچھ چھوڑ جنگل کی طرف بھاگ نکلی۔ اس کا مستقل ٹھکانہ کشمیر کی وادیاں تھیں۔ وہ کسی بھی ویران اور سنسان مقام پر سجدہ ریز نظر آتی تھی۔ اسے نہ تو جنگلی جانوروں سے خوف تھا اور نہ وہ ہی کھانے پینے کا ہوش رہتا تھا۔ وہ سجدے سے سر اٹھاتی تو نظم گنگنانے لگتی۔ اس کے اشعار کشمیری صوفیانہ شاعری کا بیش بہا خزانہ ہیں۔

للہ عارفہ کو ابتدا ہی سے صوفیاء سے لگاؤ تھا۔ اس نے سید حسنین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ انھوں نے ہی اس کی روحانی رہنمائی فرمائی تھی اور صوفیانہ طریق سے آگاہ کیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق مخدوم جہانیاں جہاں گشت حضرت جلال الدین بخاری کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے سلام عرض کیا تھا۔ ان تمام روایتوں کے برعکس ہندوؤں کی للہ کے بارے میں الگ روایتیں ہیں۔ اسکی جس طرح سے مسلمانوں میں مقبولیت ہے اسی طرح ہندوؤں میں بھی مقبولیت ہے۔ ہندو اس کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ وہ ہندو ہی رہی۔ اس کا اصل نام للیشوری تھا۔ وہ ہندو ماں باپ کی اولاد تھی اور ہندو سے ہی اس کی شادی ہوئی۔ وہ سمادھی لگا کر بھگوان کی پوجا کرتی تھی اور پربھو پریم میں یوگیوں کی طرح دم سادھ کر، آنکھیں بند کر کے کھو جایا کرتی تھی۔

للہ عارفہ کی موت بھی متنازعہ رہی۔ اس کی موت کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس کی آخری رسومات پر تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ہندو میت کو جلانا چاہتے تھے اور مسلمان اسلامی طریقے پر دفن کرنا چاہتے تھے۔ جب چادر ہٹائی گئی تو وہاں لاش نہیں تھی صرف چند پھول رکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کا ماننا ہے کہ للہ کو اسلامی طریقے پر دفن کر دیا گیا تھا اور اس کی قبر آج بھی وج برور کی جامع مسجد کے باہر ہے، جہاں لوگ زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

للہ عارفہ کے حالات زندگی اور اس کے تئیں عوام کی عقیدت کے واقعات سے اس دور کے روحانی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ یقیناً ایک زبردست قسم کا روحانی ماحول اور تصوف کی فضا وجود میں آ چکی تھی، جس کی قید میں یہاں رہنے والا ہر فرد تھا۔ یہاں ہر فرد صوفی تھا یا صوفیاء

کا عقید تمند۔

رشیوں کی کثرت:

کشمیر میں رشی بزرگوں کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ ان کا دور صدیوں پر محیط ہے اوران کی تعداد بھی حدوحساب سے باہر ہے۔ جہانگیر کی توزک کے مطابق اس کے دور میں تقریباً دو ہزار ریشی بزرگ موجود تھے، جن کے گرد لوگوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ یہ نفس کشی ،تقویٰ اور پرہیز گاری کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کی تعلیمات سے متاثر ہوکر روزانہ سینکڑوں افراد دامنِ اسلام سے وابستہ ہوتے تھے۔ رشی بزرگوں میں سب سے زیادہ شہرت نورالدین رشی کو حاصل ہوئی، جن سے ایک دنیا نے فیض حاصل کیا اور ہزاروں افراد کے قلوب نورِ ایمان سے منور ہوئے۔ آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ آپ کے انتقال کے صدیوں بعد افغان صوبے دار عطا محمد خان نے آپ کے نام کے سکے رائج کئے۔ آپ تنہا ایسے صوفی ہیں جس کے نام پہ سکے مضروب ہوئے۔

کشمیر میں اسلام کی اشاعت اور تصوف کی ارتقا میں رشی بزرگوں کا رول نا قابلِ فراموش ہے۔ انھیں اللہ والوں کی بدولت مخلوق کی بڑی تعداد نے ہدایت کا نور اور ایمان کی روشنی پائی۔ ان کا مقصد بس مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا اور انھیں فیوض وبرکات پہنچانا تھا۔ انھیں کی مسلسل مساعی کی بدولت وادی میں اسلام کی قندیلیں روشن ہوئیں اور تصوف کا نور پھیلا۔

❖○❖

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ ریشی نامہ

۲۔ نورنامہ

۳۔ توزکِ جہانگیری

۴۔ تذکرہ اولیاء کشمیر

توبہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز سے توبہ کر لے۔

(نوری)

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اقبالؔ

شہید کشمیر بابا اویس رحمۃ اللہ علیہ

جن اہلِ صدق وصفا نے کشمیر جنت نظیر کو وادیٔ روحانیت بنایا ان میں شہید کشمیر حضرت سید میر محمد امین منطقی ، بیہقی المعروف بابا اویس رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں۔آپ کا شمار کشمیر کے برگزیدہ صوفیہ اور محترم و محتشم سادات میں ہوتا ہے۔آپ کے والد محترم سید حسین منطقی بھی اہل اللہ میں سے تھے اور کشمیر میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، بابا اویس کی پرورش محل شاہی میں ہوئی۔سلطان زین العابدین بڈشاہ کی ملکہ نے آپ کو گود لے لیا تھا اور اس نے خود اپنی دلچسپی سے آپ کی پرورش کی۔بابا اویس رحمۃ اللہ علیہ کے اندر بچپن سے ہی بزرگی کے آثار تھے۔ظاہری حسن و جمال کے ساتھ ساتھ باطنی کمال آپ کی پیشانی سے ظاہر تھا۔عقل وخرد اور فہم وفراست تو آپ کے اندر تھا ہی حسنِ کمال اور لطفِ زبان میں بھی یکتا تھے۔انھیں خوبیوں کو دیکھتے ہوئے بادشاہِ وقت نے آپ کو آپ کے والد سے مانگ لیا تھا۔

بابا اویس رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہری علوم حضرت بابا حاجی ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے پائی، جو اپنے دور کے مشہور عالم تھے اور حضرت ابراہیم بن ادہم کی اولاد سے تھے۔ بابا اویس رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تربیت عارف باکمال، صاحبِ قیل وقال حضرت سید ہلال علیہ الرحمہ کے زیرنگرانی ہوئی۔ خواجہ ہلال منبعِ فیوض وبرکات تھے اور روحانیت کے درجہ کمال تک پہنچنے کے لئے رہروانِ راہ سلوک آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ بابا اویس رحمہ اللہ علیہ نے اپنے مرشد طریقت سے تربیت پاکر خود کو کلی طور پر علائق دنیا سے الگ کرلیا۔ محل میں شاہانہ پرورش کے باوجود فقر آپ کے مزاج پر حاوی تھا۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ نے آپ کی عقل ودانش اور معاملہ فہمی کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے آپ کو بعض امورِ سلطنت کی ذمہ داری سونپنی چاہی مگر آپ نے قبول نہیں کیا۔ بابا اویس کا دل مشاغلِ دنیا سے متنفر تھا لہٰذا محل شاہی کو خیر آباد کہہ دیا اور کوہِ ماران کے ویرانے کو اپنا مسکن بنا لیا۔ یہاں عبادت وریاضت اور مجاہدے میں وقت گزرنے لگا۔ سلطانِ وقت آپ سے بے حد محبت کرتا تھا لہٰذا کچھ مہینے بعد سلطان کی ملاقات کے لئے چلے آتے تھے۔ اس دوران اگر سلطان کو خلاف شرع کوئی کام کرتے دیکھتے تو سختی سے منع کرتے۔

ایک مرتبہ سلطان نے جھیل ولر کے قریب ایک شاہی عمارت تعمیر کرائی اور اس کے افتتاح کی تقریب میں آپ کو بھی مدعو کیا۔ بابا اویس نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ جشن میں نغمہ وسرود کا انتظام ہے اور دیگر غیر شرعی امور کی حکمرانی ہے تو آپ کی غیرت نے جوش مارا اور غلبۂ حال میں آکر جھیل میں کود پڑے۔ سارا جشن بدمزہ ہوگیا، محفلِ طرب، محفلِ اضطراب بن گئی۔ سب کچھ چھوڑ کر لوگ آپ کو ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ بادشاہ کے حکم سے غوطہ خوروں نے ساری جھیل کو کھنگال ڈالا مگر آپ ہاتھ نہیں آئے۔ فرطِ غم میں سلطان شہر کی طرف چلا تو راستے میں جھیلم کے کنارے آپ اپنے خرقے میں پیوند لگاتے نظر آئے۔ سلطان، وزراء، امراء اور سرکاری اہل کار روتے، گڑگڑاتے آپ کے قریب پہنچے اور معذرت طلب کی۔ بعد میں سلطان نے اشم گاؤں میں آپ کے لئے ایک عالیشان خانقاہ تعمیر کرائی، مگر یہاں بھی آپ زیادہ دن نہ رہ سکے اور اسے چھوڑ کر عالی کدل کے علاقے میں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ مزاج تنہائی پسند تھا۔ اکیلے عبادت وریاضت میں مصروف

رہنا پسند کرتے تھے مگر جب شوقِ دیدار کے طالب اصرار کرتے تو لوگوں سے مل جل کر گفتگو فرماتے تھے۔

شہادت:

بابا اویس رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں سلطان کے وزیر تھے، مگر کشمیر کے امراء ان سے خوش نہیں تھے۔ ایک دن اچانک ان امیروں نے حملہ کر کے وزیر موصوف اور ان کے چودہ فرزندوں اور دیگر رشتہ داروں کو قتل کر دیا۔ اسی دوران کچھ شر پسندوں نے آپ کی خانقاہ پر بھی حملہ کر کے آپ کو زخمی کر دیا۔ آپ زخمی حالت میں عالی کدل پہنچے اور حجرے کی دیوار پر اپنے خون سے دو رباعیاں لکھیں اور جان کو خدا کے سپرد کر دیا۔ رباعیاں یہ ہیں:

منم آں رند جہاں گرد مسیحا نفسی
کہ من ایں ہر دو جہاں را نہ شمارم بہ خسی
اگر زعشق توام سر برود، گو برود
ہر گز ایں سرّ نہاں تو نہ گویم بہ کسی

(میں وہ سیاحِ جہاں رند ہوں کہ دونوں جہاں کو گھاس کے تنکے برابر بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اگر تیرے عشق میں میرا سر بھی کٹ جائے تو میں ہرگز اس پوشیدہ راز سے کسی کو باخبر نہیں کرونگا۔)

من فارغم ز مصلحتِ اہلِ روزگار
می داں یقین کہ کشتنِ من بود بیگناہ
اکنوں بیاد شعر بخواں برمزارِ من
تا روی ظالمانِ ستمگر شود سیاہ

(میں اہلِ روزگار کی مصلحتوں سے فارغ ہوں۔ یقین سے جان لو کہ میرا قتل بے گناہ قتل ہے۔ اب آؤ میرے مزار پر شعر خوانی کرو کہ ستمگر ظالموں کی روسیاہی ہو جائے۔)

حضرت بابا اویس کی شہادت ۸۸۹ھ میں ذی قعدہ کی آخری تاریخ کو ہوئی آج بھی اس تاریخ پر آپ کا عرس منایا جاتا ہے اور عقیدت مند آپ کے مزار واقع عالی کدل سرینگر میں جمع ہو کر اوراد و اذکار کرتے ہیں۔ اس موقع پر دینی مجالس کا انعقاد ہوتا ہے۔

شاعر اویس:

حضرت بابا اویس علیہ الرحمہ ایک خوش فکر شاعر تھے۔ اویس تخلص کرتے تھے۔ کلام میں تصوف و عرفان کی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ذاتی تجربات و احساسات میں بھی عشق و بیخودی کے رنگ نمایاں ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

برتر از لامکاں، مکانِ من است
جملۂ کائنات، آنِ من است

چوں شہنشاہِ روزگار منم
پادشاہی ہمہ ازان من است

ہر کجا خسرویست در عالم
کمتریں کمتریں شبانِ من است

استخوانی کہ عالمش جویاں
آں ہمہ لائقِ سگانِ من است

ایں جہانی کہ ہست نیست بداں
بہ یقیں آں جہاں، جہانِ من است

زاں بہ کشمیر منزوی شدہ ام
کیں ہمہ باغ و بوستانِ من است

(لامکاں سے اوپر مکاں ہے میرا۔ ساری کائنات میری ملکیت ہے۔
چونکہ سارے زمانے کا شہنشاہ ہوں، لہٰذا ساری دنیا میری بادشاہی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی بادشاہ ہے، میرے ادنیٰ سے ادنیٰ چوپان سے بھی کمتر ہے۔
جن ہڈیوں کے پیچھے دنیا پڑی ہے، وہ تمام میرے کتوں کے لائق ہیں۔
یقین کرو یہ میری دنیا نہیں ہے، کشمیر میں اس لئے گوشہ نشیں ہوگیا ہوں کہ یہ میرا باغ
و بوستاں ہے۔)

اس مضمون کی تیاری میں ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

ا۔تذکرہ اسلاف (پروفیسر عبدالمجید سائر)
۲۔تاریخ حسن
۳۔دستورالسالکین

اُمیدوں کو کم کرنا زہد ہے۔

(سفیان ثوری)

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی ہوئی ہے چارسو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ہو میں

اقبالؔ

محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ

محبوبِ عالم شیخ من در عرش بیں اسمائے او
از ہر چہ خوانم خوشتریں، چوں شیخ حمزہ پیرما

محبوب العالم، سلطان العارفین حضرت مخدوم شیخ حمزہ رینہ علیہ الرحمہ کشمیر کے معروف صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے اثرات وادی کے کونے کونے تک پھیلے ہوئے ہیں اور آپ کے فیوض کے چشموں سے سیراب ہونے والے بھی بے حد وحساب ہیں۔ تذکرہ نگار آپ کو مادرزاد ولی قرار دیتے ہیں اور آپ کی کشف وکرامات کا بہت زیادہ ذکر کرتے ہیں۔

ولادت:

حضرت محبوب العالم علیہ الرحمہ کی ولادت باسعادت ۲۹ رشعبان المعظم ۹۰۰ھ شبِ

جمعہ کے آخری حصے میں ہوئی۔ تذکرہ نگاروں کا سالِ ولادت پر تو اتفاق ہے مگر تاریخ ولادت پر اتفاق نہیں۔ آپ کی آبائی رہائش گاہ تیجر شریف، زینہ گیر، کشمیر میں تھی۔ یہیں آپ کی ولادت ہوئی۔ والدِ محترم کا نامِ نامی شیخ بابا عثمان رینہ تھا جبکہ والدہ ماجدہ کا اسم گرامی بی بی مریم تھا۔ والدین بے حد دین دار اور متقی اور پرہیز گار تھے۔ ایک بڑے بھائی بھی تھے جو شیخ بابا محمد علی رینہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ بھی میدانِ سلوک کے شہسوار تھے اور تصوف میں آپ کا نام بے حد احترام سے لیا جاتا ہے۔ محبوب العالم روزِ آفرینش سے ہی منفرد شان وشوکت کے حامل تھے۔ تذکرہ نگاروں اور اہلِ سلسلہ کے مطابق آپ کی ولادت کے وقت بہت سی خرقِ عادت باتوں کا ظہور ہوا، جنھیں دیکھ کر آپ کے مستقبل کے متعلق سمجھ پانا مشکل نہیں تھا۔

خاندانی پسِ منظر:

حضرت محبوب العالم علیہ الرحمہ ایک اعلیٰ پنڈت گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان اپنا شاندار تاریخی پسِ منظر رکھتا تھا۔ اس نے ایک مدت تک وادی پر حکمرانی کی تھی اور حکمرانی کے خاتمے کے بعد بھی خاندان کے افراد اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے رہے تھے۔ محبوب العالم کے خالو کاجی چک کشمیر کے وزیر اعظم ہوئے شاہی دربار کے وزراء اور امراء میں بھی آپ کے کئی رشتے دار شامل تھے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ راون چندر رینہ تھے، جنھوں نے حضرت شرف الدین بلبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا تھا۔

راون چندر رینہ کی بہن کوٹہ رانی جس کا نام تبدیلی مذہب کے بعد شاہ بانو رکھا گیا تھا بے حد عقلمند اور ذہین خاتون تھی۔ اس نے بالواسطہ اور بلا واسطہ ایک مدت تک کشمیر پر حکومت کی۔ اس کے باپ شوہر اور بیٹے بھی کشمیر کے حکمراں ہوئے اور یہ سب کی مشیر رہی۔ یہ کشمیر کی اولین خاتون حکمراں تھی۔ حضرت محبوب العالم کا خاندان آپ کے والد شیخ بابا عثمان رینہ تک پہنچتے پہنچتے روحانیت کے راستے پر چل پڑا تھا۔ آپ کے رشتے دار حکومت کے عہدوں کی پیشکش

کرتے تھے مگر آپ نے قبول نہیں کیا اپنی آبائی جاگیر پر صبر و قناعت کے ساتھ رہے اور یہیں حضرت محبوب العالم کی پیدائش ہوئی۔ تیجر شریف سری نگر سے لگ بھگ ساٹھ کیلومیٹر دور ہے جو آپ کا آبائی وطن ہے۔

بچپن اور تربیت:

لڑکوں کی پیدائش پر عقیقہ میں عموماً دو بھیڑ یا بکروں کو ذبح کیا جاتا ہے، مگر محبوب العالم علیہ الرحمہ کی پیدائش پر آپ کے والد شیخ عثمان رینہ تین بھیڑوں کو ذبح کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران ایک فقیر نے آکر کہا کہ کم از کم تیس بھیڑیں ذبح کی جائیں لہٰذا تیس بھیڑیں ذبح کی گئیں اور لوگوں کی دعوت ہوئی۔ اس بات کا تذکرہ آپ کے بڑے بھائی بابا محمد علی رینہ علیہ الرحمہ نے اپنے مخطوطے تذکرۃ العارفین میں کیا ہے۔

محبوب العالم حضرت حمزہ رینہ کا بچپن اپنے گاؤں تیجر شریف میں گزرا۔ کم عمری کا دور عموماً کھیل کود اور لہو لعب کا دور ہوتا ہے مگر آپ کو طبعی طور پر ان باتوں سے نفرت تھی۔ چھوٹی عمر میں ہی صاف ستھری زبان میں گفتگو کرنے لگے تھے اور چست و چالاک تھے۔ جب تھوڑی عمر بڑھی تو تیر اندازی، غلیل بازی اور گھوڑ سواری میں مہارت حاصل کرلی۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کو گاؤں ہی کے ایک مکتب میں پڑھائی کے لئے بٹھا دیا گیا۔ یہاں مولانا محمد شریف کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہاں قرآن مجید، کریما، گلستاں، بوستاں، نامِ حق، پند نامہ، بدائع منظوم اور قدوری پڑھی۔ آگے کی تعلیم کے لئے شہر سرینگر تشریف لائے۔ یہاں تب شیخ بابا اسماعیل کبروی علیہ الرحمہ کی روحانیت کا شہرہ تھا۔ یہ بے حد متقی، پرہیزگار اور روشن ضمیر انسان تھے۔ ان کے خاندان میں ایمان اور تصوف کی دولت حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ سے پہنچی تھی۔ محبوب العالم بھی اسی آستانے پر فیوض حاصل کرنے آئے۔ شیخ بابا اسماعیل زاہد کبروی نے خوشدلی سے آپ کو اپنے دامنِ عاطفت میں لے لیا اور پیشین گوئی فرمائی ''ایں فرزندِ سعادت مند مقتدائے روزگار گردد'' (یہ سعادت مند بچہ زمانے کا پیشوا ہوگا) ایک روشن ضمیر کی نگاہوں

نے آپ کے اندر کے جوہر کو پہچان لیا تھا لہذا جو کچھ آنجناب کی زبان سے نکلا وہ بالکل درست ثابت ہوا۔ دوسرے ایسے ہی بہت سے اہل علم و دانش نے آپ کو بچپن میں دیکھ کر آپ کے شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کردی تھی۔ سچ ہے۔

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ سربلندی

شیخ بابا زاہد کبروی علیہ الرحمہ سے آپ نے کچھ دینی کتابیں پڑھیں۔ اسی کے ساتھ ان کے صاحبزادے حضرت بابا فتح اللہ خوشخواں علیہ الرحمہ سے روحانی تربیت حاصل کرنے لگے۔ آپ نے بابا فتح اللہ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہو کر مجاہدہ اور ریاضت کی بھی ابتدا کردی۔

خانقاہ شمسی چک میں:

بابا فتح اللہ خوشخواں علیہ الرحمہ آپ کے استاد، مربی اور مرشد تھے۔ انھوں نے آپ کے اندر کے جوہر کو دیکھتے ہوئے آپ کی علمی اور روحانی تربیت شروع کردی تھی۔ اسی دوران ان کے مشورے سے آپ اس دور کے علمی اور روحانی مرکز خانقاہ شمسی چک میں داخل ہو گئے۔ یہاں اپنے وقت کے بڑے بڑے اساتذہ اور ماہرین فن درس و تدریس کی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ بابا فتح اللہ کے ساتھ ساتھ اخوند ملا درویش اور اخوند ملا لطیف اللہ یہاں کے مشہور زمانہ علماء تھے۔ یہاں محبوب العالم نے پوری تندہی اور لگن کے ساتھ خود کو علم کے لئے وقف کردیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اوراد و اذکار، عبادت و ریاضت، تفکر و تدبر اور مجاہدہ و مشاہدہ کی مشق بھی جاری رکھی۔ اس طرح آپ علم و عرفان کے نقطۂ عروج پر پہنچ گئے۔ اس خانقاہ میں تقریبا بیس سال تک آپ کا قیام رہا۔ شیخ خاکی رقم طراز ہیں۔

معتکف در خانقہ بودہ قریب بست سال
معسر العشرین بعیشِ قربِ حق اعشر شداست

خانقاہ شمسی چک میں آپ نے حدیث، تفسیر، فقہ، منطق، فلسفہ، نحو و صرف اور اخلاق

وآداب کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھا۔ یہاں صالحین کے ساتھ صحبت رہی اور شب بیداری کی عادت پڑ گئی۔ دن کو روزہ رکھنا اور مختلف اوراد واذکار پر کاربند رہنا آپ کے معمولات میں شامل تھا۔

روحانیت کی تکمیل:

محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ علیہ الرحمہ کو ابتدا سے ہی روحانی فیوض وبرکات حاصل ہوتے رہے تھے۔ دوران تعلیم بھی آپ نے اہلِ دل حضرات سے بہت کچھ حاصل کیا مگر اب وقت روحانیت کی تکمیل کا تھا۔ چنانچہ حضرت سید جمال الدین بخاری علیہ الرحمہ کشمیر تشریف لائے جو اپنے زمانے کے مشہور صوفی تھے۔ آپ بنیادی طور پر اگرچہ اچہ (ملتان) کے رہنے والے تھے مگر دلی میں قیام تھا۔ (مزار مقدس اچہ میں ہے) تذکرہ نگاروں کے مطابق سید جمال الدین بخاری غیبی اشارے پا کر کشمیر تشریف لائے تھے۔ آپ کی آمد کا مقصد شیخ حمزہ رینہ کی روحانی رہنمائی کرنا تھا۔ سید صاحب موصوف سرینگر میں ملک احمد یتو کی خانقاہ میں ٹھہرے اور یہیں محبوب العالم نے آپ سے ملاقات کی۔ سید صاحب علیہ الرحمہ نے محبوب العالم کی روحانی خوبیوں کو پہچان لیا۔ آپ نے روٹی اور گوشت انھیں عنایت فرمایا جسے کھاتے ہی دل ودماغ میں اعتقاد کا نور روشن ہوگیا۔ دل کی دنیا میں انقلاب رونما ہوگیا۔ عالمِ قدس کے اسرار ورموز کا انکشاف ہونے لگا۔ پھر انھوں نے اپنی مبارک ٹوپی محبوب العالم کے سر پر رکھ کر چند دن کے لئے خلوت اختیار کرنے اور اوراد وظائف پڑھنے کا حکم دیا۔ پھر مرید کر کے خلافت سے نوازا اور چھ مہینے تک روحانی تربیت فرما کر تکمیل کے درجے تک پہنچایا۔ مرشد نے رسول اکرم ﷺ کے کچھ تبرکات عطا فرمائے۔ یہ تبرکات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہوتے ہوئے آپ تک پہنچے تھے۔

جب سید جمال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کشمیر سے واپس جا رہے تھے تو حضرت محبوب العالم نے آپ کے ساتھ سفر پہ جانے کا ارادہ کیا تو مرشدِ برحق نے یہ کہتے ہوئے جانے سے روک دیا کہ:

''مسافری کافری ہے۔ اس سفر کی ضرورت اس کو ہے جو حقیقت کے سفر سے عاجز ہو۔ حقیقت کا مسافر دل ہے جو کہ زمین و آسمان، عالمِ ملکوت اور عجائباتِ الٰہی میں پرواز کرتا ہے۔''

(تذکرہ اسلاف، صفحہ-۱۶۶)

پیر و مرشد کے روانہ ہونے کے بعد آپ دلجمعی کے ساتھ عبادت و ریاضت اور خدمتِ خلق و تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گئے۔

عبادت و ریاضت:

حضرت محبوب العالم علیہ الرحمہ کی مقدس زندگی عبادت کے لئے وقف تھی۔ حیات کا ایک ایک لمحہ یادِ الٰہی اور ذکر واذکار میں گزرتا تھا۔ چونکہ آپ نے شادی نہیں کی تھی لہٰذا گھریلو الجھنوں سے بھی دور تھے۔ ایسی حالت میں آپ کی پوری توجہ عبادت و ریاضت کی طرف ہی رہتی تھی۔ اکثر اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ ویران مکانات اور بوسیدہ عمارتوں میں تنہا بیٹھ کر عبادت کرنا پسند کرتے تھے۔ رات کو عبادت سے قبل ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا آپ کے معمولات میں شامل تھا۔ یہ ہر موسم کا معمول تھا۔ بعض اوقات ایک ہی رات میں کئی کئی بار غسل کرتے تھے اور وہ بھی ندی، جھیل یا چشمے پر کیا کرتے تھے۔

قدرتی مناظر آپ کو بے حد پسند تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کا قیام عموماً ندی، جھیل اور جھرنوں کے قریب ہوتا تھا۔ یہیں غسل کر کے پوری پوری رات عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایسے مقام کے بغیر مجھے قرار نہیں آتا۔ جھرنوں کے گرنے اور پانی کے بہنے کی آواز آپ کو بھلی لگتی تھی۔ آپ کے بڑے بھائی حضرت محمد علی رینہ علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے کہ:

''ذکر واذکار کے سلسلے میں آپ کو ہمیشہ سرد پانی سے نہانے کی ضرورت رہتی تھی اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو بارک ہڈیاں

ذکرواذکار کی گرمی سے جل پڑتیں۔''

(مخطوطہ تذکرۃ العارفین، صفحہ-۴۱۴)

حضرت محبوب العالم سے مختلف اوراد واشغال منقول ہیں۔وہ خود ان پر عمل پیرار ہتے تھے اور اپنے مریدین وعقیدت مندوں کو ان کی تلقین کرتے تھے۔

سوزِ عشق:

تصوف پوری طرح عشق کی بنیادوں پر قائم ہے۔یہی سبب ہے کہ راہِ سلوک پر چلنے والوں کے دل سوزِ عشق سے لبریز ہوتے ہیں۔حضرت محبوب العالم کے ہاں بھی سوز وگداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔آپ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

جز دردِ عشق دردلِ من ہیچ درد نیست

آں راکہ درد نیست، بدانم کہ مرد نیست

یعنی میرے دل میں دردِ عشق کے سوا کوئی درد نہیں ہے اور جس کے دل میں یہ درد نہ ہو میں سمجھتا ہوں کہ وہ آدمی نہیں ہے۔

آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔

مرا سوزیست در سینہ اگر گویم زباں سوزد

وگر دم در کشم ترسم کہ مغز واستخواں سوزد

یعنی میرے سینے میں ایسا سوز ہے کہ اگر اظہار کروں تو زبان جل جائے اور آہ اندر کھینچوں تو ڈر لگتا ہے کہ مغز اور ہڈیاں جل جائیں۔

سوزِ عشق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی محفل میں شریک ہونے والے آہ کے ساتھ نکلنے والی تپش محسوس کرتے تھے۔بلکہ بعض کا بیان ہے کہ آپ کی محفل میں گوشت جلنے کی ہلکی ہلکی مہک آتی تھی اور آنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ گوشت بھونا جارہا ہے۔آپ کے دور کے ایک بزرگ میر سید احمد کرمانی جب آپ کی مجلس میں آئے تو حال واحوال کی پرسش کے بعد فرمایا:

''میں آپ میں عجیب حالت دیکھتا ہوں۔ عشق اور دردِ سوز میں جو کوئی اس
مقام تک جائے، اس کی ہڈیاں بہت جلد پریشان ہو کر رہیں گی اور اس کے
بدن کا ایک ایک عضو پگھل کر رہ جائے گا۔''

(دستور السالکین صفحہ-۱۷۵)

حضرت امیر سید احمد کرمانی رحمۃ اللہ علیہ مزید فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سارے عالم کا سفر کیا اور بے شمار اولیاءِ کاملین کی خدمتِ اقدس میں رہا ہوں لیکن جو درد وسوز میں حضرت موصوف میں پایا اس کا مشاہدہ کسی دوسری جگہ نہیں کیا۔ میں حیران ہوں کہ اس جلن اور سوزش سے آپ کس طرح زندہ ہیں۔

اسی جلن اور سوزش کی وجہ سے آپ جنگلوں، صحراؤں اور جھیلوں کی سیر کو جایا کرتے تھے۔ آپ کی سیر وتفریح کے لئے ایک کشتی ہمیشہ تیار رہا کرتی تھی۔ آپ اکثر کشتی پہ سوار ہو کر ڈل جھیل کی سیر کو جایا کرتے تھے۔ مقصد یہ بھی تھا کہ تازہ آب وہوا میں آپ تازہ دم ہو جائیں۔ سچ ہے۔

من مارا کھوں من جرے، کہوں تو مکھ جر جائے
گونگے کا سپنا بھیو، سمجھ سمجھ پچھتائے

آدمی سے زیادہ فرشتے اطاعت شعار ہوتے ہیں مگر انسان کی افضلیت اسی لئے ہے کہ وہ دردِ عشق سے مالا مال دل رکھتا ہے۔ صوفیہ اس کی مثال ہیں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

خدمات:

محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ علیہ الرحمہ کشمیر کے ان اہلِ تصوف میں ہیں جنھوں نے بندگانِ خدا کی ظاہری اور باطنی اصلاح کا کام بڑے پیمانے پر کیا۔ آپ کی کوشش سے لاکھوں بندگانِ خدا نے ہدایت پائی اور بے شمار افراد نے کفر وشرک سے توبہ کر کے اسلام کو اپنایا۔ آپ

کا قیام جس محلے میں تھا وہ مخدوم منڈو کے نام سے مشہور ہوگیا۔ کشمیری زبان میں منڈو کا مطلب نشست گاہ ہے۔ یہاں آپ کی خانقاہ تھی جہاں آپ عبادت وریاضت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اس مقام پر آج بھی خانقاہ کی نئی عمارت موجود ہے۔

جب محبوب العالم کے مرشد کامل سید جمال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو مسندِ خلافت وارشاد پر آپ کو متمکن فرمایا تو اسی کے ساتھ انھوں نے خدمتِ خلق اور اشاعتِ اسلام کی تلقین بھی فرمائی۔ آپ نے بھی مرشد کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اللہ کے بندوں کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ وادیٔ کشمیر کے گاؤں اور قصبوں کا سفر کیا اور لوگوں کو روحانی زندگی جینے کی تلقین کی۔ ساتھ ہی عوام میں اسلام کی دعوت بھی عام کی۔ اس دعوت کا زبردست اثر ہوا اور آپ کو اپنے مشن میں کامیابی حاصل ہوئی۔ کئی علاقوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسلام کی آغوش میں آئے۔ کئی قصبوں اور محلوں میں مسجدیں اور خانقاہیں قائم ہوئیں۔ وعظ ونصیحت اور مجلس ومحفل کا یہ سلسلہ سرینگر سے لے کر وادی کے دور دراز خطوں تک جاری رہا اور آپ کی تعلیمات کی روشنی آپ کے بعد بھی پھیلتی رہی۔

کھویہامہ کے علاقہ میں نادی ہل ایک مقام ہے جہاں دو چشمے تھے۔ ان کا احترام کیا جاتا تھا اور انھیں بھوتوں پریتوں کا مسکن سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کئی قسم کے شرکیہ افعال جاری تھے۔ آپ کی تبلیغ سے یہاں کی پوری آبادی نے راہِ ہدایت پائی اور مشرف بہ اسلام ہوکر، عبادت کے لئے ایک مسجد کی تعمیر کی۔ یہ ۹۷۲ھ کا واقعہ ہے۔

کرر کے علاقے میں چشمہ بچہ ناگ ایک متبرک مقام سمجھا جاتا تھا یہاں بھی کفریہ رسمیں جاری تھیں اور لوگ ادھر سے گزرنے میں خوف محسوس کرتے تھے۔ حضرت محبوب العالم کے دم قدم سے یہ سلسلے بند ہوئے اور ایک مسجد کی تعمیر ہوئی۔ یہاں ایک بڑا گاؤں بھی آباد ہوا۔

انہد گام میں ایک بڑا درخت تھا جس کی پوجا کی جاتی تھی۔ یہاں بھی محبوب العالم کی کوشش سے ایک مسجد تعمیر ہوئی اور اس کی تعمیر میں اہل خیر حضرات نے حصہ لیا۔ اسی طرح آرہ گام

کے علاقے میں شنگھ پال پہاڑی پر ایک بڑا چشمہ تھا جہاں جانوروں کی بلی چڑھائی جاتی تھی اور دیگر شرکیہ رسمیں ہوتی تھیں یہاں آپ نے بذاتِ خود ایک مسجد اور چبوترے کی تعمیر شروع کرائی۔ یونہی گنڈہ پورہ کے پھامون، آلوسہ، کاؤسہ، کرمیشور اور اوین کے مقامات پر مسجدیں تعمیر کرائیں۔ موضع اہام میں قیام کے دوران محبوب العالم نے ایک مسجد کی تعمیر کرائی اور ایک سنگلاخ زمین سے پانی کی نہر نکالی۔ اس نہر سے کسانوں کو کھیتی میں مدد ملی۔ یہاں آپ عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے لہٰذا عقیدت مند آج بھی آپ کی نسبت سے اس مقام کو متبرک سمجھتے ہیں۔ یہ مقام پیر ابل کے نام سے مشہور ہے۔

الغرض آپ جس علاقے سے بھی گزرے وہاں بے شمار بندگانِ خدا نے راہِ ہدایت پائی اوران گنت لوگوں نے روحانیت کی زندگی کو اپنایا۔ نیز نہ جانے کتنے لوگ ایسے تھے جن کی اصلاح حضرت محبوب العالم نے فرمائی۔

تصنیف:

محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ رینہ علیہ الرحمہ جس طرح ظاہری علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے اسی طرح آپ باطنی علوم پر بھی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ نے علم سیر وسلوک پر ایک رسالہ تصنیف فرمایا تھا، جس کا نام 'سلوک الولایت' تھا۔ اس میں سلوک کی منزلیں آپ نے بیان فرمائی ہیں اور آپ کے برادر بزرگ حضرت مخدوم محمد علی رینہ نے اپنے قلم سے تحریر کیا ہے۔ یہ رسالہ آج دستیاب نہیں ہے مگر اس کا ذکر بابا محمد علی رینہ کی تصنیف 'تذکرۃ العارفین' میں ملتا ہے۔ ان کے مطابق اس رسالے میں کلمہ لا الہ الا اللہ سے ابتدائی اذکار کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر طریقۂ محاسبہ، طریقۂ مراقبہ، طریقۂ مفاکرہ اور طریقہ مشاہدہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد طریقۂ معاینہ، طریقۂ استغراق، طریقۂ افاقہ، طریقۂ ولایت، طریقۂ استقامت، طریقہ ملامت، طریقۂ کرامت اور طریقۂ سلامت کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ محبوب العالم کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا۔

حیاتِ ابدی:

موت ہر نفس کا مقدر ہے مگر معرفت اور عشق کے لئے کبھی موت نہیں۔ حضرت محبوب العالم علیہ الرحمہ جسم بشری رکھتے تھے، جو موت سے ہمکنار ہوا مگر عشق وعرفان سے معمور دل کو کبھی موت نہیں آتی

نمیرد ہر کہ جانش تو باشی
خوشا جانیکہ جانانش تو باشی

تقریباً چوراسی سال تک آپ نے اس سرزمین کو اپنے وجود سے شرف بخشا اور پھر اپنے مالکِ حقیقی سے وصال فرمایا۔ تاریخ وصال ۲۵ رصفر ۹۸۴ھ ہے مگر ۲۴ رصفر کو آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔ مخدوم منڈو میں رحلت ہوئی اور کوہِ ماران کے دامن میں جہاں گوشہ نشیں ہو کر عبادت کرنا پسند فرماتے تھے آخری آرامگاہ بنی۔ جنازے میں بادشاہِ وقت علی شاہ چک اور علماء ، اولیاء، صوفیہ، سادات کے علاوہ کثیر تعداد میں عوام وخواص موجود تھے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

❖○❖

اس مضمون کی معلومات درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔تذکرہ اسلاف (بحوالہ)

۲۔تذکرۃ المرشدین (مخطوطہ)

۳۔دستورالسالکین

۴۔چلچلۃ العارفین (مخطوطہ)

۵۔تذکرۃ العارفین

۶۔ہدایت المخلصین

۷۔مخطوطہ رسالہ سلطانیہ

۸۔شجرۃ الاخیار فی ذکر ابرار (فاروق گیلانی)

۹۔تاریخ حسن

۱۰۔تاریخ کشمیر

جو توحید کے سمندر میں پڑ جاتا ہے، جوں جوں وقت گزرتا
جاتا ہے اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

(یوسف بن حسین)

وہی اصل مکان ولامکاں ہے
مکاں کا کیا شئے ہے؟ انداز بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے؟ کیا بتائے؟
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

اقبالؔ

محبوب العالم کے ہمعصر صوفیہ

وادیٔ کشمیر صدیوں سے اولیاء اللہ کی سرزمین رہی ہے۔ یہاں کے ذرے ذرے سے آج بھی روحانیت اور عشق و عرفان کی خوشبو آتی ہے۔ محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے برگزیدہ اہلِ صفا میں سے ہیں۔ آپ کے تعلقات جن صوفیہ سے تھے ان میں ایک سے بڑھ کر ایک باکمال بزرگ تھے۔ ان میں سے بعض تو آپ کے سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور بعض آپ کے خلیفہ تھے مگر ایسے اہلِ تصوف بھی کم نہ تھے جن سے قریبی تعلقات تھے اور ہمعصر ہونے کے سبب تبادلۂ خیالات کے مواقع بھی ملتے رہتے تھے۔ آپ کے ہمعصروں کے بارے میں ایک اجمال یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

میر سید احمد کرمانی:

گلِ باغِ سیادت بود احمد

مہِ برجِ ہدایت بود احمد

میر سید احمد کرمانی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ سہروردیہ کے معروف بزرگ گزرے ہیں۔آپ نے بیشتر وقت سیر وسیاحت میں گزارا مگر کشمیر میں بھی ایک مدت تک رہے اور آخری آرامگاہ بھی اسی وادی دلنشیں میں ہے۔آپ کرمان کے رہنے والے تھے اور امام عالیمقام شہید کربلا رضی اللہ عنہ کی نسل پاک سے تھے۔والد کا نام سید محمود مکرم تھا اور دو بھائی سید محمد اور سید حامد تھے۔

سید احمد کرمانی علیہ الرحمہ کو سیر سیاحت اور صحرا نوردی کا شوق تھا لہٰذا اکثر سفر میں رہتے تھے اور مختلف اولیاءاللہ کے آستانوں پر حاضری دے کر علمی وروحانی برکات حاصل کرتے رہتے تھے۔آپ کو بلند مرتبہ صوفیہ کی خدمت میں حاضری کے موقعے بار بار ملے۔اسی دوران حج بیت اللہ اور زیارتِ رسول اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔ایشیا کے مختلف ملکوں کا ہندستان پہنچے اور ملتان میں سکونت اختیار کی۔ملک کے دوسرے علاقوں کے بھی آپ نے دورے کئے نیز کئی مرتبہ آپ کشمیر بھی آئے۔یہاں محبوب العالم سے ملاقات رہی اور دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے سے روحانیت کے تجربات پر گفتگو کی۔سید صاحب نے محبوب العالم کے درد وسوز اور گدازِ قلب کو دیکھا تو آپ کو درختوں، پہاڑوں، صحراؤں، اور مرغزاروں کی سیر کا مشورہ دیا جسے انھوں نے قبول کرلیا۔

میر سید احمد نے بہت سے بزرگوں سے اکتسابِ روحانیت کیا مگر آپ سید میاں مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ بنے۔مخدوم جہانیاں ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے اور سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔سید صاحب انتہائی مستجاب الدعوات ولیٔ کامل تھے اور کشمیر کے دیگر صوفیہ واہلِ علم بھی آپ کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔جن میں میر بابا حیدر تیلہ مولی اور خواجہ حسن قاری بھی شامل تھے۔یہاں خواجہ مسعود نروری آپ کی صحبت میں آئے اور آپ کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کرکے روحانیت میں اعلیٰ مقام پیدا کیا۔یہ یہاں کے امراء میں شمار کئے جاتے تھے۔بڑے تاجر تھے مگر روحانیت کی خلش دل میں موجود تھی جسے انجام

تک پہنچایا میر سید احمد کرمانی نے۔ آپ نے انھیں خلافت عطا فرمائی اور گرانبہا تبرکات جن میں خاتونِ جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا دوپٹہ، شہید کربلا امام حسین رضی اللہ عنہ کی خون آلود قمیص رسول اکرم ﷺ کا مقدس جوتا شامل تھے، آپ کے حوالے کیا۔ یہ تبرکات اس خاندان کی تحویل میں آج بھی موجود ہیں۔

والیٔ کشمیر سلطان نازک شاہ نے سید صاحب کی خوب پذیرائی کی اور آپ کے خادموں کے لئے محلّہ نرورہ سری نگر میں خانقاہ بنوائی۔ اس خانقاہ کے خرچ کے لئے سالانہ وظیفہ بھی مقرر کیا گیا تھا مگر ایک مدت کے بعد آپ نے سرکاری وظیفہ لینے سے منع کردیا۔ کشمیر میں قیام کے دوران بے شمار افراد نے آپ سے فیوض و برکات حاصل کئے۔ ۲۱ ر رمضان المبارک ۹۸۲ھ کو پہکلی کے مقام پر آپ کا انتقال ہوا اور یہیں حضرت بہاء الدین گنج بخش کشمیری علیہ الرحمہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ یہاں ہر سال عرس کی تقریبات ہوتی ہیں جن کی قیادت اسی خانوادے کے افراد کرتے ہیں۔

مخدوم حاجی احمد قاری:

حضرت مخدوم حاجی حشمت احمد قاری رحمۃ اللہ علیہ نے محبوب العالم کے کہنے پر کشمیر میں علم تجوید و قرأت کو فروغ دیا۔ محبوب العالم کے خلفاء خواجہ حسن قاری اور خواجہ اسحاق قاری آپ ہی کے شاگرد تھے ۹۰۶ھ بمقام ملتان آپ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حضرت مخدوم عباس ملتانی سے پائی جبکہ فن قرأت میں شیخ محمد ماہ روشن قادری آپ کے استاد تھے۔ روحانی تربیت اپنے والد کے زیر نگرانی پائی جو مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی، مخدوم صدرالدین عارف اور مخدوم رکن الدین عالم علیہم الرحمہ کے تربیت یافتہ تھے۔ خداشناسی کا ماحول بچپن سے ہی ملا تھا لٰہذا حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمہ کے سلسلے میں اپنے والد سے ہی مرید ہوگئے اور خلافت بھی پائی۔ ۲۴ رشوال ۹۲۹ھ کو اپنے والد اور مرشدِ کامل کے انتقال کے بعد سیر و سیاحت پر نکل پڑے۔ مختلف خطوں کی سیر کرتے ہوئے مکہ معظّمہ پہنچے اور زیارت حرمین شریفین کے بعد

عرب وعجم کی سیر کرتے ہوئے ہندستان واپس تشریف لائے۔ایشیا کے بڑے خطے کی سیر کے دوران بہت سے اولیاء اللہ اور اہلِ عشق وعرفان سے ملاقات ہوئی جن سے ظاہری وباطنی برکات حاصل کئے۔ ہندستان واپس آ کر لاہور میں ٹھہرے اور شیخ محمد روشن قادری علیہ الرحمہ سے ملاقات کر کے تجوید وترتیل کے رموزات کا مزید استفادہ کیا۔لاہور میں قیام کے دوران بہت سے تشنگانِ علم کو فنِ قرأت کی تعلیم دی۔ یہیں آپ کی ملاقات محبوب العالم کے خلیفہ بابا داؤ دخا کی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی جنھوں نے آپ کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ دونوں بزرگوں کے بیچ برادرانہ رشتہ قائم ہو گیا اور آخر کار آپ کشمیر تشریف لائے۔ یہاں فن قرأت کو عام کیا اور بڑے بڑے شاگرد پیدا کئے۔ یہاں آپ کی خانقاہ تھی جس میں آپ درس دیا کرتے تھے۔کشمیر میں شاہی مسجد سے متصل دریائے جہلم کے کنارے آپ کی رہائش تھی۔ یہاں دور دراز علاقوں سے بھی طلباء فن قرأت سیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔اس کے علاوہ راہِ حق کے طالبوں کی روحانی رہنمائی بھی آپ کیا کرتے تھے۔ یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو قریشی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔آپ کے چار لڑکے ہوئے جو تمام فن قرأت کے ماہر اور ظاہری وباطنی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔آپ کی نسل کشمیر میں خوب پھیلی اور اس خانوادے کے افراد اہم مناصب پر فائز ہوئے۔شاہی مسجد اور قریشی مسجد کے درمیان مقبرہ قریشیان میں آپ دفن ہیں۔یہیں آپ کے خاندان کے دیگر افراد بھی دفن ہیں۔۸؍رمضان المبارک ۹۶۹ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔

میر میرک اندرابی:

میر میرک اندرابی رحمۃ اللہ علیہ خاندانِ اندرابیہ کے جلیل القدر بزرگ ہیں۔آپ محبوب العالم کے ہمعصر تھے گو عمر میں فرق تھا۔میر میرک اندرابی سری نگر کے میرہ محلہ ملارٹہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد میر شمس الدین اندرابی تھے جو سید ابراہیم کے فرزند تھے۔سید ابراہیم کوہِ ہندوکش کے علاقہ اندراب سے کشمیر آئے تھے۔یہ سلطان زین العابدین بڈشاہ یا سلطان سکندر بت شکن کا دور تھا۔بعض سوانح نگاروں کے مطابق سید شمس الدین کشمیر آئے تھے۔یہاں حکومتِ

وقت نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی اور لنگر کے لئے کئی گاؤں وقف کئے تھے۔

میر میرک اندرابی رحمہ اللہ علیہ حسبی ونسبی سید تھے۔ والد کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا اس کے باوجود حصول علم میں مصروف رہے۔ خداشناسی کا جذبہ بھی آپ کو وراثت میں ملا تھا لہٰذا خود بخود ہی راہِ سلوک پر چل پڑے۔ ابتدا میں اویسی سلسلے میں مرید ہوئے اور بعد میں سید شاہ نعمت اللہ قادری علیہ الرحمہ کے دامن سے وابستہ ہوگئے۔ پیرومرشد نے روحانی تربیت فرما کر مرشدی کے درجے تک پہنچا دیا۔ عبادت وریاضت اور تقویٰ شعاری میں بے مثال تھے۔ چالیس سال تک خانقاہِ اندرابیاں میں گوشہ نشیں رہے۔ چالیس سال تک مجاہدے کی یہ کیفیت تھی کہ دن روزے اور رات قیام میں گزارتے تھے۔ آپ نے چالیس سال کی عمر تک شادی نہیں فرمائی مگر رسول اکرم ﷺ کی جانب سے خواب میں تلقین کے بعد نکاح کیا۔ جس سے تین بیٹے اور چھ بیٹیاں ہوئیں۔ آپ کی اولاد واد دی کے مختلف حصوں میں پھیلی اور ساداتِ اندرابیہ آج بھی یہاں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ خانقاہ میں قیام سے قبل استرون کے جنگل میں بارہ سال تک عبادت کرتے رہے۔ پھر ایک مدت تک نائدیار کے ایک غار میں خلوت نشیں رہے۔

میر میرک اندرابی نے اشاعتِ اسلام کے لئے بھی جدوجہد کی۔ موضع پوچھل کے لوگوں نے آپ کی کوشش سے اسلام قبول کیا۔ یہاں آپ سے منسوب تبرکات آج بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اور کہاں کہاں آپ نے تبلیغ کا کام کیا اس بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ آپ صاحبِ علم وکمال تھے اور آپ کے زمانے کے لوگ علمی وروحانی رہنمائی کے لئے آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ۵ رصفر ۹۷۰ھ یا ۹۹۰ھ کو انتقال فرمایا۔ خانقاہ اندرابیاں، میر محلہ، ملارٹہ، سری نگر کے جنوب میں آپ کی قبر مبارک ہے۔ ساداتِ اندرابیہ کے افراد کشمیر و بیرونِ کشمیر بڑی تعداد میں پھیلے۔ ان میں سے بعض مذہبی، سماجی اور سیاسی طور پر مشہور بھی ہوئے۔ بعض نے اعلیٰ مراتب پائے۔ یہ خاندان علمی اعتبار سے ہمیشہ اہم رہا ہے۔

خواجہ طاہر رفیقی:

سالکِ راہِ باطن وظاہر
ہست خواجہ محمد طاہر

خواجہ طاہر رفیقی رحمۃ اللہ علیہ حضرت محبوب العالم کے ہمعصر ہیں۔آپ کے والد کا نام ابراہیم عشائی تھا جو بیحد متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔آپ کی والدہ ہاجرہ عشائی بھی صوفیوں کے خاندان سے تھیں،جن کے دادا خواجہ سلیمان عشائی رحمۃ اللہ علیہ،امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ساتھ کشمیر تشریف لائے تھے۔خواجہ طاہر رفیقی کے والد کے تعلق سے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ کول خاندان سے تھے،یعنی کشمیری پنڈتوں کا وہ خاندان جس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔خواجہ طاہر رفیقی کی شادی لاہور کے ایک بزرگ شیخ عبدالشکور قریشی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی،جنھوں نے آپ کو رفیق لقب سے نوازا تھا جو بعد میں رفیقی بن گیا۔شیخ عبدالشکور قریشی ایک خدارسیدہ بزرگ تھے اور مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔طاہر رفیقی کو تصوف سے دلچسپی تھی۔سلسلہ اویسیہ سے منسلک تھے مگر شیخ عبدالشکور قریشی کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے بعد روحانی تعلیمات آپ ہی سے حاصل کرنے لگے۔پھر مرید ہوکر خرقۂ خلافت اور تبرکات سلسلہ سہروردیہ حاصل کیا۔راہ سلوک سے دلچسپی کی وجہ سے خواجہ طاہر رفیقی نے اپنا کاروبار بند کردیا تھا مگر بعد میں وانی گام ترال چلے گئے اور اپنی موروثی زمین پر کاشت کاری شروع کردی۔یہاں بھی عبادت وریاضت اور مجاہدہ کا سلسلہ جاری رہا۔آپ سلسلہ قادریہ ،کبرویہ،نقشبندیہ سے فیوض حاصل کیا کرتے تھے مگر سہروردی سلسلے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ رینہ سے آپ کے بڑے گہرے مراسم تھے۔دونوں بزرگوں کی اکثر نشستیں ہوتی تھیں۔جن میں شیخ یعقوب صرفی،میر بابا والی اور بابا ہردی رشی وغیرہ شریک ہوتے رہتے تھے۔عوام کی بھیڑ خواجہ طاہر کے پاس کم ہوتی تھی۔جبکہ محبوب العالم کے پاس ضرورت مند زیادہ جاتے تھے۔کسی عقیدتمند نے پوچھا کہ محبوب العالم کے پاس ضرورت مند زیادہ جاتے ہیں جبکہ آپ کے پاس کم آتے ہیں،ایسا کیوں؟ آپ نے جواب دیا،معرفت

وعرفان کا جو پیالہ انھیں عطا ہوا وہی مجھے بھی ملا، مگر مجھے اپنی ذات کے لئے ملا اور انھیں اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بانٹنے کے لئے بھی دیا گیا۔ اسی طرح حضرت محبوب العالم نے فرمایا خواجہ صاحب پیشہ کے لحاظ سے تاجر تھے لہٰذا جو سرمایہ حاصل کیا اسے محفوظ رکھا اور میں زمین دار تھا جو کچھ ملا اسے تقسیم کر دیا۔

خواجہ طاہر رفیقی رحمۃ اللہ علیہ بے حد متحرک وفعال شخص تھے۔ موضع خرد میر ترال میں ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور موضع نوگام شانکس میں ایک مسجد بنوائی۔ آپ دور دراز جا کر لوگوں کو روحانی تعلیم دیتے اور دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کی کوششیں کرتے تھے۔ بے شمار افراد کو آپ کی کوششوں سے راہ ہدایت ملی اور کفر وشرک کی تاریکی سے نکل کر توحید واسلام کے اجالے میں آئے۔ بہت سے لوگوں نے آپ کی نگرانی میں راہ سلوک طے کی۔ آپ کے معزز خلفاء میں حضرت شیخ موسیٰ زہگیر، خواجہ میر علی، مولانا شمس الدین گنائی، خواجہ ابراہیم گنائی، مولانا حسن لنکر، شیخ محمد یوسف جن، خواجہ موسیٰ مانجو، بابا ابراہیم ساگامی، خواجہ لطف اللہ اسلام آبادی اور زینہ ولی رحمہم اللہ تعالیٰ قابلِ ذکر ہیں۔

سلطان یعقوب شاہ چک کے زمانے میں جب شہر کے حالات پر آشوب ہو گئے تو بہت سے صوفیہ وادی سے باہر چلے گئے۔ آپ بھی کوہستانی علاقے میں چلے گئے مگر تبدیلی حکومت کے بعد سنہ ۹۹۶ھ میں خلفاء وعقیدت مندوں کے اصرار پر شہر واپس آئے اور فتحکدل میں ایک خانقاہ اور دوسرائیں تعمیر کرائیں۔ یہاں لنگر جاری ہوا اور ضرورت مندوں کے لئے کام شروع ہوا۔ یہیں یکم ذی الحجہ ۱۰۰۱ھ کو آپ نے انتقال فرمایا۔ محلہ اردو بازار، رفیقی کوچہ، فتح کدل میں قبر مبارک ہے۔

خواجۂ اعلیٰ مراتب سالکاں را پیشوا

شیخ طاہر مرشدِ حقانی وپیر ہدیٰ

ملا فیروز گنائی:

ملا فیروز گنائی رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے نامور مفتی تھے اور پَپّی گنائی کے نام سے مشہور

تھے۔آپ کے والد کا نام تونی گنائی تھا جو ملیچی گنائی کے نام سے مشہور تھے۔آپ ۹۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔یہ خاندان خوشنویسی میں یکتا تھا۔حضرت بابا داؤ دخا کی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی خاندان کے ایک فرد تھے جو خوشنویسی اور شاعری کے علاوہ تصوف کے لئے بھی جانے جاتے ہیں۔

ملا فیروز گنائی علیہ الرحمہ زبردست عالم اور فقہ کے ماہر تھے۔آپ کو ابتدا میں تصوف وعرفان کے راستے پر چلنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔حضرت محبوب العالم کے حالات سنے تو آستانہ عالیہ پر حاضری دی اور فیوض و برکات دیکھ کر بیعت کر لی۔طریقت کے رموز سیکھے اور خلوت اختیار کر کے ذکر واذکار میں مشغول ہو گئے۔پھر مرشد کے حکم سے حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہو گئے۔حج سے واپسی پر بدایوں آئے جو ہندستان میں علم و ہنر کا مرکز تھا۔یہاں ایک مدت تک تحصیل علم کرتے رہے اور قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کے علاوہ علمِ کلام اور منطق وفلسفہ میں بھی کامل ہو گئے۔تب کشمیر آئے اور یہاں مفتی اعظم کے عہدے پر متمکن ہوئے۔اپنی ذمہ داریاں انتہائی دیانتداری سے ادا کرتے تھے اور یہاں کثیر تعداد میں لوگ آپ سے مستفید ہوتے رہے۔مغل بادشاہ اکبر کے استاد مخدوم الملک آپ کے شاگرد تھے۔اسی طرح ملا الماس گنائی جو بڑے عالم وفاضل تھے آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔

ملا فیروز گنائی کی عمر جب ستر سال ہوئی تو آپ پر یوسف منڈو نامی شخص کے قتل کا الزام لگا۔یہ سلطان حسین شاہ چک کا زمانہ تھا۔اسی الزام میں آپ کو گرفتار کر کے شہید کر دیا گیا۔یہ ۹۷۳ھ کا واقعہ ہے۔شہادت کے بعد ملا محمد شاہ بدخشانی کی مسجد کے قریب کوہِ ماران کے دامن میں دفن کئے گئے۔

ملا شمس الدین پال:

ملا شمس الدین پال رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے عالم باکمال تھے۔بڑے بڑے علماء نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔جن میں شیخ بابا داؤ دخا کی اور ملا داؤ دطوسی جیسے مشہور زمانہ اہل علم بھی شامل تھے۔ابتدا میں بلند مرتبہ عالم ہونے کے باوجود عشق وعرفان کی دولت سے محروم

تھے۔ حضرت محبوب العالم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مولانا شمس الدین پال کا سینہ علم سے مالا مال ہے لیکن وہ علم جس میں اللہ کی معرفت اور عرفان کا شائبہ نہ ہو وہ ایک ایسے باغ کی طرح ہے جس میں سلسبیل کا چشمہ نہ ہو۔ ایک درخت کی کی طرح ہے جس میں میوہ نہ ہو، ایک حیوان کی طرح ہے جو عقل سے محروم ہو، ایک خوشنما پھول کی طرح ہے جو خوشبو سے خالی ہو، ایک مکان کی طرح ہے جو مکین سے محروم ہو، ایک عورت کی طرح ہے جو زیور سے خالی ہو، ایک مرد کی طرح ہے جو قوتِ مردانگی سے محروم ہو۔۔۔ ابھی آپ یہ فرما رہے تھے کہ ملا شمس الدین پال دروازے سے داخل ہوئے۔ مکان اور فرش وغیرہ کو دیکھا، ساتھ ہی محبوب العالم کے لباس وغیرہ پر نظر ڈالا۔ کچھ دیر بعد واپس لوٹے تو محبوب العالم نے حکم فرمایا کہ میرا لباس اور فرش وغیرہ ملّا کے گھر پہنچا دیا جائے۔ حکم پر عمل ہوا اور سب کچھ پہنچا دیا گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت شمس الدین پال شرمندہ ہوئے اور واپس آکر آپ کی بیعت کی۔ ذکرواذکار کثرت سے کرنے لگے اور عبادت وریاضت میں لذت پانے لگے۔ آخری عمر میں حرمین شریفین کی زیارت کے لئے گئے اور مدینہ طیبہ میں رحلت فرمائی۔ جنت البقیع میں دفن ہونے کی سعادت پائی۔

ملا شمس الدین پال کو مرزا حیدر کاشغری کے عہد میں عروج حاصل ہوا تھا۔ آپ کو اعلم العلماء کا خطاب عطا ہوا تھا۔ مباحثوں اور مناظروں میں مخالفین آپ کا لوہا مان لیتے تھے۔ آپ کے سب سے مشہور شاگرد ملا داؤد طوسی تھے۔

خواجہ عطار گنائی:

گنائی خاندان سے تعلق رکھنے والے خواجہ عطار گنائی، محبوب العالم کے مرید تھے۔ والد کا نام زیتی گنائی تھا اور دیدہ مر کے علاقہ میں اصل وطن تھا۔ خاندان کے دیگر افراد بھی علم وہنر میں کمال رکھتے تھے۔ خواجہ عطار تجارت پیشہ تھے اور اس سلسلے میں اکثر ہندستان، تبت سے لے کر کاشغر تک سفر کرتے رہتے تھے۔ بعد میں موضع اوسن پرگنہ لار میں سکونت اختیار کرلی۔ تقویٰ وپرہیز گاری کے راستے پر چلتے تھے اور روحانیت میں دلچسپی تھی۔ اسی جذبے کے تحت محبوب العالم

کے ارادتمندوں کے حلقے میں شامل ہو گئے۔مرشد نے ایک خاص موقع پر تجارت سے روک کر مکمل طور پر سلوک کے راستے پر لگا دیا۔فرمایا اب تمہارا سودا خدا سے ہے۔اسی کے ساتھ آپ کے دل میں بھی روحانیت کا سودا سما گیا۔مرشد نے تربیت اور تزکیۂ نفس کے لئے اپنے خلیفہ خاص حضرت بابا میر حیدر تیلہ مولی کے حوالے کر دیا جنھوں نے آپ کو معرفت وعرفان میں کامل بنا دیا۔اکثر مراقبہ اور ذکر واذکار میں مصروف رہتے تھے اور اوراد ووظائف میں مشغول رہتے تھے۔۹۸۷ھ میں انتقال ہوا اور موضع اوسن، لار میں دفن کیے گئے۔

خواجہ عثمان کول:

خواجہ عثمان کول، حضرت محبوب العالم کے مرید تھے اور آپ کی رہنمائی میں راہِ سلوک طے کر کے ولایت کے مقام تک پہنچے تھے۔ابتدا میں آپ کی زندگی بے راہروی کی شکار تھی اور عیش وعشرت میں بسر ہوتی تھی۔دین وشریعت سے دور تھے، غفلت شعاری کے شکار تھے۔نماز اور دین کے احکام کی پابندی بالکل نہیں کرتے تھے۔اسی دوران محبوب العالم سے رابطے میں آئے، جنھوں نے آپ کو اس بے راہ روی پر سخت تنبیہ فرمائی۔اس کا یہ اثر ہوا کہ اچانک دل کی دنیا میں انقلاب برپا ہوا۔عشرت وبے احتیاطی سے نفرت ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ چھوڑ کر حقیقت ومعرفت کے راستے پر چل پڑے۔محبوب العالم نے بیعت لی اور شفقت بھری ایک نگاہ ڈالی تو آپ کی نگاہوں کے سامنے سے تمام پردے اٹھ گئے۔صاحبِ کشف ہو گئے اور پوشیدہ حقائق تک نظریں پہنچنے لگیں۔رزقِ حلال کھانے میں بھی احتیاط سے کام لینے لگے۔یہاں تک کہ روزی کے لئے کتابت کے مشغلے کو اپنایا۔راہِ سلوک پر چلتے ہوئے درجۂ کمال تک پہنچے۔صاحبِ استغراق ہوئے اور کشف وکرامات کا صدور رہا۔

خواجہ عثمان کول رحمۃ اللہ علیہ نے حج بیت اللہ کا سفر کیا اور روضہ مبارک کی زیارت کے بعد مدینہ میں رہائش اختیار کر لی۔یہیں آپ کا انتقال ہوا اور یہیں پیوند خاک ہونے والے خوش نصیب بنے۔

سید مبارک خاں بیہقی:

ایک زمانے میں بیہقی سادات کشمیری حکومت پر اپنا اثر رکھتے تھے۔ایسے ہی معزز سادات میں سید مبارک خاں بیہقی بھی تھے،جن کے والد کا نام سید ابراہیم خاں بیہقی تھا۔اس خاندان میں دنیاوی جاہ حشمت تھی۔ملکی سیاست پر اثر انداز ہوتے تھے اور جنگ جوئی میں بھی ماہر تھے۔سید مبارک خاں بیہقی نے چک حکمرانوں کے عہد میں ملکی سیاست میں اہم کردار نبھایا۔سلطان علی شاہ چک کی موت کے بعد اس کے بیٹے یوسف شاہ چک کو تخت پر بٹھایا اور خود وزیرِ اعظم بنے۔بعد میں یوسف شاہ چک کی جگہ خود بادشاہ بنے مگر اس کے باوجود درویشی آپ کے مزاج میں تھی لہٰذا تاجِ شاہی کے زرو جواہر کو بھی فقیروں میں بانٹ دیا۔کچھ دن بعد حکومت سے معزول کر دیئے گئے اور مکمل درویشانہ زندگی بسر کرنے لگے۔جب کشمیر پر مغلوں کا قبضہ ہوا تو آپ کو دیگر بااثر امراء کے ساتھ اکبر بادشاہ کے پاس بھیج دیا گیا۔شہنشاہ اکبر نے آپ کو کشمیر کی حکومت سنبھالنے کی پیشکش کی جسے آپ نے ٹھکرا دیا لہٰذا آپ کو بنگال کی طرف جلاوطن کر دیا گیا ابھی آپ بنگال نہیں پہنچ پائے تھے کہ راستے میں انتقال ہو گیا۔یہ ۹۹۴ھ یا ۹۹۹ھ کی بات ہے۔آپ کی قبر،مقبرہ بہاء الدین گنج بخش میں ہے۔

سید مبارک خاں بیہقی کو محبوب العالم سے ارادت تھی۔مرزا حیدر کاشغری کے عہد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہو گئے تھے۔مخدوم نے عبادت وریاضت اور ذکر وفکر کی تلقین کی تھی۔جس سے آپ کی شخصیت میں انقلاب آ گیا تھا۔اسی کا اثر تھا کہ بادشاہ بن کر بھی مزاج میں درویشی تھی۔

سادھو ہیں اگر تو راجہ بنئے
راجہ ہیں اگر بنواس رکھئے

بابا علی دیگ شو:

حضرت بابا ملا علی دیگ شو رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند مرتبہ عالم دین تھے۔مختلف علوم میں

دستگاہ رکھتے تھے۔اسی لئے امراء، وزراء اور بادشاہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر مامور کیا تھا۔اعلیٰ منصب داروں سے تعلقات تھے۔ایک دن محبوب العالم کی خدمت میں پہنچے اور بیعت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ نے منع فرمایا اور کہا کہ مرید ہونے سے پہلے دنیاوی کثافت سے پاک ہوجاؤ۔یہ سنتے ہی دنیاوی زندگی کو چھوڑ کر محبوب العالم کے ارادتمندوں میں شامل ہوگئے۔تزکیۂ نفس اور مجاہدے کے لئے جو کام سب سے پہلے آپ کے سپرد کیا گیا وہ تھا خانقاہ میں جھاڑو لگانے کا۔اس کے بعد باورچی خانے کی خدمت پر مامور کئے گئے۔یہاں برتن اور دیگ مانجھنے کا کام سپرد ہوا۔برتن مانجھتے ہوئے نفس کی کثافت کو بھی مانجھ ڈالا اور محبوب العالم کے مرید بن کر لنگر کے منتظم ہوگئے۔مرشد کی صحبت اور تربیت سے عشق وعرفان حاصل کیا اور درجہ کمال تک پہنچے۔کشف ومشاہدہ حاصل ہوا۔محبوب العالم کے سوز قلب کو جو حضرات محسوس کر سکتے تھے ان میں ملا علی دیگ شو بھی تھے۔آپ آخری وقت تک مخدوم منڈو میں رہے۔

دیگر مریدین وعقیدت مند:

حضرت محبوب العالم کے مریدین اور عقیدت مندوں میں عوام وخواص کا ایک بڑا طبقہ شامل تھا۔بادشاہوں اور امیروں سے لے کر فقیروں اور مجذوبوں تک آپ کے ارادت مندوں میں شامل تھے۔ایسے ہی ایک مرید حضرت سید میر خاں تھے جو گلکاری کا پیشہ کرتے تھے۔اپنے فن کے ماہر تھے۔عبادت وریاضت اور مجاہدے کے بعد خاص مریدین میں شمار ہونے لگے تھے۔کوہِ ماران پر انھوں نے ایک چبوترہ بنایا تھا جس پر محبوب العالم بیٹھا کرتے تھے۔مخدوم نے یہیں دفن کرنے کی وصیت کی تھی اور مرشد کے مزار کے قریب ہی سید میر خان کی قبر بھی ہے۔

ملا صوفی اللہ داد حضرت محبوب العالم کے ارادتمند اور اور خدمت گزار تھے۔صاحبِ حال وقال تھے۔مرشد کی نگاہوں میں محبوب تھے ہر وقت خدمت میں مستعد رہتے تھے۔صاحبِ کشف وکرامت تھے اکثر مدہوشی اور محویت میں رہتے تھے۔یہ ان صوفیہ میں سے تھے جن پر ہمیشہ بادہ الست کا خمار رہتا ہے۔

میر عبداللہ قاضی، حضرت محبوب العالم کے خاص مرید تھے۔ وہ زبردست عالم وفاضل تھے اور لوگوں کو درس دیا کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ایک قطعہ زمین ملا تھا جس پر کاشتکاری کر کے اپنی ضرورتیں پوری کیا کرتے تھے۔ قناعت پسند تھے اور طلباء سے کوئی معاوضہ نہیں لیا کرتے تھے۔ یہ بے حد متوکل تھے۔

خواجہ بہرام رینہ اپنے عہد کے مشہور تاجر تھے۔ عیش عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ علم والے تھے، مگر جب مخدوم کی خدمت میں آئے تو دنیا کی تمام برائیوں کو چھوڑ کر تقویٰ کی زندگی شروع کردی۔ لمبی مدت تک روزے رکھتے اور اوراد و وظائف کی کثرت کرتے تھے۔ تجارت چھوڑ دی اور اپنا مکمل وقت تصوف میں لگادیا۔

میاں مانک شاہ، صاحبِ استغراق صوفی تھے۔ اپنے مرشد محبوب العالم سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ بغیر تازہ غسل اور وضو کے کبھی خدمت میں حاضر نہیں ہوتے تھے۔ یہ رزقِ حلال پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور کھیتی باڑی کر کے معاش چلاتے تھے۔ عمر کے آخری حصے میں زینہ واری کی خانقاہ میں گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ یہیں انتقال ہوا اور یہیں دفن ہوئے۔ آپ کا اصل نام عبدالرحمن تھا مگر مانک شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ مزاج پر مجذوبیت کا غلبہ تھا۔

ریگوڈار نامی محبوب العالم کے ایک مرید تھے، جو فوجی کیمپ میں ملازم تھے۔ صاحبِ ثروت تھے۔ حکومت کے اہم عہدوں پر فائز رہے مگر بعد میں حکومتی عہدے سے دست بردار ہو گئے اور خلوت نشین ہو کر عبادت میں محو ہو گئے۔ بے حد سخی انسان تھے۔ عالی کدل سرینگر میں وسیع مساجد اور باغوں کی تعمیر کرائی۔ جس طرح انھوں نے بڑا دنیاوی منصب پایا اسی طرح خدا پرستی میں بھی بلند جذبے کے ساتھ مصروف ہوئے۔ انتقال کے بعد محلہ صورہ، سرینگر میں دفن ہوئے۔

شیخ بہرام خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اپنے مرشد کے حکم سے دنیا چھوڑ کر گورٹینگو کے غار میں خلوت نشیں ہو گئے۔ آپ مسلسل روزے رکھتے تھے اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا مقصد نفس سے جہاد کرنا تھا۔ مرشد کی تربیت سے منازل سلوک طے کر کے تصوف میں بلند

مقام پایا۔انتقال کے بعد گورٹینگو گاؤں میں دفن ہوئے۔

مولانا میر محمد افضل ایک بڑے عالم وفاضل تھے۔مخدوم کے ارادتمندوں میں تھے۔درس وتدریس کا کام انجام دیتے تھے۔حضرت بابا داؤد خاکی آپ کے شاگردوں میں تھے۔مولانا میر محمد افضل ایک نیک سیرت پر خلوص انسان تھے۔جب راہِ عرفان پر سفر کا شوق ہوا تو محبوب العالم کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔مقاماتِ سلوک طے کیا اور حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہو گئے۔زیارتِ حرمین شریفین کے بعد حجازِ مقدس میں ہی انتقال فرمایا۔

حضرت شیخ بایزید شمہ ناگی راہ سلوک وتصوف کے راہ رو تھے اور محبوب العالم کے مرید تھے۔ایک حجرے میں گوشہ نشیں تھے جہاں ایک دریچہ نہ تھا۔اس حجرے کو آپ کے مرشد نے دیکھا تو خوش ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔بعد میں لوگوں نے چاہا کہ اس حجرے میں دریچہ لگوا دیں تو آپ نے صرف اس لئے منع کر دیا کہ آپ کے مرشد کو یہ ایسا ہی پسند تھا۔مرید ہو کر ریاضت ومجاہدہ کرنے لگے اور حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔شمہ ناگ علاقے میں آپ رہتے تھے اور یہیں آپ کا مدفن ہے۔

شیخ بابا حسن متولی محبوب العالم کے مرید تھے اور اکثر خانقاہ میں ٹھہرتے تھے۔حالانکہ یہ ایک صاحبِ مال ودولت شخص تھے اور اہل وعیال والے تھے۔موضع چندہ پورہ، پرگنہ کہاور پورہ کے باشندہ تھے اور سلطان العارفین شیخ حمزہ رینہ بھی ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔آپ عیش مقام کے رشیوں کے سردار تھے اور عبادت وریاضت میں محو رہتے تھے۔

مجذوب زیتی شاہ پہلے ہوش وادراک والے تھے اور سلطان علی شاہ چک کے عہد میں سپہ سالار تھے مگر ایک بار بجلی گری اور پھر ہوش وحواس کھو بیٹھے۔آپ کے خاندان کے لوگ اہم عہدوں پر فائز تھے۔آپ محبوب العالم کے عقیدت مندوں میں شامل تھے اور اکثر خدمت میں آیا کرتے تھے۔زیتی شاہ کو صاحبِ کشف وکرامت مجذوب کے طور پر شہرت ملی اور بھی درگھولہ کے شمال میں ان کی قبر پر زائرین کی بھیڑ رہتی ہے۔اس گاؤں کا نام اب 'زیتی شاہ صاحب' ہو گیا ہے۔

خواجہ زین علی کاؤسہ کشمیر کے متمول تاجر تھے۔ ہندستان کے مختلف علاقوں میں تجارت کی غرض سے آیا جایا کرتے تھے۔ اپنے مرشد حضرت محبوب العالم سے بیحد عقیدت رکھتے تھے۔ دنیا چھوڑ کر انھوں نے عرفان ومعرفت کی راہ اختیار کی۔ آپ ہروقت خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔

میاں درویش محمد بھی محبوب العالمؒ کے مخصوص مریدوں میں تھے۔ اصلی وطن لاہور تھا۔ بہت سے صوفیوں اور درویشوں کی خدمت سے مستفید ہوئے تھے۔ جب محبوب العالم کی خدمت میں پہنچے تو درجہ کمال تک رسائی ہوئی۔

یہ تو وہ باعظمت ہستیاں تھیں جن کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے۔ ان لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا اور انھوں نے حضرت محبوب العالم کی بارگاہ سے استفادہ کیا ہے۔ ایسے لوگ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہیں۔

اس مضمون کی جانکاریاں درج ذیل کتابوں سے لی گئی ہیں:

ا۔ تذکرہ اسلاف
۲۔ خوارق السالکین
۳۔ اسرار الابرار
۴۔ اسرار الاخیار
۵۔ تحفہ محبوبی
۶۔ قصیدہ لامیہ
۷۔ ذکر ساداتِ اندرابیہ
۸۔ واقعاتِ کشمیر
۹۔ تاریخ اقوامِ کشمیر (محمد دین فوق)
۱۰۔ نور نامہ

جس شخص نے کوئی خواہش چھوڑ دی، پھر اس کے دل کو کوئی
چیز اس کے بدلے میں نہیں ملی تو سمجھ لو کہ وہ اسے ترک
کرنے میں جھوٹا ہے۔

(خواص)

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغِ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

اقبالؔ

محبوب العالم کے چند با کمال خلفاء

حضرت محبوب العالم، سلطان العارفین، مخدوم شیخ حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ ایک با کمال شخصیت کے حامل تھے اور آپ کی نگاہ کیمیا اثر نے بہت سے افراد کو منزل تک پہنچا دیا۔ ان میں سے بعض کو آپ سے خلافت وارشاد حاصل ہوئی اور بعض نے صرف استفادہ کیا۔ جن حضرات نے مخدوم کے خرمنِ کمال کی خوشہ چینی کر کے تصوف میں بلند مقام حاصل کیا اور انھیں خلافت واجازت حاصل ہوئی ان میں کچھ نام زیادہ اہمیت کے حامل تصور کئے جاتے ہیں۔

حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولی:

میر بابا حیدر تیلہ مولی رحمہ اللہ علیہ اپنے عہد کی ممتاز شخصیت ہیں۔ آپ کو سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ رینہ کا خلیفہ اول ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اپنے پیر مرشد سے والہانہ

محبت کرتے تھے اور عبادت وریاضت میں مرشد کے پرتو تھے۔ وطنِ اصلی تو گجرات تھا مگر کشمیر کے تیلہ مولہ علاقے میں قیام تھا۔ تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ وہ اپنی کتاب 'ہدایت المخلصین' میں خود کو صحیح النسب سید تحریر کرتے ہیں۔ والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو چکا تھا لہٰذا چچا نے بالغ ہونے تک پرورش کی۔ حضرت میر بابا حیدر ایک زبردست عالم اور شاعر کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ صوفی تھے۔ نوجوانی میں ہی راہ سلوک پر چلنے کی چاہت ہوئی اور گجرات سے کشمیر آ گئے۔ یہاں مخدوم کی خدمت میں حاضر ہوکر روحانیت کی تعلیم پائی۔ پہلے مرید ہوئے اور پھر خلافت پائی۔ آپ کو محبوب العالم کے حلقۂ ارادت میں اس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ 'مخدومِ ثانی' کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ صوفیہ اپنے مریدین کو ریاضت ومجاہدہ کی منازل سے گزار کر منزل کمال تک پہنچاتے ہیں۔ مخدوم ثانی کو بھی اس منزل سے گزرنا پڑا۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق آپ نے بھی خوب چلہ کشی اور ریاضت کی ہے۔ یہاں تک کہ چالیس چالیس دن ایک افطار اور طہارت پر گزارے۔ کئی بار چالیس چالیس دن خلوت میں گزارے۔ ایک لمبی مدت تک بغیر کھائے، پئے رہنے کا ذکر عام طور پر صوفیہ کے تذکروں میں ملتا ہے مگر اس تعلق سے اربابِ عقول شبہات کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ سوال جب آپ کے سامنے پیش ہوا تو فرمایا:

> ''جو قوت ذکر وفکر سے پیدا ہوتی ہے وہ تحریر وتقریر میں نہیں آسکتی ہے
> اور نا ہی ظاہری خورش کو اس کے برابر قوت ہے۔ بیداری کی خورش کو
> خواب میں نعمتیں کھانے سے کیا نسبت ہے۔ ظاہری طور پر کھانے پینے
> سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اس سے بڑھ کر قوت، شربتِ ذکر وفکر
> سے حاصل ہو جاتی ہے۔''

(تذکرۃ العارفین، صفحہ-۳۵۹)

حضرت میر حیدر نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ ریاضت ومجاہدہ میں صرف کیا۔ کوہِ ماران کو اس معاملے میں خصوصیت حاصل ہے کہ بڑے بڑے اولیاء کرام نے اس کے دامن میں چلہ کشی اور مجاہدے کئے ہیں، اسکی ویرانی کو صدائے لا الہ الا اللہ سے آباد کیا ہے۔ میر حیدر

کے تذکرے بتاتے ہیں کہ آپ نے بھی یہاں تقریباً بارہ سال تک عبادت کی ہے، جس سے عام لوگ باخبر نہیں تھے مگر آپ کے مرشد آگاہ تھے۔ آپ لوگوں سے تحفے تحائف قبول نہیں کرتے تھے اور محنت ومشقت سے کما کر زندگی کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ دنیاوی جاہ حشمت سے دور فقر کی زندگی بتانا پسند کرتے تھے۔ آپ کا یہ مزاج محبوب العالم کو بے حد پسند تھا۔ آپ کے مریدین اور خلفاء میں بڑے بڑے باکمال اہل دل شامل تھے۔ جن افراد کی آپ نے روحانی تربیت فرمائی، ان میں خواجہ حسن قاری، خواجہ اسحاق قاری، خواجہ عطار گنائی شہرت کے حامل ہیں۔ آپ کے سینکڑوں تربیت یافتہ سلوک کے مراتب تک پہنچے۔ آپ نے کئی کتابیں بھی تحریر فرمائیں جن میں 'ہدایت المخلصین' کو شہرت ملی۔ حضرت میر حیدر اپنے مرشد کے بیحد چہیتے تھے۔ مرشد طریقت کو اپنا یہ مرید اتنا عزیز تھا کہ آپ کے مرید ہونے پر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آپ بھی مرشد سے بے حد محبت کرتے تھے اور آپ نے ان کی شان میں قصیدہ بھی لکھا ہے۔ مرشد نے خرقہ کے علاوہ آپ کو تبرکات بھی عطا فرمایا جو انھیں حضرت جمال الدین بخاری سے پہنچے تھے۔ ۸ر محرم الحرام ۹۹۹ھ کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ سرینگر کے تیلہ مولہ علاقے میں آپ کی قبر ہے، جہاں زائرین کی کثیر تعداد جمع رہتی ہے۔

امام اعظمِ ثانی بابا داوٗد خاکی:

آنکہ در علم وعمل روشن چو خورشیدِ صفا
شیخ دیں داوٗد خاکی قدوۂ اہلِ وفا

شیخ الاسلام شیخ بابا داوٗد خاکی رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے مشہور شاعر اور صوفی وعالم تھے۔ آپ کا اصل نام دولت تھا مگر میاں دتی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ داوٗد لقب اور خاکی تخلص تھا۔ آپ کے والد محترم کا نام خواجہ حسن گنائی تھا۔ آپ کے جد امجد بابا نتو گنائی سلطان زین العابدین بڈشاہ کے ندیم خاص تھے۔ کشمیری سلطانوں کے عہد میں گنائی انشا پردازوں

کو کہا جاتا تھا اور بابا داؤد خاکی کے اجداد انشا پردازی اور خوشنویسی میں یکتا تھے لہٰذا اس خاندان کے افراد کے ناموں کے ساتھ گنائی جڑ گیا۔آپ کا خاندان علمی خاندان تھا۔تمام افراد علم وفن کی دولت سے مالا مال تھے۔ یہاں کے مفتیانِ کرام اسی خاندان سے ہوتے رہے ہیں لہٰذا اس سے آپ کو بھی حصہ ملا اور علم ہنر میں یکتائے روزگار ہوئے۔

بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ۹۲۸ ھ کو ہوئی۔آپ کی ولادت جس محلے میں ہوئی اب وہ خاکی محلّہ نور پورہ کہلاتا ہے۔کم عمری میں ہی والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا مگر اس کے باوجود آپ نے تحصیل علم کیا۔نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور دیگر علوم کی جانب راغب ہوئے۔سترہ سال کی عمر تک تمام رسمی علوم سے فارغ ہو گئے۔ معقولات ومنقولات پر پوری دستگاہ حاصل کر لی اور نظم ونثر میں کمال پیدا کر لیا۔خوشنویسی آپ کے خاندان میں پشتوں سے چلی آرہی تھی اس میں بھی کامل ہو گئے اور بعد میں اسی کو پیشہ بنایا۔اپنے عہد کے معروف اہلِ علم سے اکتساب فیض کیا جن میں ملا بصیر اعمیٰ، مولانا رضی الدین اور ملا شمس الدین پال شہرت کے حامل تھے۔میر افضل کا مدرسہ علم کا گھوارہ سمجھا جاتا تھا کچھ دن یہاں زیر تعلیم رہے اور ملا فیروز گنائی جیسے باعلم استاد سے بھی علم حاصل کیا۔

حضرت بابا داؤد خاکی نے حصولِ علم سے فراغت کے بعد درس وتدریس اور خوشنویسی کو مشغلہ بنایا۔آپ کی علمی قابلیت اور حسن شعور کا شہرہ جلد ہی دور دور تک پھیلا اور شاہی دربار نے بھی آپ کی خدمات حاصل کیں۔آپ شہزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے، پھر حکومت کے ناظمِ تعلیمات اور قاضی القضاۃ کے منصبِ جلیلہ تک پہنچے۔سلطان علی شاہ چک اور یوسف شاہ چک کو آپ سے خاص ارادت تھی۔آپ نے ان کے لئے اپنی نظم میں دعائیہ اشعار کہے ہیں اور خیر وبرکت کی دعا فرمائی ہے۔

یارب ایشاں را زفضلِ خویشتن انعام کن

صحتِ ایماں وتنِ توفیق عدل اصلاح بال

علم وفن میں باکمال اور صاحبِ منصب ہونے کے باوجود آپ کا دل تصوف کی جانب

مائل تھا لہٰذا محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ رینہ علیہ الرحمہ کے حلقہ ارادت میں آ گئے اور جاہ جلال کو خیر آباد کہہ دیا۔ مرشد نے مجاہدے اور نفس کشی کا حکم دیا جس پر عمل شروع کر دیا۔ مناصبِ جلیلہ پر فائز رہ چکے بابا کو گھوڑوں کی خدمت اور اصطبل کی صفائی کے حقیر کاموں پر مامور کر دیا گیا اور آپ دل وجان سے یہ خدمت کرنے لگے۔ اس کے ساتھ مطبخ کے لئے پانی بھر کر لانا بھی آپ کی ذمہ داری تھی۔ ان معمولی کاموں کو کرتے ہوئے بھی ذکر واذکار میں مصروف رہتے مگر ابھی نفس کشی اپنے انجام کو نہیں پہنچی تھی ایک دن پیر کامل کا حکم ہوا اور آپ نے غریبوں اور چرواہوں کی طرح چمڑے کا لباس اور چمڑے کی ٹوپی پہنی، پیر میں گھاس کی جوتی تھی اور ایک خادم کی طرح مرشد کے گھوڑے کے آگے آگے پیدل چل پڑے۔ راہ گیر آپ کو اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئے اور دیوانہ سمجھنے لگے مگر آپ کمال عجز وانکسار کے ساتھ راستہ چلتے رہے۔ اپنی یہ حالت خود بھی انھیں عزیز تھی۔ فرماتے ہیں۔

پابرہنہ چوں زشوق اندر کالیش می دوم
خاروخاشاک طریقم بہتر از گلمرگ شداست

اس جہاد مسلسل نے آخر کار انھیں خادمیت سے مخدومیت تک پہنچا دیا۔ ویرانوں اور جنگلوں میں انھیں چلہ کشی کے لئے بھیج دیا گیا اور پھر وہ خودشناسی سے خداشناسی کی منزل تک پہنچے مگر اب بھی شاید تھوڑا سا علم کا احساس باقی تھا اور ماضی کی شان وشوکت کا کچھ شائبہ ذہن میں موجود تھا، جسے مرشد کی نگاہ فیض رسا ہی دور کر سکتی تھی۔ ایک دن مرشد نے ان علائق کو بھی دور کر دیا۔ دست مبارک کو آپ کے سینہ پر رکھ دیا۔ پھر ایک کتاب کی عبارت پڑھنے کو کہا مگر کوشش اور غور وفکر کے باوجود نہ پڑھ سکے۔ دوسری بار مخدوم نے اپنا مبارک ہاتھ سینے پر رکھا تو آپ کا سینہ عشق وعرفان کا گنجینہ بن گیا۔ علوم لدنی کی روشنی سے قلب جگمگا اٹھا۔ پھر مرشد نے خلافت واجازت سے نواز کر کاملیت کے درجے تک پہنچا دیا۔ اب مرشد کا عطا فرمودہ پیوندزدہ لباس بھی خلعتِ شاہی سے زیادہ محبوب ہو گیا اور خلافت کی چہار ترکی ٹوپی، تاجِ شاہی سے زیادہ عمدہ محسوس ہونے لگی۔ خود فرماتے ہیں۔

وقتِ بیعت چوں یدِ بیضا آں عیسیٰ نفس

داد دستم ،درز ماں دل زندہ وانور شد است

ایں کلاہِ پوستیں ویں خرقۂ پشمیں کہ داد

بندہ را بہ از قبائے شاہی وافسر شد است

پیر مرشد کے حکم کے بموجب آپ نے ملتان کا سفر کیا اور اپنے سلسلۂ پیراں کے مرقدوں پر حاضری دے کر قلبی ارادت کا اظہار کیا۔ یہاں کی خانقاہیں روحانیت کا مرکز تھیں، جہاں آپ نے ایک مدت تک قیام فرمایا۔ کچھ دن حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ کے روضے کی جاروب کشی بھی کی اور روحانی فیوض سے مالا مال ہوئے۔ حضرت سید اسماعیل شامی علیہ الرحمہ ایک بلند پایہ مردِ کامل تھے۔ جب یہ کشمیر تشریف لائے تو بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ سے برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے اور دونوں نے ایک دوسرے سے اکتساب فیض کیا۔ دونوں نے اپنے سلاسل کی ایک دوسرے کو اجازت دی۔ بابا داؤد خاکی تو سلسلہ سہروردیہ کے مجاز تھے ہی، سید صاحب موصوف سے آپ کو سلسلہ قادریہ کی اجازت بھی مل گئی۔ بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت سے رہ نوردانِ شوق نے استفادہ کیا اور کاملیت کے مقام تک پہنچے، مگر آپ کے خلفاء میں سب سے زیادہ شہرت حضرت بابا نصیب الدین غازی، شیخ مسعود پانپوری اور شیخ حاجی داؤد بلخی علیہم الرحمہ کو ملی۔

بابا داؤد خاکی علیہ الرحمہ ایک بلند پایہ شاعر اور قلمکار تھے۔ انھوں نے نثر و نظم میں اپنی بہت سی تخلیقات چھوڑی ہیں، جن میں سے بعض آج بھی دستیاب ہیں مگر بعض دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہ پائیں۔ آپ کی گرانمایہ تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ورد المریدین، قصیدہ جلالیہ، دستور السالکین، شرح ورد المریدین، قصیدہ غسلیہ، کمال نامہ اور نسخہ ضروریہ وغیرہ۔

بابا داؤد خاکی علیہ الرحمہ ایک مدت تک بندگانِ خدا کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ جب آپ ۹۹۴ھ میں بابا ہردی رشی سے ملاقات کی غرض سے اسلام آباد گئے تو یہیں ۳ر صفر کو آپ کا انتقال ہو گیا اور یہیں دفن کئے گئے لیکن بعض عقیدت مندوں کی کوشش سے آپ کو دوبارہ قبر سے نکال کر سرینگر لایا گیا اور کوہِ ماران کے دامن میں دفن کیا گیا۔ یہاں اپنے مرشد کے

پہلو میں دفن ہیں اور مزار پر کثیر تعداد میں عقیدت مند جمع رہتے ہیں۔

ماہر قرأتِ سبعہ خواجہ حسن قاری:

زانوارِ عمل روشن دلش شد

مقامِ لی مع اللہ حالش شد

خواجہ حسن قاری رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے صاحب حال بزرگوں میں سے تھے۔آپ کا مقام ولادت بلدیمر، سری نگر ہے۔آپ کی روحانی تربیت ابتدا میں میر بابا حیدر تیلہ مولی علیہ الرحمہ نے کی پھر سلطان العارفین شیخ حمزہ رینہ نے آپ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور مجاہدہ وریاضت کی منزلوں سے گزار کر یکتائے روزگار بنادیا۔

خواجہ حسن قاری صاحبِ علم وفضل تھے اور قرأتِ قرآن کے ساتوں طریقوں کے ماہر تھے۔آپ کو تجوید وترتیل میں مہارت تھی اور طرز ادا میں کمال حاصل تھا۔آپ نے اپنے دور کے مشہور ماہر قرأت مخدوم حاجی احمد علیہ الرحمہ سے قرأت سیکھی تھی۔علاوہ ازیں علومِ عربی اور نظم ونثر پر قدرت رکھتے تھے۔ابتدا میں درس وتدریس ہی آپ کا مشغلہ تھا۔آپ نے کئی کتابیں تحریر فرمائیں جن میں ایک 'راحت الطالبین' ہے۔اس کتاب کا موضوع تصوف اور اس کے مشاغل ہے۔ایک کتاب 'قائد السالکین' ہے۔یہ بھی تصوف کے موضوع پر ہے اور راہِ سلوک پر چلنے والوں کی رہنمائی کرتی ہے۔آپ کشمیر کے واقعہ نویس بھی تھے مگر واقعات نویسی کے مرقعات اب محفوظ نہیں ہیں۔آپ بہترین خوشنویس بھی تھے اور قرآن مجید کی کتابت سے روزی کماتے تھے۔حالانکہ راہِ سلوک پر آنے سے قبل آپ کپڑے فروخت کیا کرتے تھے۔ایسے لوگوں کی تعداد کثیر ہے جنھوں نے آپ سے درس پایا اور صاحبِ علم ہوئے۔اسی کے ساتھ آپ خوش فکر شاعر تھے اور فارسی زبان میں اعلیٰ درجے کے اشعار کہتے تھے۔نمونۂ کلام یہ ہے۔

شیوۂ مستانِ رحماں دیگر است

خرقۂ رندانِ سبحاں دیگر است

نے مسلماں است در تسبیح و ورد
جمعۂ زنار کیشان دیگراست
در دو عالم ہر کہ غیر از حق بجست
کافر است آں نہ مسلماں دیگراست
مرد عارف را وصال از وصل خویش
فی الحقیقت درمجازاں دیگراست
گوہرِ عرفاں زگنجِ دل بجو
اے حسن دیوانۂ جاں دیگراست

آپ کے مزاج میں تصوف کا جو رنگ نظر آتا ہے وہی آپ کے کلام میں بھی دکھائی دیتا ہے۔بات کو اشارے کنائے میں کہنے کے بجائے بے حد سیدھے سادے انداز میں کہہ دیتے ہیں جو سننے اور پڑھنے والا فوراً سمجھ لیتا ہے۔

خواجہ حسن قاری رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحبِ جاہ وحشمت شخص تھے مگر جب راہِ سلوک پر چلنے کا ارادہ کیا تو فقر کو اپنا لیا۔محبوب العالم کے حکم کے مطابق اپنے حال کو بنایا۔ابتدا میں آپ کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کا حکم ہوا۔اس کے بعد باورچی خانے کے لئے پانی لانے پر مامور ہوئے اور یہ خدمات بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے۔مرشد نے گوشہ نشیں ہو کر عبادت وریاضت کا حکم دیا تو ایک مدت تک گوشہ نشین رہے۔یہاں تک کہ چالیس چالیس دن تک فاقہ کشی کرتے رہے۔تذکرہ نویسوں کے مطابق موضع شیوہ میں آپ نے چالیس چلّے پورے کئے۔عبادت وریاضت میں آپ اس مقام تک پہنچے کہ خود فرماتے ہیں:

> ''اس ذکر سے میرے منہ میں ایک قسم کی مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔''

(تذکرہ اسلاف،صفحہ-۳۷۰)

آپ کے مرشد کامل بھی اس کیفیت سے خوش ہوتے تھے اور تعریف کیا کرتے

تھے۔فرماتے ہیں:

''جب قاری ذکرِ حق سے فارغ ہوئے اور میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے ان کے دل کو شگوفہ کی طرح کھلا پایا۔''

(دستور السالکین-۲۷۲)

خواجہ حسن قاری نے تصوف میں بلند مقام حاصل کیا اور اپنے دور کے صوفیہ میں ممتاز ہوئے۔پیرومرشد کی آپ پر خاص نگاہ تھی۔'راحت الطالبین' میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت سلطان العارفین نے بندۂ حقیر کو مقاماتِ علم الیقین اور عین الیقین طے کرا کے حق الیقین سے سرفراز فرمایا۔''

(ایضا صفحہ-۱۴۸)

آپ ایک صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے۔ہدیہ وتحفہ قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور محنت ومشقت سے روزی حاصل کر کے اہل وعیال کی پرورش کرتے تھے۔اپنے مرشد کے حکم سے موضع شیوہ، زینہ گیر میں رہائش اختیار کی اور خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔یہیں آپ کا انتقال ہوا۔۹۹۲ھ یا ۹۹۹ھ سال وصال ہے۔ہر سال کی ۲۷ رویں صفر کو آپ کا عرس منایا جاتا ہے، جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہی تاریخ وصال ہوگی۔

امام العارفین خواجہ اسحٰق قاری:

عزت از حق در رسید بسیار اورا از بلاد
خواجہ آں اسحٰق قاری اہلِ ورع واجتہاد

امام العارفین خواجہ اسحٰق قاری رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند مرتبہ ولی ہیں اور آپ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ مخدوم شیخ حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو باجماعت نمازوں کے لئے امام مقرر کیا تھا۔آپ محلہ بلدیمر، سرینگر کے رہنے والے تھے اور خواجہ حسن قاری کے چھوٹے بھائی تھے۔عمر میں ایک سال کا فرق تھا اور اپنے بھائی کی طرح تجوید وترتیل کے فن میں ماہر تھے۔تلاوتِ

قرآن مجید بے حد احترام اور آداب کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ تلاوت سے قبل نئے سرے سے غسل وطہارت کیا کرتے تھے۔ کمسنی میں ہی آپ نے قرآن پاک حفظ کرلیا تھا اور پھر مختلف اساتذہ سے دیگر علوم وفنون حاصل کیے۔ حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ سے 'عوارف المعارف' پڑھی اور شعر وسخن کے رموز بھی انھیں سے سیکھے۔ 'عین العلم' اپنے برادر بزرگ خواجہ حسن قاری سے پڑھی۔ حدیث کی تعلیم شیخ محمد علی رینہ سے پائی۔ ان کے علاوہ بھی دیگر اساتذہ فن سے مختلف علوم وفنون کا درس لیا۔

حضرت خواجہ حسن قاری رحمۃ اللہ علیہ خوشنویس تھے اور قرآن مجید کی کتابت کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اپنے بھائی کے ساتھ واقعات نویسی اور واقعات خوانی بھی کیا کرتے تھے۔ آپ نے ایک کتاب 'چلچلۃ العارفین' فارسی زبان میں تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب میں تصوف کے رموز بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں اپنے مرشد مخدوم حمزہ رینہ کے حالاتِ زندگی اور کشف وکرامات بھی بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ 'چراغِ معرفت' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک دوسری کتاب 'مجمع النکات' کے نام سے آپ نے عربی زبان میں تحریر فرمائی تھی۔ اس کا ذکر صاحبِ 'تذکرۃ العارفین' کرتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ خواجہ صاحب موصوف زبردست عالم اور نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ آپ کے اشعار میں صوفیانہ رنگ ہے۔ اپنے مرشد کی شان میں لکھتے ہیں

حیراں ملک، حیراں فلک، حیراں زمیں، حیراں زماں
از قربتِ شیخ چنیں، چوں شیخ حمزہ پیر ما
از خرمنِ پربار او، ہریک ولی کاشمیر
از کمترینِ خوشہ چیں، چوں شیخ حمزہ پیر ما
سلطان عارف در جہاں باشد چوں روشن برہمہ
ہم غوث الاعظم از یقیں، چوں شیخ حمزہ پیر ما
محبوب عالم شیخ من در عرش بیں اسمائے او

از ہر چہ خوانم خوشتریں، چوں شیخ حمزہ پیرما
زاسحٰق بشنو ایں سخن در گوش کن از ہوش خرد
کو پیریابی بہ ازیں، چوں شیخ حمزہ پیرما

خواجہ صاحب کی شاعری کے زیادہ نمونے نہیں ملتے مگر جو دستیاب ہیں وہ آپ کی خوش فکری اور قادر الکلامی کی مثال ہیں۔

خواجہ اسحٰق قاری رحمۃ اللہ علیہ کو شروع سے ہی تصوف میں دلچسپی تھی لہٰذا آپ ایک درویش سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہ درویش بھنگ پیتا تھا مگر جب محبوب العارفین شیخ حمزہ رینہ کی خدمت میں بیعت کے لئے پہنچے تو مرشد نے اس حرام کام سے توبہ کرایا اور شریعت کے احکام کی پابندی کی تاکید فرمائی۔ مرشد کے حکم سے آپ کی تربیت کا کام میر بابا حیدر نے کیا اور پھر مرشد کی نگرانی میں عشق و عرفان کی منزلیں طے کیں۔ دل و دماغ سے کبر و نخوت کو نکال کر پاکیزہ بنانے کے لئے جو کام آپ کے سپرد کیا گیا وہ تھا لکڑی کاٹ کر لانا۔ آپ مرشد کے لنگر کے لئے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتے تھے۔ اس کے بعد گھوڑوں کی نگرانی اور ان کے لئے بازار سے چارہ لانے کی ذمہ داری بھی آپ کو سونپی گئی۔ یہ تمام کام ایک نوکر کی طرح انجام دیتے تھے اور گھاس کندھے پر لاد کر لایا کرتے تھے۔ کچھ دن تک باورچی خانے کے معمولی کام بھی کرتے تھے۔ ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ ہی عبادت و ریاضت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ یہ تمام کام تزکیہ نفس اور تطہیر قلب کے لئے آپ سے کرائے جاتے تھے۔ جب آپ اس منزل کو پار کر گئے تو ایک وقت ایسا آیا جب مرشد نے باجماعت نمازوں کی ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی اور امام مقرر کر دیا۔ آپ ایک مدت تک یہ ذمہ داری بہ حسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ لگ بھگ بائیس سال تک موضع شیوہ، زینہ گیر میں مقیم رہ کر عبادت و ریاضت کرتے رہے۔ تین بار حج بیت اللہ ادا کیا۔ سفر حج کے دوران بغداد میں شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ عبد القادر جیلانی علیہما الرحمہ کے مزارات کی زیارت کی۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر بھی حاضری دی۔

خواجہ اسحٰق قاری رحمۃ اللہ علیہ عربِ مقدس کو جانے سے قبل تک سیالکوٹ اور لاہور میں

مقیم رہے۔ یہاں بہت سے علماء، فضلاء اور صوفیہ سے آپ کی ملاقات رہی۔ تین بار حج ادا کرنے کے بعد جب آپ مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ کی بارگاہ میں سلام عرض کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے تو اسی مقدس سرزمین پر انتقال فرمایا جنت البقیع میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن ہونے کی سعادت پائی۔

آپ کے ولادت و رحلت کی تاریخیں تذکرہ نگاروں نے درج نہیں کی ہیں البتہ بعض کا خیال ہے کہ ۹۹۷ھ کے بعد آپ کا انتقال ہوا۔

خواجہ میر بزاز سکندر پوری:

خواجہ میر بزاز سکندر پوری رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے خدا رسیدہ بزرگوں میں سے تھے۔ آپ نے مخدوم شیخ حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں راہ سلوک طے کی اور خلافت پا کر سچے جانشیں ثابت ہوئے۔ آپ کا وطن اصلی ترکستان کا علاقہ سکندر پورہ تھا۔ یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ خوبصورت اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ صاحبِ مال و ثروت تھے۔ خاندانی پیشہ تجارت تھا لہٰذا آپ بھی تجارت کرنے لگے لیکن نفسیاتی طور پر نیک اور تقویٰ شعار تھے۔ اپنے مال کو خدا کے راستے میں خرچ کرنا پسند کرتے تھے۔ ذکر و فکر میں محویت رہتی تھی۔ پیر و مرشد کی طلب تھی اور روحانیت کے راستے پر چلنے کے خواہش مند تھے۔ اسی تمنا کے ساتھ حج بیت اللہ ادا کیا اور روضہ مصطفوی کی زیارت کر کے سلام کا نذرانہ پیش کیا۔ پھر بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے اشارہ پا کر کشمیر کی طرف چل پڑے۔ کشمیر میں حضرت شیخ حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ طلب صادق اور مرشد کی نگاہ کیمیا اثر نے بہت جلد آپ کو کاملیت کے مقام تک پہنچا دیا اور خاص الخاص مریدین و خلفاء کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ اپنے مرشد سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ محبوب العالم کے انتقال کے بعد آپ اس قدر غمزدہ ہوئے کہ پہاڑوں، صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھاننے لگے۔ آتش فراق سے کسی کروٹ چین نہ آتا تھا۔ اسی دوران تسکین قلب کے لئے مرشد کے حالات زندگی لکھنے کا فیصلہ کیا جو تذکرہ

المرشدین' کی شکل میں ظاہر ہوئی۔اس میں دیگر صوفیہ کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔

مولوی شیخ احمد چاگلی:

ابنِ عربی ثانی مولوی شیخ احمد چاگلی رحمۃ اللہ علیہ علومِ ظاہری و باطنی میں یگانہ تھے۔ تصوف میں بلند مقام رکھتے تھے، جس کی وجہ سے ابن عربی ثانی کہا جاتا تھا۔حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ کے مرید وخلیفہ تھے اور ظاہری وباطنی علوم اپنے مرشد سے حاصل کئے تھے۔ چھ سال کی عمر میں حفظِ قرآن مکمل کرلیا تھا اور اس کے بعد دیگر علوم وفنون کے درس لینے لگے تھے۔ یہاں تک کہ حدیث وتفسیر کے علم میں ممتاز ہوگئے تھے۔تصوف کی کتاب 'گلشن راز' آپ کو پسند تھی۔ ہمیشہ اسے زیر مطالعہ رکھتے تھے۔نظم ونثر دونوں میں دسترس رکھتے تھے اور 'مثنوی رومی' 'حدیقہ شنائی' کا درس بھی دیتے تھے۔ چند کتابیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں، جن میں 'بحر التنزیل' اور 'ترجمان سلطانیہ' کا ذکر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ یہ دونوں ہی تصوف کے موضوع پر ہیں۔ 'بحر التنزیل' کو آپ نے املا کرایا تھا جب کہ 'ترجمان سلطانیہ' اپنے قلم سے تحریر فرمائی۔ اکثر استغراق میں رہتے تھے، لہٰذا جب کچھ کہتے تو دوسرے لوگ لکھ لیا کرتے تھے۔

شیخ احمد چاگلی کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ محبوب العالم کے مرید اول ہیں۔ جب آپ نے بیعت کی تو مرشد نے خلوت نشینی تجویز کی، چنانچہ آپ زینہ گیر کی پہاڑی پر چلے گئے اور جنگل کے بیچ ایک غار میں خدا کی عبادت میں مصروف ہوگئے۔ چھ سال تک یہیں عبادت میں مصروف رہے اور کسی انسان کو منہ تک نہیں دکھایا۔ جنگل میں مسلسل قیام کی وجہ سے چرند پرند اور خطرناک جنگلی جانور بھی آپ سے مانوس ہوگئے تھے۔ یہاں جنگلی پھولوں اور پتوں پر گزارا کرتے تھے۔ اس سخت ریاضت ومجاہدے کے بعد جب جنگل سے باہر آئے تو مرشد کے حکم سے موضع چاگل میں قیام فرمایا اور عوام الناس کو فیض پہنچاتے رہے۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔ اس دوران آپ نے حج بیت اللہ اور کشمیر کے باہر کچھ سفر بھی کئے۔

شیخ احمد چاگلی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی علاقے میں انتقال کیا۔ آپ کی نماز جنازہ اس دور کے مشہور بزرگ خواجہ حسن قاری علیہ الرحمہ نے پڑھائی۔ چاگل میں آج بھی آپ کا مزار زیارت

گاہِ قدسیاں ہے۔

شیخ احمد کے دیگر دو بھائی ملا عبدالعزیز اور ملا ابراہیم رحمہما اللہ تھے، جو ظاہری اور باطنی علوم میں باکمال تھے۔ انھیں اپنے عہد کے اہل تصوف میں ممتاز مقام حاصل تھا اور حضرت محبوب العالم سے خلافت واجازت حاصل تھی۔

حضرت میرم بزار:

حضرت میرم بزار رحمۃ اللہ علیہ صاحب ظاہر و باطن تھے، اسی کے ساتھ بہترین شاعر بھی تھے۔ اپنے کلام میں عموما وارداتِ قلبی کو پیش کرتے تھے جو مجاز نہیں سرتاپا حقیقت پر مبنی ہوتے تھے، مگر مرشد سے ملاقات کے بعد اس جانب توجہ نہیں رہی تھی۔ آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گزارا اور آپ کے بعد آپ کی اولاد بھی یہیں رہی۔ آپ کا مزار ہارہ مسجد، مدکھاہ کے علاقے میں ہے۔ تاریخ پیدائش ورحلت کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔

حضرت محبوب العالم کے دیگر خلفاء میں نمایاں شخصیت کے حامل تھے خواجہ داؤد طوسی علیہ الرحمہ جو ملا شمس الدین پال کے شاگرد تھے اور حضرت محبوب العالم نے انھیں سلوک کی تربیت فرمائی تھی۔ الغرض حضرت محبوب العالم کا فیض آپ کے بعد بھی جاری رہا اور آپ کے خلفاء آپ کے بعد آپ کے مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔ کشمیر کے گوشے گوشے تک حق وصداقت کا پیغام پہنچانے اور انسان کا رشتہ اس کے معبود کے ساتھ استوار کرنے میں آپ نے بہت اہم ذمہ داری ادا کی۔ محبوب العالم کے ذکر کے بغیر کشمیر میں تصوف وروحانیت کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ہزاروں تشنگان عرفان نے آپ کے میکدۂ معرفت سے تشنگی بجھائی اور فیضان کا سلسلہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری وساری ہے۔

سرشار مجھے فرما اک جامِ لبالب سے
تا حشر رہے ساقی آباد یہ میخانہ

❖○❖

اس مضمون کی جانکاریاں درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔تذکرۃ العارفین (بابا محمد علی رینہ)
۲۔خوارق السالکین
۳۔اسرار الاخیار
۴۔تحفۂ محبوبی
۵۔ہمارا ادب (جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی)
۶۔راحت الطالبین (خواجہ حسن قاری)
۷۔تذکرۃ المرشدین (میرم بزاز سکندر پوری)
۸۔ہدایت المخلصین (میر بابا حیدر)
۹۔دستور السالکین
۱۰۔اسرار الابرار
۱۱۔قصیدہ لامیہ
۱۲۔چلچلۃ العارفین (خواجہ اسحٰق قاری)
۱۳۔نور نامہ
۱۴۔تذکرہ اسلاف

حکیمی نامسلمانی خودی کی
کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گُر فقر وشاہی کا بتادوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

اقبالؔ

دو باکمال رشی بزرگ روپی رشی وہردی رشی

حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ سے بہت سے لوگوں نے فیض پائے اور ان میں سے بعض مقامِ کمال تک پہنچ کر خود بھی لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔ ایسے ہی فیض یافتگان میں حضرت شیخ روپی رشی اور شیخ بابا ہردی رشی رحمہما اللہ بھی شامل ہیں۔ ان دونوں کا تعلق یہاں کے نومسلم گھرانوں سے تھا، مگر ان حضرات نے علم ظاہری و باطنی میں دستگاہ حاصل کی اور دیگر علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ تصوف میں بھی ایک مقام پایا۔ دن روزے اور رات نماز میں گزارتے تھے۔ عوام وخواص میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ یہاں نومسلم گھرانوں کے صوفیوں کو رشی کہا جاتا تھا لہٰذا یہ دونوں حضرات رشی کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت شیخ روپی رشی رحمۃ اللہ علیہ ۸۷۷ھ میں پیدا ہوئے، اس طرح آپ عمر میں اپنے پیرومرشد محبوب العالم سے بڑے تھے۔ کم عمری سے ہی خدا طلبی کا جذبہ آپ کے اندر موجود

تھا، لہٰذا استرون کی پہاڑی چوٹی پر جنگل میں عبادت کرتے رہے۔ کھانا بہت کم کھاتے تھے اور جنگل کی گھاس، پتوں پر گزارا کرتے تھے۔ اسی طرح کم سے کم کپڑوں میں آپ نے اپنی زندگی گزاری۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق غیبی اشارہ پاکر جنگل سے باہر آئے اور محبوب العالم کی بیعت کی۔ پیر مرشد کے حکم سے چالیس چلّے گزارے۔ کچھ مدت کے لئے مسجد اہامہ میں بھی ٹھہرے۔ کبھی کشمیر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اکثر عبادت و ریاضت اور چلہ کشی میں مصروف رہتے تھے مگر اس کے باوجود دنیا کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے اور ہر طرح کے واقعات سے باخبر رہتے تھے۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ روزے میں گزارا۔ ابتدائی دور میں ہر تیسرے دن روزے کھولتے تھے، مگر بعد میں چالیس چالیس دن روزے رکھنے لگے۔ انتقال کے وقت بھی روزے سے تھے اور جب لوگوں نے آپ کو شربت پلانا چاہا تو منع کردیا۔ فرمایا، میں نے عہد کر رکھا ہے کہ اپنے رب سے ملاقات کے وقت روزے سے ہوں گا۔ ایک سو بیس سال کی عمر پائی اور ایک سو نو سال تک کثرت سے روزے رکھتے رہے۔

شیخ روپی رشی رحمۃ اللہ علیہ بے حد عبادت گزار اور مستجاب الدعوات تھے۔ آپ کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ بلکہ تذکرہ نگاروں کا یہاں تک کہنا ہے کہ آپ کی دعا سے کئی بار مردے بھی زندہ ہوا ٹھے اور گمراہوں کو ہدایت ملی۔ حبہ کدل سری نگر میں آپ کا قیام تھا اور اسی علاقے میں ۱۷ رمحرم الحرام ۹۷۷ھ کو انتقال ہوا۔ یہیں آپ کی آخری آرامگاہ ہے۔

کوہِ ریاضت زد علم بانگ بلند
لطفِ حق شد یار او تا گشتہ شیخ ارجمند

حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ ریشہ رحمۃ اللہ علیہ کے بلند اقبال مریدوں میں شیخ بابا ہردی ریشی علیہ الرحمہ بھی تھے۔ ان کا تعلق لہاروں کے ایک خاندان سے تھا۔ قصبہ اسلام آباد میں ۲۹ رجب ۹۰۹ھ کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے طاعت و عبادت میں آپ کی دلچسپی تھی۔ بلکہ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ آپ مادرزاد ولی تھے۔ ابھی ایک مہینہ کی عمر تھی کہ رمضان شروع ہوا تو دن کے وقت دودھ نہیں پیتے تھے۔ شروع سے ہی تلاش حق میں سرگرداں رہنے لگے۔ ذکر وفکر سے بے خود

ہو جاتے۔ ابتدا میں اویسیہ سلسلے سے منسلک ہوئے اور بعد میں حضرت محبوب العالم کے سلسلۂ طریقت میں داخل ہو گئے۔ خرقہ وکلاہ بہ طور تبرک پہنا اور آپ نے اوراد و وظائف کی مشق شروع کر دی۔ رشی بزرگوں کے ہاں گوشت مچھلی سے پرہیز دیکھنے کو ملتا ہے مگر بابا ہردی رشی پرہیز نہیں کرتے تھے۔ محبوب العالم کے ساتھ ایک موقع پر گوشت کھانے کا ذکر سوانح نگاروں نے کیا ہے۔

بابا ہردی رشی علیہ الرحمہ صاحبِ حال وقال بزرگ تھے۔ بے شمار کمالات کے حامل تھے۔ شریعت کے انتہائی پابند تھے۔ تمام نمازیں باجماعت ادا کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بے حد عاجزی کے ساتھ نفل پڑھتے، اوراد و وظائف پڑھتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ آپ کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ اس لئے اکثر لاعلاج مریض آپ کے پاس دعاؤں کے لئے آتے تھے اور صحت یاب ہوتے تھے۔ باطنی کشف نگاہوں میں تھا۔ جانوروں کی بولیاں سمجھ لیتے تھے۔ صبر وقناعت کے دلدادہ تھے۔ کبھی ننگے پاؤں چلتے تو کبھی گھاس کی بنائی جوتیاں پہن کر چلتے تھے۔ سادگی پسند تھے لہٰذا معمولی قسم کا لباس استعمال کیا کرتے تھے، جس میں زیب وزینت بالکل نہیں ہوتا تھا۔ حصول معاش کے لئے کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ عوامی مفاد کے کام بھی کرتے تھے۔ آپ نے مسجدیں تعمیر کرائیں اور عوام کے لئے مہمان خانے بنوائے۔ عام لوگوں کے کام آنا آپ کے معمولات میں شامل تھا۔ تذکرۃ العارفین کے مصنف کا بیان ہے کہ میں کاشغر میں تھا اور سخت مشکل میں تھا اس وقت بابا ہردی رشی نے میری مدد فرمائی، حالانکہ میں آپ کو پہچانتا تک نہ تھا۔

شیخ بابا ہردی رشی رحمۃ اللہ علیہ نے ۷۷ رسال کی عمر میں اسلام آباد میں انتقال فرمایا۔ آدھی رات کو عبادتِ الٰہی کے دوران آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یہ ذی قعدہ کی پہلی تاریخ ۹۸۶ھ کی بات ہے۔ یہیں آپ کی آخری آرام گاہ زیارت گاہِ خلائق ہے۔

در عبادت باکمال ودر ریاضت باصواب
شیخِ تقویٰ ہردی بابا ریشی عالیجناب

❖○❖

مضمون کی معلومات درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔تذکرہ اسلاف

۲۔اسرارالاخیار

۳۔خوارق السالکین

۴۔تذکرۃ العارفین

۵۔ہدایت المخلصین

۶۔واقعاتِ کشمیر

۷۔تذکرۃ المرشدین

۸۔اسرارالابرار

۹۔وردالمریدین

اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی قضا کے سامنے سرِ تسلیم وخم دینا توکل ہے۔

(ابن مشروق)

کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی
گیا دور حدیثِ لن ترانی
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

اقبالؔ

عمدۃ الصلحاء بابا محمد علی رینہ

زبدۃ العرفاء حضرت مخدوم محمد علی رینہ رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے بلند پایہ صوفیہ میں سے ہیں۔ بے حد عبادت گزار اور اطاعت شعار تھے۔ نفس کشی اور چلہ کشی پر عامل تھے۔ اسی کے ساتھ زہد و تقویٰ میں بھی کامل تھے۔ ظاہری علوم و فنون کی دولت سے مالا مال اور باطنی شعور میں صاحبِ حال تھے۔ آپ کی ولادت آبائی گاؤں تجر شریف میں ہوئی۔ بالکل درست تاریخ پیدائش تذکرہ کی کتابوں میں نہیں ملتی لیکن آپ محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ کے بڑے بھائی تھے جن کی پیدائش سنہ ۹۰۰ھ میں ہوئی تھی لہٰذا سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ اس سے قبل ہی پیدا ہوئے۔ بعض ضعیف اقوال کے مطابق آپ محبوب العالم کے چھوٹے بھائی تھے۔ ملا بہاء الدین متو نے اپنی کتاب سلطانی میں برادرِ خرد لکھا ہے، مگر تذکرہ نگار آپ کو بڑا بھائی قرار دیتے ہیں۔

مخدوم شیخ محمد علی رینہ علیہ الرحمہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزارا اور

تین بار حج کی سعادت سے بھی مشرف ہوئے۔سفر کی حالت میں مختلف اہل علم وتصوف سے ملاقات کی اوران کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔کشمیر میں بہت کم قیام فرمایااوراپنے بھائی محبوب العالم کے ساتھ اور بھی کم رہے اس لئے کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ دونوں بھائی ہیں۔آپ کے پیرومرشد آپ کے چھوٹے بھائی مخدوم حمزہ رینہ ہی تھے۔انھوں نے مرید کیاتو ریاضت ومجاہدے سے بھی گزارا۔اہلِ تصوف کا طریقہ رہا ہے کہ اپنے مریدین کوتربیت دیتے وقت ،ان میں عاجزی،انکساری کی صفات پیدا کرتے ہیں۔اس کے لئے انانیت اور تکبر کوختم کیا جاتا ہے۔کئی بارعزتِ نفس پر بھی دانستہ طور پر آنچ لائی جاتی ہے تاکہ آدمی ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہوجائے اوراس کے اندر سے گھمنڈوریااور خودنمائی کی خرابیاں نکل جائیں۔آپ کے مرشد محبوب العالم نے بھی آپ کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ایک دن فرمایا:

''جب تک اپنے سر سے یہ خودی دور نہ کروگے کہ میں محبوب العالم کا بھائی ہوں،میرے اسرار سے واقف نہیں ہو پاؤ گے۔طالبی کے حق کو بجالاؤ۔''

(ہدایت المخلصین ،صفحہ-۱۵۷)

مرشد کے اس فرمان کے بعد آپ کو دربانی اور گھوڑوں کی نگہبانی کی ذمہ داری سونپی گئی۔لگ بھگ ایک سال آٹھ ماہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔اس طرح مجاہدہ اور نفس کشی کے دور سے بھی گزرتے رہے۔ایک مدت تک ملتان اور لاہور میں قیام فرما کروہاں کے اہل سلوک سے تربیت پائی۔کئی اولیاءاللہ سے ملاقات کے واقعات انھوں نے اپنی کتاب 'تذکرۃ العارفین' میں بیان کئے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جب میں کشمیر سے نکلاتو پہلے پہل میں نے بہت مدت کے لئے لاہور میں قیام کیا۔لاہور میں ایک بڑے پائے کے بزرگ حضرت شیخ احمد غوث تھے جوکہ زیادہ ترخلوت گزیں ہی رہا کرتے تھےاورلوگوں سے بہت کم ملتے تھے، میں ان کے پاس ٹھہرا۔انھوں نے میری بہت خاطر تواضع کی۔میرے دلِ ناصبور میں ان سے بیعت کرنے کاشوق پیدا ہوا۔ان سے پوچھا کہ آپ

کس عزیز کے مرید ہیں۔ انھوں نے جواب باصواب میں فرمایا کہ، میں آپ کے عزیز بھائی محبوب العالم حضرت شیخ حمزہ رینہ جو کہ کشمیر میں ہیں کا مرید ہوں۔"

(تذکرۃ العارفین، صفحہ-۴۴۲)

حضرت بابا محمد علی رینہ نے ہندوسند کے مختلف صوفیہ، اولیاء اور علماء سے استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ صرف خطہ عرب کے علماء سے بارہ سال تک تحصیل علم کرتے رہے۔ روحانی تعلیم بھی مختلف اولیاء اللہ سے پائی مگر اس کی تکمیل اپنے بھائی محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں:

"قطب العرفاء مخدومنا سید ابوالبقا بلند مرتبہ اولیاء کرام میں سے ایک ہیں۔ ان کے پاس بہت مدت کے لئے ٹھہرا۔ ایک دن میں ان کے گھر میں ان کے سامنے بیٹھا تھا کہ کوئی عزیز ایک خط لے کر ان کے پاس آیا۔ انھوں نے یہ خط پکڑا اور کھول کر پڑھا۔ اس کے بعد مجھے مطالعہ کرنے کے لئے دیا۔ یہ خط سید موصوف کو محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہ کی طرف سے آیا تھا۔ اس خط کا قاصد ایک مرد غیبی تھا۔ اس پر یہ عبارت لکھی تھی:
(ترجمہ) ھوالقدوس۔ قدوۂ ارباب عمل، زبدہ اصحاب کُمل، برادر دین، شیخ الاسلام والمسلمین مخدومنا الاولیاء، سید ابوالبقا مشتاق بقا ہوں۔ آپ پر روشن ہو کہ میرے بھائی محمد علی رینہ جو کہ میرے برادر عینی ہیں، آپ کی خدمت میں پہنچے ہیں۔ ہر باب میں ان کی تربیت والفت میں ممتاز رکھیں اور اپنوں میں سے شمار کریں۔"

حضرت بابا محمد علی رینہ رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے اہل کمال سے تربیت پا کر منزل کمال کو پایا۔ آپ کے والد محترم شیخ عثمان رینہ نے زینہ گیر، تجر شریف کے علاقے میں بڑی جائداد وراثت میں چھوڑی تھی مگر یہاں کی جائیداد سے آپ کی دلبستگی بالکل نہیں تھی۔ یونہی آپ کے رشتہ

دار حکومت کے اہم عہدوں پر فائز تھے اور آپ کے خالو کشمیر کے وزیر اعظم تھے، مگر اس کے باوجود آپ دنیاوی جاہ و مرتبے سے دور رہ کر عبادت و ریاضت اور مجاہدہ و نفس کشی میں مصروف رہے۔ جہادِ نفس اور سلوک کی منزلیں تو اپنے بھائی شیخ حمزہ رینہ کی نگرانی میں طے کیں مگر خلعتِ ارشاد اور سندِ خرقہ حضرت سید حیدر تیلہ مولی سے حاصل کیا۔ تجر شریف آپ کی جائے پیدائش ہے اور یہیں آپ کا انتقال ہوا۔ یہاں آپ کے مقبرے پر ماہ صفر میں عرس کی تقریب ہوتی ہے۔ آپ کی قلمی کاوش 'تذکرۃ العارفین' آپ کے بھائی مخدوم شیخ حمزہ رینہ کے حالاتِ زندگی بیان کرتی ہے۔ آپ کی دیگر تصانیف 'رسالہ محیط، مرکز الابرار، نسیم الاحرار، شواہد المراقبات، جواہر النکات اب دستیاب نہیں ہیں۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے جانکاریاں حاصل کی گئی ہیں:

۱۔تذکرۃ العارفین
۲۔تذکرۃ المرشدین
۳۔تذکرہ اسلاف
۴۔خوارق السالکین
۵۔سلطانی
۶۔ہدایت المخلصین

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

اقبالؔ

ماہرِ علمِ ظاہر و باطن شیخ یعقوب صرفی

وادیٔ کشمیر نے کئی جامع الکمالات شخصیات کو جنم دیا ہے۔ان میں سے بعض نے عالمی سطح پر شہرت پائی اور ان کے علم وفن کا ڈنکا چہاردانگِ عالم میں بجا۔ایسے ہی لوگوں میں شیخ یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں۔وہ ایسے بزرگ تھے جن پر علم ظاہر و باطن آشکار ہو چکا تھا اور بحرِ حقیقت کے غریق تھے،علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔بڑے بڑے ماہرین کو بھی صرفی نہیں کہا گیا،مگر آپ نحو و صرف میں اس قدر کامل تھے کہ صرفی کہا جانے لگا اور یہ آپ کے نام کا حصہ بن گیا۔آج دنیا آپ کو اسی نام سے جانتی ہے۔

شیخ یعقوب صرفی کا تعلق کشمیر کے ایک بلند مرتبہ خاندان سے تھا،جو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔یہ خاندان امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھا اور انشاپردازی خوشخطی کے لئے جانا جاتا تھا۔یہ خاندان علم و فضل میں لاجواب تھا لہٰذا بچوں کو ابتدا سے ہی علمی

ماحول مل جاتا تھا۔ حضرت یعقوب صرفی اس خاندان میں ۹۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ قدرتی طور پر بے حد ذہین، تیز فہم اور زیرک تھے۔ سخن فہمی اور سخن دانی کے آثار آپ میں بچپن سے ہی نمایاں تھے۔ ابھی عمر کے صرف سات سال ہی پورے ہوئے تھے کہ آپ نے قرآن مجید حفظ کرلیا تھا اور اسی عمر میں شاعری کا بھی آغاز کر دیا تھا۔ یقیناً یہ بات حیرت انگیز تھی مگر فطرت نے ہی جب آپ کے اندر شعر گوئی کا ملکہ ودیعت کر رکھا تھا تو اس کا اظہار تو ہونا ہی تھا۔ بداہتاً شعر کہتے تھے۔ خود فرماتے ہیں:

چو در سالِ ہفتم نہادم قدم
ز طبعم رواں گشت شعرِ عجم
پدر کردے اصلاحِ اشعارِ من
بہ اصلاح بودے مددگارِ من

مکتب میں ابتدائی تعلیم کے بعد ملاّ آنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، جنھوں نے آپ کی قدرتی صلاحیت کو پہچانتے ہوئے شعر و سخن کے رموز سکھائے اور ایک مشاق سخنداں بننے میں مدد دی۔ ملاّ آنی خراسان کے رہنے والے تھے اور کشمیر میں آ بسے تھے۔ آپ مولانا عبدالرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور شعر و سخن میں ماہر تھے۔ استاد محترم بھی شیخ صرفی کی خداداد شعری صلاحیت کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پائے اور آپ کو 'جامیٔ ثانی' کے لقب سے پکارنے لگے۔ کچھ ایسی ہی صلاحیت علم نحو و صرف میں بھی رکھتے تھے، جس کے سبب لوگ آپ کو صرفی کہنے لگے۔ صرفیؔ آپ کا تخلص بن گیا تھا۔ ملا آنی آپ کے استاد کامل تھے۔ انھوں نے ہی آپ کی صلاحیتوں کا نکھارا تھا اور ذوقِ شعر و سخن کو مہمیز کیا تھا۔ ملاّ موصوف کے انتقال کے بعد اپنے عہد کے جید اساتذہ ملاّ بصیر خندہ بونی اور ملاّ رضی الدین سے اکتسابِ علم کیا۔ کچھ دیگر اساتذہ سے بھی درس لیا اور تفسیر، حدیث، منطق اور فلسفہ میں کامل ہو گئے۔ علاوہ ازیں علم عروض اور تصوف کی کتابیں بھی پڑھیں۔ اتنا سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود علم کی تشنگی نہیں بجھی اور تحصیل علم کے سلسلے میں بیرونِ ملک کا سفر کیا۔ اس سفر میں سرکردہ علماء سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے، مکہ

معظّمہ تک پہنچے، جہاں علم حدیث کے سب سے بڑے عالم ابنِ حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ درسِ حدیث دیا کرتے تھے، ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر سندِ حدیث حاصل کیا اور پوری دنیا میں ایک بڑے عالم وفاضل کے طور پر مشہور ہوگئے۔ بڑے بڑے علماء اور فضلاء آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اکبری دربار کے اہلِ علم ابوالفضل فیضی اور عبدلقادر بدایونی آپ کی غیر معمولی صلاحیت کا لوہا مانتے تھے۔

شیخ یعقوب صرفی کے علم وفضل کا شہرہ جب خطِ نصف النہار پہ تھا اور بڑے بڑے فضلاء دقیق مسائل کے حل کے لئے آپ کی طرف رجوع کررہے تھے۔ عین اسی وقت آپ کو راہِ سلوک پر چلنے کا شوق ہوا اور کچھ غیبی اشارے پاکر آپ سمرقند کی طرف چل پڑے۔ یہاں سلسلہ کبرویہ کے شیخ کامل، مخدوم شیخ کمال خوارزمی روحانی فیوض تقسیم کررہے تھے اور بے شمار افراد اکتسابِ فیض کررہے تھے۔ یہ سید السادات امیر کبیر سید علی ہمدانی رحمہ اللہ علیہ کے سلسلے کے شیخ تھے، جنھوں نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت کی تھی اور تصوف وروحانیت کے رنگ میں پوری وادی کو رنگ ڈالا تھا۔ مخدوم شیخ کمال خوارزمی علیہ الرحمہ کی خدمت میں جب آپ حاضر ہوئے تو روحانی تربیت کے سلسلے میں سب سے پہلے انھوں نے آپ کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کرلانے کا کام سونپا۔ اپنے دور کے ایک نامور عالم وفاضل کے لئے یہ کام انتہائی دشوار تھا، مگر آپ کی پیشانی پر بل نہیں آئے اور شیخ کے حکم کی بجا آوری دل وجان سے کرنے لگے۔ یہ تو جانتے ہی تھے کہ اس راستے میں کانٹے ہی کانٹے ہیں اور منزلِ مقصود تک رسائی کے لئے اس پر سے گزرنا پڑے گا۔ دوسرا کام جو تزکیۂ نفس کے لئے آپ کو کرنا پڑا وہ تھا چلہ کشوں کے غسل خانوں کی صفائی کا کام۔ اسی کے ساتھ شدید قسم کے مجاہدے بھی آپ کو کرنے پڑے مگر ساتھ ہی سیر وسلوک کی راہیں بھی آپ پر کھلنے لگیں اور کشف حجاب ہونے لگا۔ علائق دنیوی دور ہونے لگے اور روحانی انوار وتجلیات کا ظہور ہونے لگا۔ جلد ہی مرشد کے محبوب بن گئے اور داخل سلسلہ ہوکر صاحبِ خرقہ بھی ہوگئے۔ بصد عز وجاہ شیخ نے شیخ کو رخصت کیا۔

شیخ یعقوب صرفی سمرقند سے واپس آکر خواجہ سلیم چشتی کی خدمت بابرکت میں حاضر

ہوئے، جو آگرہ سے قریب فتح پور سیکری میں رہتے تھے اور ان کے فیض روحانی کا سلسلہ جاری تھا۔ برصغیر میں چشتی سلسلے کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور یہاں سب سے پہلے پہنچنے والے روحانی سلسلوں میں یہ بھی شامل تھا۔ شیخ سلیم چشتی کی بارگاہ میں درویش سے بادشاہ تک حاضر ہوتے تھے اور روحانی برکات حاصل کرتے تھے، شیخ یعقوب صرفی بھی حاضر ہوئے اور سلسلہ چشتیہ کی خلافت واجازت پائی۔ اسی کے ساتھ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے تبرکات بھی حاصل کئے۔

شیخ یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض کا سلسلہ جاری ہوا تو لاکھوں افراد مستفید ہوئے۔ ایک طرف طالبانِ حق آکر علم وفضل کی دولت حاصل کرتے تو دوسری طرف تشنگانِ شرابِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھاتے۔ مغل بادشاہ ہمایوں اور اکبر آپ کے عقیدت مند تھے دیگر امراء وروساء بھی آپ کے بے حد ارادت مند تھے۔ علاوہ ازیں علماء، فضلاء آپ کی صلاحیتوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ اس عہد کے مورخین اور تذکرہ نویس آپ کو فردِ لاثانی قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق آپ نے علم وفضل کی تشہیر، اسلام کی تبلیغ اور روحانیت کی تعلیم میں اہم کردار نبھایا۔ امام ربانی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو سلسلہ کبرویہ کی اجازت اور سند حدیث وتصوف آپ سے حاصل ہوا تھا۔

شیخ صرفی علیہ الرحمہ عالم وفاضل اور صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ قادر الکلام شاعر اور مصنف بھی تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں تحریر فرمائی ہیں، جن میں سے بعض آج بھی موجود ہیں۔ شیخ نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی، جو آج بھی کشمیر کے میر واعظ خاندان کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا نام 'مطلب الطالبین فی تفسیر آیات مبین' ہے۔ یہ عربی زبان میں ہے، مگر اس کے علاوہ قرآن کے آخری دو پاروں کی فارسی تفسیر بھی آپ نے تحریر فرمائی تھی۔ یہ برصغیر میں فارسی کی پہلی تفسیر کہی جاسکتی ہے۔ آپ نے بخاری شریف کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ علاوہ ازیں مغازی النبی، مسلک الاخیار، مقالاتِ مرشد، وامق عذرا، لیلیٰ مجنوں، مناسک الحج، حاشیہ توضیح وتلویح، شرح اربعین، روائح اور

کنزالجواہر آپ کی بلند پایہ تصنیفات ہیں۔شاعری میں غزلیات،نعت ومناقب اوررباعیات آپ نے کہی ہیں جو دیوانِ صرفیؔ کی شکل میں جمع کی گئی ہیں۔آپ عربی وفارسی میں شعر کہتے تھے۔اشعار عموماً عارفانہ ہوتے تھے۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے جان کاریاں حاصل کی گئی ہیں:

۱۔تذکرۃ العارفین

۲۔اسرارالاخیار

۳۔تحفۂ محبوبی

۴۔خوارق السالکین

۵۔ہدایت المخلصین

۶۔تذکرہ اسلاف

متوکل وہ شخص ہے جس کا دل اللہ کے سوا تمام لوگوں سے تعلق
چھوڑ کر صرف اللہ کے ساتھ زندہ رہے۔

(سہل)

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

اقبالؔ

صاحبِ مقاماتِ عالی حضرت بابا علی والی

حضرت شیخ بابا علی والی رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے معروف صوفیہ میں سے ہیں۔صاحب حال وقال بزرگ تھے۔اکثر کشف وکرامات کا ظہور ہوتا رہتا تھا۔اصل وطن ترکستان تھا مگر کشمیر میں قیام اختیار کرلیا تھا۔۹۹۹ھ میں کشمیر تشریف لائے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔شیخ حسین خوارزمی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص تھے۔کبروی سلسلے میں مرید کرتے تھے اور ایک دنیا آپ سے فیض پارہی تھی۔حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کی خدمت بابرکت میں دوسال تک حاضر رہ کر استفادہ کیا۔مولانا ابوالحسن ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت (چہارم) میں تحریر کرتے ہیں:

''کشمیر میں شیخ بابا کبروی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے مستفید ہوئے۔ان کی صحبت میں ان پر ربانی فیوض کی بارش ہوئی اور اس سلسلہ کی معروف

غیبت وفنائیت کے آثار ظاہر ہوئے۔''

بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق بابا علی والی کو سلسلہ نقشبندیہ میں بھی تعلیم کی اجازت تھی۔ یہی بات 'رودکوثر' میں شیخ محمد اکرام اور 'تذکرہ خواجہ باقی باللہ' میں مولانا نسیم احمد فریدی نے تحریر کیا ہے۔ حالانکہ بعض محققین اس سے انکار بھی کرتے ہیں۔ پروفیسر شمس الدین احمد اپنی کتاب 'حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندیہ' کے حاشیہ نمبر ۱۰۸۶ میں رقمطراز ہیں:

''حضرت شیخ مذکور خالصتاً کبروی سلسلے کے تھے اور اسی سلسلے کی خانقاہ معلیٰ سرینگر میں بیٹھ کر ترویج کی اور ارشاد وخلعت بھی عطا کئے اور اپنے طالبین کو کبروی سلسلے کی تلقین کی۔ حضرت شیخ بابا علی والی رحمۃ اللہ علیہ نہ نقشبندی سلسلے سے مربوط تھے اور نہ ہی اس سلسلے کے شیخ مجاز، چنانچہ آپ کے نقشبندی طریقت کے پیروکار یا شیخ مجاز ہونے اور کشمیر میں وارد ہو کر اس سلسلے کی ترویج وتبلیغ وتلقین کرنے پر مقامی تواریخ اور تذکروں میں نہ کوئی ذکر آیا ہے اور نہ ہی کوئی اسناد وشواہد موجود ہیں، بلکہ صراحت سے بیان ہوا ہے کہ حضرت شیخ بابا علی والی رحمۃ اللہ علیہ کبروی سلسلے کے تھے اور اسی سلسلے کی کشمیر میں تلقین کی۔''

صوفی اور غازی:

حضرت شیخ بابا علی والی رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت اور اجازتِ ارشاد حضرت شیخ محمد شریف حسین سے ملی تھی۔ تصوف کے مقاماتِ عالیہ تک پہنچنے سے قبل شیخ خلیل اللہ بدخشی کے ساتھ غزواتِ اسلامی میں شریک رہے تھے۔ کشمیر میں آمد کے بعد عوام وخواص کے مرجع بن گئے مگر اکثر استغراق کی کیفیت رہتی۔ یہاں تک کہ نماز کے اوقات سے بھی بے خبر رہتے تھے اور دوسروں کی تحریک پر ہوش میں آتے تھے۔ کئی بار یہ کیفیت نماز میں بھی پیدا ہو جاتی تھی۔

صاحبِ کشف وکرامت تھے۔ آپ کی ایک کرامت کا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا

ہے اور کشمیر کے عوام کے درمیان بھی یہ کرامت مشہور تھی کہ ایک بار کچھ لوگ ایک زندہ شخص کو تابوت میں لٹا کر لائے اور کہا کہ نماز جنازہ پڑھا دیں۔ کئی بار آپ نے انکار کیا مگر جب وہ اصرار کرنے لگے تو آپ نے پڑھا دی۔ چوتھی تکبیر کے بعد چادر ہٹائی گئی تو وہ مر چکا تھا۔

بعض مورخین کے مطابق کشمیر پر مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کی لشکر کشی آپ ہی کی دعوت پر ہوئی تھی۔ بعد میں مرزا یادگار نے اکبر کے خلاف بغاوت کر دی اور کشمیر میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اہل کشمیر اور بادشاہ اکبر کے حکام کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو آپ ہی نے اپنی ذاتی توجہ سے اسے رفع دفع کرانے کی کوشش کی۔ جھگڑا تو رفع ہو گیا مگر جو لوگ اس تنازعے کے خاتمے کے خلاف تھے انھوں نے آپ کو شربت میں زہر ملا کر پلا دیا۔ جس سے آپ کی شہادت ہو گئی۔ ۱۵ر صفر ۱۰۰۱ھ کو انتقال کے بعد حضرت شاہ ہمدان کی خانقاہ کے صحن میں دفن ہوئے۔

اس مضمون کی جانکاریاں درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔تذکرہ اولیاء کشمیر

۲۔واقعاتِ کشمیر

۳۔حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندیہ (پروفیسر شمس الدین احمد)

۴۔تذکرہ خواجہ باقی باللہ (مولانا نسیم احمد مظاہری)

۵۔تاریخ دعوت وعزیمت، چہارم (مولانا ابوالحسن علی ندوی)

شکر کے اندر سبب پایا جاتا ہے، اس لئے کہ شاکر اپنے لئے اور عنایات کا طالب ہوتا ہے۔ لہٰذا شکر گزار در حقیقت اللہ کے ساتھ ہو کر اپنی ذات کے لئے لذت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(جنید بغدادی)

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک

اقبالؔ

کشمیر میں طریقتِ نقشبندیہ کی ابتدائی کرنیں

دسویں صدی ہجری ہندستان میں طریقتِ نقشبندیہ کے اشاعت کی صدی تھی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ ہندستان میں اس سلسلے کے بانی حضرت خواجہ باقی باللہ اور کشمیر میں اس سلسلے کے بانی حضرتِ ایشان خواجہ خاوند محمود رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ۹۷۱ھ میں ہوئی اور دونوں کی کدوکاوش اور صوفیانہ جدوجہد کا آغاز دسویں صدی ہجری کی ابتدا کے ساتھ ہوا۔ خواجہ باقی باللہ بیرنگ کے نام سے مشہور بزرگ کا اصل نام خواجہ رضی الدین محمد باقی تھا اور آپ کا مولد افغانستان کا شہر کابل تھا۔ آپ کے والد محترم قاضی عبدالسلام خلجی خود ایک عالم اور عابد و زاہد شخص تھے۔ انھیں کی زیرِ نگرانی آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس کے بعد مولانا محمد صادق حلوائی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو شرف تلمذ حاصل رہا۔ انھیں کے ساتھ آپ ماوراءالنہر گئے، جو اس دور میں صوفیہ اور مشائخ کا مرکز تھا۔ آپ کا رجحان علوم ظاہری سے زیادہ علوم باطنی کی طرف تھا لہٰذا ماوراء

النہر کے صوفیہ اور مشائخ کی مجلسوں میں آپ پابندی سے حاضر ہوتے رہے۔ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو ابتدا سے ہی صوفیہ اور اہل طریقت سے بے حد لگاؤ تھا لہٰذا ابتدا میں آپ نے شیخ خواجہ عبید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر توبۂ گناہ کیا۔ دوسری بار شیخ احمد یسوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کے ایک بزرگ شیخ افتخار کے ہاتھ پر توبہ کی مگر استقامت میں کچھ کمی کا احساس ہوا اور تیسری بار خواجہ امیر عبداللہ بلخی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ اس بار استقامت رہی اور روحانی ترقیوں کا دور بھی شروع ہو گیا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ جوان تھے اور علوم و معرفت کی حرص تھی لہٰذا سفر پر نکل پڑے اور جہاں جہاں تصوف و معرفت کے سرچشموں کا پتہ چلتا آپ اپنی تشنگی بجھانے چل پڑتے۔ اسی دوران آپ کشمیر تشریف لائے اور تقریباً دو سال تک یہاں قیام فرما کر حضرت بابا علی والی رحمۃ اللہ علیہ سے فیوض و برکات حاصل کرتے رہے۔ یہاں سے سنبھل گئے، جہاں خواجہ الٰہی بخش سے استفادہ کے بعد ماوراء النہر واپس ہو گئے۔ ماوراء النہر میں نقشبندیہ سلسلے کے صوفی مولانا خواجہ محمد اکمنگی رحمۃ اللہ علیہ اپنی روحانی اور خداداد صلاحیتوں کے لئے مشہور تھے۔ اس بار انھیں کی خدمت میں پہنچے اور چند دن قیام کر کے روحانی برکات حاصل کیا اس کے بعد ہندستان تشریف لائے۔ لاہور ہوتے ہوئے خواجہ دہلی آئے اور فیروز شاہ تغلق کے بنوائے ہوئے قلعے میں قیام کیا۔ ہندستان میں لگ بھگ چار سال تک آپ کا قیام رہا اور دہلی میں ہی انتقال کے بعد دفن ہوئے۔

انتہائی شفیق اور اوصاف اللہ کے حامل حضرت خواجہ باقی باللہ نے بہت کم مدت میں سلسلۂ نقشبندیہ کی ترویج و اشاعت کا جو کارنامہ انجام دیا وہ لائق تحسین اور حیرت انگیز ہے۔ آپ کا انتقال محض چالیس، اکتالیس سال کی عمر میں ہوا، جب کہ آپ کی مدتِ قیام چار سال کے لگ بھگ ہے۔ اتنی قلیل مدت میں اپنے سلسلے کی پہچان بنا دینا اور اسے لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دینا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ اس سے بڑی بات یہ تھی کہ آپ نے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کو اپنی جانشینی کے لئے چنا اور انکی روحانی تربیت فرمائی۔

باقی باللہ کشمیر میں:

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا کشمیر میں قیام ایک روحانیت کے طالبعلم کی حیثیت سے تھا۔ آپ دورانِ قیام سلسلۂ نقشبندیہ کے پیشوا و رہنما نہیں تھے لہٰذا یہاں قیام کے دوران اس سلسلے کی اشاعت نہیں کی۔ البتہ جب آپ کا قیام دہلی میں ہوا اور آپ سے طریقت کے سرچشمے پھوٹنے لگے تو کشمیر کے تشنگانِ معرفت بھی یہاں آنے لگے۔ کشمیر سے دہلی آکر جن حضرات نے نقشبندی سلسلے سے استفادہ کیا ان کی فہرست لمبی ہے۔ البتہ چند نام ہی ایسے ملتے ہیں جو تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ کشمیر سے دہلی آکر سلسلہ نقشبندیہ سے فیض اٹھانے والوں میں ایک نام آخوند ملا کمال کا ہے، جنھوں نے حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر نگرانی تربیت پائی۔ دوسرا نام حضرت شاہ قاسم حقانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، یہ حضرت دیوانہ سورتی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے اور نقشبندیہ سلسلے میں مرید کیا کرتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں ایک نام شیخ مہدی علی سوپوری کا ملتا ہے، جنکی تربیت خود مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی۔ حضرت اخوند ملا حسین خباز کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ایسے بزرگ تھے جنھیں خواجہ باقی باللہ سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا تھا۔ آپ نے ابتدا میں مولانا محمد قادری علیہ الرحمہ کی بیعت کی تھی پھر خواجہ عبدالشہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فیضان حاصل کیا اور اس کے بعد خواجہ باقی باللہ سے تربیت پا کر کشمیر تشریف لائے۔ یہاں خلقِ خدا کی ہدایت و رہنمائی کے کام میں لگ گئے۔ آپ کا انتقال ۱۰۵۰ھ یا ۱۰۵۲ھ میں ہوا۔ کشمیر کے ایک بزرگ شیخ عثمان جلندری تھے اور آپ ہی کے کہنے پر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی تھی۔ اسی طرح شاہ محمد صادق قلندر رحمۃ اللہ علیہ نے کشمیر سے دہلی آکر خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد علیہ الرحمہ سے روحانی فیوض حاصل کئے۔ مرزا حیات بیگ، حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ شیخ آدم بنوری کے تربیت یافتہ تھے۔ الغرض کشمیر سے دہلی یا سرہند آکر نقشبندی بزرگوں سے فیضیاب ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے 'تذکرہ اولیاء کشمیر' اور 'واقعات کشمیر' کا مطالعہ کریں۔

حضرت ملاحسن کشمیری نام کے ایک بزرگ تھے جو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے بہت قریبی تھے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ملاّ حسن کشمیری ہی وہ شخص تھے، جنھوں نے حضرت مجدد صاحب کو خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچایا تھا اور پہلی ملاقات انھیں کے ذریعے آپ کی اپنے مرشد سے ہوئی تھی۔ ملاّ حسن کشمیری نے دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی اور علم وفضل میں شہرت رکھتے تھے۔ طریقت کی تکمیل اپنے دور کے ایک بزرگ شیخ نجم سے کی تھی مگر بعد میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کی اور حقائق ومعرفت میں ممتاز ہوئے۔ ۱۰۵۱ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کا تذکرہ نزہۃ الخواطر اور زبدۃ المقامات نامی کتابوں میں ملتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کئی خطوط ملاحسن کشمیری کے نام ہی لکھے گئے ہیں۔ ایک خط میں ملاحسن کشمیری کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مجدد لکھتے ہیں:

> ''میرے مخدوم! فقیر کو اس قسم کی باتیں سننے کی طاقت ہرگز نہیں ہے۔ میری رگِ فاروقی بے اختیار جوش میں آجاتی ہے اور ایسے کلام کی تاویل وتوجیہ کی فرصت نہیں دیتی۔ ان باتوں کا کہنے والا خواہ شیخ کبیر یمنی ہو یا شیخ اکبر شامی، ہمیں تو حضرت محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام درکار ہے، نہ کہ محی الدین عربی، صدرالدین قونیوی اور عبد الرزاق کاشی کا کلام۔ ہم کو نص سے کام ہے نہ کہ فص (فصوص الحکم) سے۔ فتوحاتِ مدنیہ نے ہم کو 'فتوحاتِ مکیہ' سے بے نیاز کردیا ہے۔''

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب-۱۰۰)

ان عبارتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں شریعت کے احکام پر عمل کرنے پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ حضرت مجدد صاحب قرآن وسنت کے مقابلے بڑے سے بڑے عالم اور صوفی کے قول کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس سلسلے کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہاں شریعت پر عمل کے معاملے میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جاتی اور نہ ہی کوئی تاویل قبول کی جاتی ہے۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اطاعتِ رسول کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے لہٰذا حق تعالیٰ کی وہ اطاعت جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی شکل میں نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہے اور اس حقیقت کی تاکید و تحقیق کے لئے کلمۂ قد تاکیدیہ لایا گیا ہے تاکہ کوئی بوالہوس ان دونوں اطاعتوں کے درمیان فرق پیدا نہ کرے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔''

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب-۱۵۲)

اوپر کی عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس سلسلے میں شریعت پر عمل کرنے پر بے حد زور دیا جاتا ہے اور اس کے بغیر طریقت کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاتا ہے۔

عبدالاحد فارقی کشمیر میں:

حضرت مجدد الف ثانی کے والد بزرگوار شیخ عبدالاحد فاروقی سرہندی علیہ الرحمۃ والرضوان کی تشریف آوری کشمیر میں ہوئی اور مختصر قیام کے دوران عوام کے ساتھ ساتھ معروف علماء اور صوفیہ نے آپ سے فیضان حاصل کئے۔ آپ چونکہ چشتی اور قادری سلاسل سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا اس کے لئے کلمات خیر آپ کی زبان سے نکلتے تھے اور ذوق وشوق کے اظہار کے ساتھ دعا بھی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے سے استفادہ کا موقع دے۔

شیخ عبدالاحد فاروقی رحمۃ اللہ علیہ سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ان میں سے بعض نے بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ سے فیوض و برکات حاصل کئے اور ان صوفیہ وعلماء سے ایک دنیا مستفید ہوئی۔ آپ کے ارادت مندوں میں حضرت خواجہ محمد امین صوفی تھے، جو بچپن سے ہی راہ سلوک کی طرف مائل تھے۔ علم وعمل میں یکتائے روزگار تھے اور تقویٰ و پرہیزگاری میں بے مثل و بے مثال تھے۔ ایک دن شیخ عبدالاحد فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بیعت کی اور اپنی پوری زندگی اہل کشمیر کی ہدایت و رہنمائی میں صرف کردی۔ ایسے ہی ایک بزرگ حضرت نورہ بابا پکھلی تھے جو آپ کے سفر کشمیر کے دوران پابندی سے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ مجرد زندگی گزاری اور ہمیشہ روزے رکھے۔ نہایت رقیق القلب انسان تھے۔ شیخ کے کشمیری ارادت مندوں میں شیخ محمد مراد ٹنگ رحمۃ اللہ علیہ بھی اہمیت کے حامل ہیں جو ملا طاہر کے فرزند تھے اور علوم اسلامیہ کے علاوہ دیگر علوم پر بھی عبور رکھتے تھے۔ عالم شباب سے ہی سلوک و معرفت کے راستے پر چل پڑے۔ عبادت و مجاہدہ میں اپنے شب و روز گزارے۔ شیخ سرہندی اور دیگر بزرگوں سے فیضان پایا۔ کئی بار اپنے مرشد کی خدمت میں سرہند بھی گئے اور خواجہ محمد نقشبندی رحمہ اللہ علیہ سے مستفید و مستفیض ہوئے۔ آپ نے کئی بزرگوں سے مختلف سلاسل کی اجازت پائی جن میں نقشبندیہ سلسلے کے ساتھ ساتھ کبرویہ، سہروردیہ اور چشتیہ سلاسل کی اجازت بھی شامل تھی۔ ان سلسلوں کی اجازت حضرت شیخ محمد علی رضا رحمۃ اللہ علیہ سے ملی مگر آپ نے اپنے مرشد کی اجازت سے صرف نقشبندیہ اور قادریہ طریقت کو جاری کیا۔ آپ کے صاحبزادے شیخ عبدالرشید بھی شیخ عبدالواحد سرہندی کے مرید تھے اور علمی و روحانی اعتبار سے بہت بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ کئی بار کشمیر سے باہر تشریف لے گئے اور اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری دی۔ آپ قطب رشد ہدایت کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے اور عوام کی اصلاح کے لئے مسلسل کوششیں کرتے رہے۔ سرہند دہلی اور ملتان کے علاوہ حج بیت اللہ کا سفر کیا اور اس دوران خلقِ خدا کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ شیخ عبدالرشید کی روحانی تربیت خود آپ کے والد بزرگوار نے فرمائی تھی۔

سلسلہ نقشبندیہ کی خصوصیات:

تمام سلاسل کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں اسی طرح سلسلہ نقشبندیہ کی بھی کچھ خصوصیتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے اسے کشمیر میں خصوصی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی اور عوام و خواص نے اس سلسلے کو اپنایا۔ اس سلسلے کی مشہور خانقاہ، خانقاہ نقشبند صاحب آج بھی مشہور ہے اور یہاں بڑی تعداد میں عقیدت مند حاضر ہوتے ہیں۔ یہ خانقاہ جہاں اپنی مذہبی اور روحانی اہمیت رکھتی ہے وہیں تعمیری اہمیت کی حامل بھی ہے۔ اس کی زیارت کے لئے سیاحوں کی بھیڑ امنڈ پڑتی ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ کی خصوصیت کا ذکر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے اپنے خطوط میں بار بار کیا ہے اور اس کی اشاعت پر زور دیا ہے۔اپنے ایک خط میں جو اپنے ایک مرید اور خلیفہ شیخ محمد چتری رحمۃ اللہ علیہ کے نام ارسال کیا تھا لکھتے ہیں:

''پاکیزہ مکتوب گرامی جو کہ آپ نے مہربانی فرما کر صادر فرمایا تھا ملا۔اس کے مطالعہ سے بہت مسرت اور خوشی ہوئی۔آپ نے اس طریقۂ نقشبندیہ پر اپنی استقامت اور ثابت قدمی کے بارے میں تحریر فرمایا تھا الحمدللہ سبحانہ علیٰ ذالك (اس بات پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا بے حد شکر) حق سبحانہ وتعالیٰ اس طریقۂ عالیہ کے بزرگوں کی برکت سے آپ کو بے انتہا ترقیاں عنایت فرمائے۔ان بزرگوں کا طریقہ سرخ گندھک (اکسیر) ہے اور سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تابعداری پر منحصر ہے۔''

(مکتوبات مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب-۳۷)

ایک اور خط جو کہ خواجہ عمک کے نام تحریر فرمایا تھا اس میں بھی اس سلسلے کے بارے میں تعریفی باتیں کہی گئی ہیں اور اسے دیگر سلسلوں سے افضل بتایا گیا ہے۔خط کے بعض حصے یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔

''یہ فقیر آپ کی خدمت میں سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کی تعریف بیان کرنے کے علاوہ اور کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔

میرے مخدوم! اس سلسلہ عالیہ کے بزرگوں کی تحریروں میں موجود ہے کہ ،ہماری نسبت تمام نسبتوں سے بالاتر ہے۔۔۔پس ان بزرگوں کی نسبت کو دوسروں کی نسبت کے ساتھ قیاس کرنا چاہئے،اور بلا تکلف دوسروں پر اس سلسلے کو فوقیت دینی چاہئے۔۔۔اگر بالفرض اسی سلسلۂ عالیہ کے مشائخ کے سامنے اس کو بیان کیا جائے تو احتمال ہے کہ ان میں سے اکثر مشائخ اس کا انکار کردیں اور ہرگز یقین نہ کریں۔۔۔''

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب-۲۷)

شریعت پر عمل ہر سلسلے میں مطلوب ہے مگر سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں اس کی کچھ زیادہ ہی تاکید کی جاتی ہے۔یہی سبب ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگانِ سلسلہ اس پر بے حد زور دیتے ہیں۔

❖○❖

اس مضمون کی جانکاریاں درج ذیل کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں:

۱۔ واقعات کشمیر
۲۔ تذکرہ اولیاء کشمیر
۳۔ تذکرہ اولیاء ہندو پاک
۴۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندیہ
۵۔ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی
۶۔ نزہتہ الخواطر
۷۔ زبدۃ المقامات

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری
کبھی حیرت کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

اقبالؔ

طریقتِ نقشبندیہ اور حضرتِ ایشان

خواجہ خاوند زبدۂ احرار
نسبتش با علاء الدین عطار
مرحبا بر علو رابطہ اش
ہست تا خواجہ پنج واسطہ اش

وادی کشمیر میں طریقتِ نقشبندیہ کی بنیاد حضرت ایشان خواجہ خاوند محمود رحمۃ اللہ علیہ نے ڈالی اور یہاں سلسلے کی نشر واشاعت کا کام بھی آپ نے ہی انجام دیا۔ گو کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل بھی بعض حضرات اس سلسلے سے فیض پا رہے تھے مگر ان کی تعداد کم تھی اور اس کے لئے انھیں وادی سے باہر کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت بخارا میں ۹۷۱ھ میں ہوئی۔ والد بزرگوار میر سید شریف کا شمار بخارا کے اکابر سادات میں ہوتا تھا۔ یہیں تعلیم وتربیت پائی

اور یہیں حضرت خواجہ محمد اسحٰق دہ بیدی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہ کر سلوک ومعرفت کی منزلیں طے کیں۔ آپ رفتہ رفتہ علم وعمل میں اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہو گئے اور غیبی اشارہ پا کر ہندستان کی طرف چل پڑے۔ تاریخی شواہد کے مطابق سنہ ۱۰۱۰ھ میں گجرات کے راستے کشمیر تشریف لائے اور یہاں خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ یہ جلال الدین محمد اکبر کا دورِ حکومت تھا۔ یہاں تقریباً ۳۵ رسال تک آپ کا قیام رہا۔ اس کے بعد لاہور چلے گئے اور یہیں ۱۰۵۰ھ یا ۱۰۵۲ھ میں انتقال ہوا۔ قیام کشمیر کے دوران آپ نے ہندستان کے مختلف شہروں کے سفر بھی کئے اور راہ سلوک کے مسافروں کی رہنمائی فرمائی۔

حضرت ایشان کشمیر میں:

حضرت ایشان کا بڑا وقت کشمیر میں گزرا لہٰذا آپ کو اپنے سلسلۂ نقشبندیہ کی اشاعت کے لئے بھرپور موقع ملا۔ یہاں کشمیر کے بادشاہ حسین شاہ کا مکان آپ کو قیام کے لئے ملا۔ یہیں آپ نے ایک مسجد اور خانقاہ کی تعمیر کرائی اور آپ کے مریدین ومعتقدین نیز اہل وعیال بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ آپ کے مریدین اور رہروان منزل سلوک کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو ایک بڑی اور وسیع خانقاہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس دوران خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اشارہ پا کر آپ نے اشم گاؤں کی خانقاہ کو سرینگر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ خانقاہ میر اویسی بابا کی تعمیر کردہ تھی اور عظیم الشان تھی مگر اب ویران ہو چکی تھی۔ آپ نے علماء سے مشورہ کے بعد اسے منتقل کرنا شروع کر دیا۔ مذکورہ خانقاہ کی اجناس سے سرینگر کے سکندر پورہ (خواجہ بازار) میں ایک عالیشان خانقاہ کی تعمیر ہوئی جو آج بھی موجود ہے اور عقیدت مندوں کے لئے مرکز عقیدت رہی ہے۔ یہ خانقاہ اپنے تعمیری محاسن کے لئے بھی جانی جاتی ہے اور سیاحوں کے لئے مرکزِ کشش ہے۔ اسے خانقاہ نقشبند صاحب کہتے ہیں۔ اشم گاؤں میں خانقاہ کی جگہ پر ایک مسجد کی تعمیر کر دی گئی تھی۔ خانقاہ کی تعمیر پر ۴۵ رہزار روپئے خرچ ہوئے۔ بعد میں کئی بار مرمت کا کام

ہوا۔ خاص طور پر ۱۳۰۴ھ میں ڈھاکہ کے نواب احسن اللہ خان اور مقامی رئیس خواجہ ثناء اللہ شال

اور دیگر مخیرّ حضرات کی مدد سے اس کی مرمت کا کام ہوا۔

اصلاحی کام:

حضرتِ ایشان خواجہ خاوند محمود رحمہ اللہ علیہ ایک صاحبِ کشف کرامت اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔آپ کی کوششوں نے ایک عالم کو فائدہ پہنچایا اور سلسلہ نقشبندیہ کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دیا۔اس سلسلے کے بزرگوں کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ شریعت پر کاربند رہنے اور سنت پر عمل پیرا رہنے پر زیادہ زور دیتے رہے ہیں۔آپ نے بھی اپنے مریدین، خلفاء اور عقیدت مندوں کو اس کی تاکید فرمائی ہے۔بابا داؤ مشکوٰتی اور اخوند ملا شاہ بدخشی سے آپ کے اچھے تعلقات تھے۔یہ دونوں حضرات اس دور کے معروف صوفیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کے علاوہ بھی دیگر ہمعصر بزرگوں سے آپ کے اچھے مراسم تھے اور ان کے ساتھ مجلسیں بھی برپا ہوتی تھیں۔حضرتِ ایشان کے عہد تک کشمیر میں اسلام کی بھرپور اشاعت ہو چکی تھی مگر اب اہم کام مسلمانوں میں پھیلے ہوئے غلط رسوم ورواج کا خاتمہ اور عوام کی اصلاح کا کام تھا۔سو یہ کام آپ نے بخوبی انجام دیا اور جب مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے حکم سے آپ کو کشمیر چھوڑ کر لاہور میں قیام کرنا پڑا تو آپ نے یہاں اپنے صاحبزادے خواجہ معین الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے نامکمل مشن کو پورا کرنے کے لئے چھوڑا۔انھوں نے آپ کی جانشینی کا حق ادا کیا اور جو کام باکمال والد نے ادھورا چھوڑا تھا اسے باحوصلہ بیٹے نے تکمیل تک پہنچایا۔

خواجہ خاوند محمود نے ارشاد فرمایا ہے'میں نے اس ملک میں لوگوں کو درختوں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا۔ایسے ہی وہی لوگ درختوں کی زیارت کرنے جاتے ہیں اور ان سے حاجت روائی کی التجا کرتے ہیں۔'

خواجہ ایشان ایک صاحبِ حال وقال بزرگ تھے لہٰذا لاہور منتقلی کے بعد بھی آپ کے فیوض وبرکات کا سلسلہ جاری رہا۔یہاں بھی آپ نے ایک خانقاہ اور مسجد کی تعمیر کرائی۔انتقال سے قبل کئی بار یہ شعر آپ کی زبان پر جاری ہوا۔

الٰہی غنچۂ امید بکشا

گلے از روضۂ جاوید بنما

جن دنوں آپ کا انتقال ہوا بادشاہِ وقت شاہجہاں لاہور میں موجود تھا۔ صدر صدور لاہور میراں سید جلال الدین کو اپنا نائب بنا کر تجہیز و تکفین کے لئے بھیجا۔ اس کے بعد آپ کی قبر پر نواب سعید نے ایک عمارت کی تعمیر کرائی۔ آپ کا مزار آج بھی لاہور میں زیارت گاہِ خلائق ہے۔

❖○❖

اس مضمون کی معلومات درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔ تحفۂ نقشبندیہ (خواجہ سید عبدالرحمٰن۔ اردو ترجمہ، ارمغانِ نقشبندیہ)

۲۔ واقعاتِ کشمیر (خواجہ محمد اعظم ددمری)

۳۔ ذکر الصادقین (مفتی صدرالدین محمد)

۴۔ تذکرہ اولیاء کشمیر (پیرزادہ عبدالخالق طاہری)

۵۔ تذکرہ اولیاء پاک و ہند (مرزا محمد اختر دہلوی)

۶۔ رسالہ نقشبندیہ (ملا بہاء الدین متو کشمیری)

۷۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقت نقشبندیہ (پروفیسر شمس الدین احمد)

ہے گراں سیرِ غمِ راحلہ وزاد سے تو
کوہ و دریا سے گزر سکتے ہیں مانند نسیم
مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

اقبالؔ

حضرتِ ایشان کے خلفاء

حضرتِ ایشان خواجہ خاوند محمود رحمہ اللہ علیہ سے جو سرچشمۂ فیوض و برکات سلسلہ نقشبندیہ کی صورت میں جاری ہوا تھا اس سے پوری وادی کے تشنگانِ معرفت سیراب ہوئے۔ آپ نے اپنے مریدین، خلفاء اور فیضیافتگان کی ایک ایسی جماعت اپنے پیچھے چھوڑی جو حال وقال اور سوز و گداز سے مالا مال تھی۔ اس جماعت نے خلقِ خدا کو مستفیض کیا اور رہروانِ منزل سلوک کی دستگیری فرمائی۔ حضرتِ ایشان کے فیضیافتگان میں ایک اہم نام خواجہ بدیع اللہ بانڈے کا ہے۔ جو بدیع الزماں کے نام سے شہرت رکھتے تھے اور کشمیر کے نامی گرامی لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ آپ خواجہ طالب کے فرزند تھے اور قانون گو کے عہدے پر فائز تھے۔ اپنے سینے میں ایک حق آگاہ دل رکھتے تھے اور بے حد متقی و پرہیز گار تھے۔ ابتدا میں حضرت بابا داوٗد خاکی رحمہ اللہ علیہ کے مرید ہوئے، اس کے بعد خواجہ خاوند محمود رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے

سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے وابستہ ہوئے۔ آپ صاحبِ ذوق وحال تھے اور دوسروں نے بھی آپ سے فیوض پائے۔

خواجہ عبداللہ بانڈے:

خواجہ عبداللہ بانڈے بھی حضرتِ ایشان کے خلفاء میں بے حد اہمیت کے حامل تھے۔ آپ کشمیر کے ممتاز شرفاء میں شامل تھے اور بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے تھے۔ جب حضرتِ ایشان کشمیر تشریف لائے تو آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر مرید وخلیفہ بنے۔ عبداللہ بانڈے کے والد عہد مغلیہ میں ممتاز تھے اور بادشاہ جلال الدین محمد اکبر نے آپ کو قانون گو کے عہدے پر فائز کیا تھا۔

مولانا یوسف ترکی:

مولانا یوسف ترکی رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحبِ حال وقال اور سوز وگداز والے بزرگ تھے۔ غریبوں اور مسکینوں کی حاجت روائی فرماتے تھے۔ کشادہ دل اور سخی ہونے کی وجہ سے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کیا کرتے تھے۔ عبادت وریاضت میں یکتائے روزگار تھے اور اکثر آبادی سے باہر جنگلوں، پہاڑوں میں جاکر اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ خواجہ خاوند محمود کے مرید تھے اور انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔

ملا مشربی:

ملا مشربی رحمۃ اللہ علیہ تلاش حق میں بے قرار رہتے تھے۔ آپ نے کئی ملکوں کے سفر کئے اور حضرت خواجہ محمد اسحٰق کاشانی کے مرید ہوکر سلسلہ نقشبندیہ سے وابستہ ہوئے۔ آپ کو بیعت کی اجازت بھی حاصل تھی۔ بے حد خداترس اور متقی وپرہیزگار انسان تھے۔ حضرت ایشان کی خدمت میں حاضر ہوکر فیض پاتے رہے۔ اسی طرح ابراہیم بھی آپ کے مرید تھے۔ یہ اپنے دور کے

ایک بڑے عالم اور دانشمند انسان تھے۔ آپ کو علم نجوم اور دیگر نادر علوم میں کمال حاصل تھا۔ حضرتِ ایشان کے یہ سبھی مریدین کشمیر کے ہی مختلف علاقوں میں مدفون ہیں۔

اس مضمون کی معلومات درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔ واقعاتِ کشمیر

۲۔ تذکرہ اولیاء کشمیر

۳۔ تزکرہ اولیاء پاک و ہند

۴۔ رسالہ نقشبندیہ

۵۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندیہ

۶۔ ذکر الصادقین

شکر یہ ہے کہ تو شکر ادا کرنے سے اپنے آپ کو عاجز سمجھے۔

(ابو عثمان)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبالؔ

معینِ شریعت وطریقت حضرت معین الدین نقشبندی

حضرت خواجہ معین الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار کشمیر کے صاحبِ شریعت وطریقت صوفیہ میں ہوتا ہے۔آپ اپنے والدِ بزرگوار خواجہ خاوند محمود کے سچے جانشیں ثابت ہوئے اور اپنی پوری زندگی شریعت وطریقت کی نشرواشاعت اور بندگانِ خدا کی خدمت میں لگادی۔۱۰۴۳ھ میں جب آپ کے والد محترم نے بادشاہ کے حکم سے کشمیر چھوڑ لاہور میں قیام کیا تو کشمیر میں سلسلۂ نقشبندیہ کی اشاعت کی ذمہ داری آپ ہی کو ملی۔یہاں آپ نے خانقاہ کو زینت بخشی ،اس سلسلے کی اشاعت کی اور علم وعلماء کی توقیر میں اضافہ کیا۔آپ حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت میں بھی بے مثل وبے مثال تھے۔اسی کے ساتھ خوش اخلاقی کے پیکر تھے جس کی وجہ سے علماء،فضلاء،امراء،سرکاری افسران اور عوام کی بھیڑ آپ کے درِ دولت پہ لگی رہتی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والدِ بزرگوار سے ابتدائی

تعلیم پائی تھی مگر تکمیل عالمِ اسلام کے ممتاز محدث شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی۔ یہیں سے فقہ وحدیث میں سند پاکر علمی مشاغل میں مصروف ہوئے۔ راہ سلوک کے رموز اپنے والد کی نگرانی میں سیکھے۔ آپ کا رجحان تصوف وشریعت کے ساتھ ساتھ علمی کاموں کی طرف بھی تھا لہٰذا علماء آپ کے پاس حاضر ہوکر اکتسابِ فیض کیا کرتے تھے۔ علمی مجلسیں منعقد ہوتیں اور مختلف موضوعات پر بحثیں ہوتیں۔ انھیں علماء کی مدد سے آپ نے فتاویٰ نقشبندیہ مرتب فرمایا۔ اس کے علاوہ بھی کئی کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ سیرِ محمدی، کنز السعادہ، کتاب فوق، مرأۃ طیبہ، رسالہ در احوالِ خواجہ خاوند محمود، مقامات، مشارق الانوار اور رسالہ در رد شطحیات ملا آخوند شاہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ آپ نے قرآن مجید کی تفسیر بھی تحریر کی۔ احادیث سے آپ کے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ صحاح ستہ کو زبانی یاد کر رکھا تھا۔ آپ کی خدمت میں جن علماء اور صوفیہ کی آمد ورفت تھی ان میں معروف نام میر محمد علی قادری، بابا عثمان قادری، ملا عبدالرزاق گوجواری، ملا حسین خباز، شاہ محمد صادق قلندر، شیخ عبدالرحیم قادری، ملا کاظم چہرہ، ملا عابد ٹوپیگرو، خواجہ احمد یسوی، حاج بابا قادری، شیخ احمد مفتی، ملا محمد طاہر، ملا محمد یوسف اور ملا عبدالنبی رحمہم اللہ کے ہیں۔ ان میں سے کچھ بزرگ آپ کے مرید اور خلیفہ بھی تھے۔ انھیں لوگوں کی مدد سے آپ نے اپنی کتاب فتاویٰ نقشبندیہ کی تالیف بھی فرمائی۔ آپ کی علمی وروحانی خدمات کا سلسلہ اخیر عمر تک جاری رہا۔ ۷۱ رسال کی عمر میں ۱۰۸۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے تین بیٹوں کی موت آپ کے سامنے ہوچکی تھی لہٰذا کم سن پوتے نظام الدین کو آپ کا جانشین اور خانقاہ نقشبندیہ کا متولی قرار دیا گیا، مگر حقیقت میں خانقاہ کی نگرانی آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت گل بیگم کیا کرتی تھیں۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ گل بیگم جو خود ایک خدا رسیدہ صوفیہ تھیں، مغل بادشاہوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور اعلیٰ درجے کی انتظام کار تھیں۔ انھوں نے خانقاہ، مریدین اور خدام کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس خوش اسلوبی سے نبھایا کہ ہر شخص آپ کا مدح خواں ہوگیا۔ مہمانوں کی بھیڑ ہوتی تھی مگر اس کے باوجود ان کے قیام وطعام کا بندوبست اور اور خدام وفقراء کی کفالت کی

ذمہ داری آپ بہ خوبی انجام دیتی رہیں۔ ساتھ ہی اپنے ہونہار پوتے کی تربیت بھی کرتی رہیں۔

حضرت معین الدین نقشبندی کی شاہانِ مغلیہ سے رشتہ داری محل تحقیق ہے۔ تاریخ کی کتابیں اس معاملے میں خاموش ہیں۔ البتہ 'تحفۂ نقشبندیہ' کے حوالے سے 'حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندیہ' کے حاشیہ میں یوں تحریر ہے:

---گل بیگم صاحبہ آپ یعنی حضرت خواجہ معین الدین صاحب کے نکاح میں آئی تھیں۔ جن کے بطن سے آپ کو دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئی تھیں۔ تیسرا فرزند خواجہ---(نام نہیں پڑھا جاسکا) تھا جو خوردسالی میں فوت ہوا تھا۔ آپ کی بڑی دختر خواجہ محمد صادق فرزند خواجہ عیسیٰ جو حضرتِ ایشان خواجہ خاوند محمود کے اقرباء سے تھے اور لاہور میں ساکن تھے کے نکاح میں آئی۔ آپ کی دوسری بیٹی لاڈنی بیگم، عالمگیر بادشاہ کے عہد میں محل دروں (یعنی اندرون محل شاہی) میں تھیں۔ ان کی ایک دختر تھی جو آپ کے پوتے خواجہ نظام الدین کے عقد میں تھیں۔ آپ کا بڑا بیٹا خواجہ شرف الدین تھا اور چھوٹا خواجہ جانی۔ خواجہ جانی کو خواجہ رحمت اللہ، جس کا خطاب سربلند خاں اور جو عالمگیر بادشاہ کے عہد میں ہندستان کا میر منشی تھا، کی بیٹی نکاح میں تھی لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور خواجہ جانی موصوف آپ کی حیات میں ہی لاولد ہونے کی حالت میں انتقال کر گئے۔ خواجہ شرف الدین کا پیوند نکاح خواجہ ہاشم کی بیٹی سے ہوا۔ خواجہ ہاشم مذکور کے نکاح میں عجیب بیگم تھیں، جو شاہی خاندان چغتائیہ سے تھیں۔ خواجہ ہاشم کی بیٹی کے بطن سے خواجہ شرف الدین کو دو بیٹے ہوئے خواجہ نظام الدین محمد اور خواجہ محمد سنگی---

(تحفۂ نقشبندیہ، صفحہ ۳۴-۳۵)

مندرجہ بالا عبارت سے جہاں کشمیر کے اس معروف خانوادے کے شاہان مغلیہ کے ساتھ قربت کا پتہ چلتا ہے وہیں خواجہ معین الدین نقشبندی کی اولاد واخلاف کے بارے میں بھی جانکاری ملتی ہے۔

اس مضمون کی جانکاریاں درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندیہ

۲۔ تحفہ نقشبندیہ

۳۔ تذکرہ اولیاء پاک و ہند

۴۔ تذکرہ اولیاء کشمیر

۵۔ واقعاتِ کشمیر

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی
مثال ماہ چمکتا تھا جس کا داغ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

اقبالؔ

حضرت معین الدین نقشبندی کے فیض یافتگان

حضرت خواجہ معین الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ صاحبِ ظاہر و باطن تھے اور آپ کے علمی و روحانی کارنامے بھی عظیم الشان تھے لہٰذا اہل علم اور اہل تصوف آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ جن لوگوں نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا انکی تعداد شمار و قطار سے بلند ہے مگر کچھ ایسے افراد تھے جو علمی و روحانی صلاحیتوں میں ممتاز تھے، انھیں تذکرہ نگاروں نے یاد رکھا ہے اور مختلف کتابوں میں ان کا ذکر احترام کے ساتھ ملتا ہے۔

اخوند ملا طیب:

رسمی علوم میں درجہ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔ راہ سلوک و معرفت بابا نصیب الدین غازی کی زیر نگرانی طے کی۔ صالح خان جیو اور میر محمد قادری جیسے اہل طریقت سے صحبت

رہی۔ آخرکار خواجہ معین الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ ہوکر درجۂ کمال تک پہنچے۔ صاحبِ تصرف بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ کشف وکرامت بھی تھے۔ اچھے شاعر تھے، کلام میں سوز وگداز کی کیفیت ملتی ہے۔ خیالات بلند اور متصوفانہ تھے۔ ۲۴رذی الحجہ ۱۰۸۶ھ کو انتقال ہوا۔

ملا عبدالرحیم ففو:

ایک بہترین عالم تھے اور خواجہ معین الدین نقشبندی کی خانقاہ میں درس وتدریس پر مامور تھے۔ اصلا بدخشانی تھے اور کشمیری زبان مشکل سے بولتے تھے۔ ابتدا میں اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں ملازم تھے اور میر توزک جاں نثار خاں کی تعلیم وتربیت پر بادشاہ کے حکم سے مامور تھے۔ جاں نثار خان کے ساتھ ماوراء النہر کا سفر کیا اور وہاں کے بادشاہ کے دربار میں علماء سے مباحثہ کیا۔ بخارا کے بڑے بڑے علماء نے آپ سے فیض پایا۔ ۱۱۰۷ھ میں انتقال ہوا۔

خواجہ حیدر رنٹو:

کم عمری سے سنت نبوی کے پابند ہوگئے اور تقویٰ وپرہیزگاری میں پوری زندگی گزار دی۔ فتاویٰ نقشبندیہ کی تالیف میں خواجہ معین الدین نقشبندی کے مشیر رہے۔ آپ کے والد خواجہ فیروز حضرت عبدالشہید احراری نقشبندی علیہ الرحمہ کے ارادت مندوں میں تھے اور انھیں کی دعا کے بعد آپ کی پیدائش ہوئی۔ بابا نصیب الدین غازی اور مولانا جوہر نانت جیسے اہل علم واہل صفا نے آپ کی تعلیم وتربیت میں حصہ لیا تھا مگر تکمیل محدث عصر شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی۔ خواجہ حیدر کو ان کے عہد کے اہل علم 'علامہ' کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ یہ گویا ان کی علمی سربلندی کا اعتراف تھا۔ آپ کو قاضی کے عہدے کی پیشکش ہوئی مگر قبول کرنے سے منع کر دیا اور اپنے بیٹوں کو بھی اسکی اجازت نہیں دی۔ ۱۰۵۷ھ میں انتقال ہوا اور وصیت کے مطابق آپ کی قبر پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی۔

خواجہ ابوالفتح کلو:

ایک بڑے عالم، بلند پایہ فقیہ اور ممتاز صوفی تھے۔ خواجہ حیدر کے شاگرد تھے اور خواجہ معین الدین نقشبندی کی محافل میں شریک رہا کرتے تھے۔ فتاویٰ نقشبندیہ کی تالیف میں مشیر رہے اور خود بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ 'سیف السابین' نامی کتاب کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ آخری عمر میں مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انتقال کے بعد بڈشاہ کے مقبرے میں دفن کیے گئے۔

مولانا عبدالحکیم:

دینی اور عصری علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ ہمعصر آپ کے علمی مقام کو تسلیم کرتے تھے۔ آپ کے والد خواجہ عبدالکریم بانڈے قانون گو کے عہدے پر ممتاز تھے۔ جب خواجہ معین الدین نقشبندی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دل کی دنیا زیروزبر ہوگئی۔ پیر کامل نے سعادت مند مرید کو راہ سلوک طے کرایا اور منزل عرفان تک پہچایا۔

❖○❖

اس مضمون کی جانکاریاں درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں

۱۔ واقعاتِ کشمیر

۲۔ تحفہ نقشبندیہ

۳۔ تذکرہ اولیاء پاک و ہند

۴۔ تذکرہ اولیاء کشمیر

۵۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقت نقشبندیہ

شاکر وہ ہے جو کسی عطیہ کا شکر کرے اور شکور وہ ہے جو نہ دینے پر بھی شکر کرے۔

(قشیری)

عشق ہے بے زمام ابھی، عشق ہے ناتمام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
دانش و دین علم و فن بندگی ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

اقبالؔ

نوربخشیہ سلسلہ اور سید شمس الدین

کشمیر میں نوربخشیہ سلسلہ کے بانی سید شمس الدین ہیں جو وادی کے عام سنی مسلمانوں سے الگ نظریہ رکھتے تھے۔ ان کے اعتقادات شیعوں سے زیادہ قریب تھے، لیکن وہ پوری طرح شیعہ عقائد بھی نہ تھے۔ نوربخشیہ فرقہ کے بانی سید محمد بن محمد بن عبداللہ تھے۔ وہ کوہستان کے مقام قاعین میں ۷۹۵ھ بمطابق ۱۳۳۹ء پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ خواجہ اسحٰق ختلانی کے مرید ہو گئے۔ خواجہ صاحب خود حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، مگر ان کے نظریات اپنے پیر سے کچھ معاملات میں الگ تھے۔ ان پر بعض شیعہ عقائد کی چھاپ تھی۔ خواجہ اسحٰق ختلانی نے اپنے مرید سید محمد بن محمد بن عبداللہ کو نوربخش کا لقب دیا اور سید علی ہمدانی کا خرقہ دے کر ان کے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس بات سے تیمور کے بیٹے اور اس کے جانشیں مرزا شاہ رخ کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی اور اسے قید میں ڈال دیا۔ انھیں اپنے

دعوائے مہدیت کی وجہ سے تین بار جیل جانا پڑا مگر انھوں نے اپنے نظریات کو نہیں چھوڑا۔ شاہ رخ کی موت کے بعد انھیں آزادی ملی اور 'رے' میں رہائش اختیار کرلی۔ یہیں ۱۴۶۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور ان کا جانشین ان کا بیٹا شاہ قاسم بنا۔

نور بخشیہ سلسلہ بھی دیگر صوفی سلسلوں کی طرح ہی تھا۔ اس سلسلے کے افراد بھی دوسرے سلاسل کے افراد کی طرح ہی نظریات رکھتے تھے۔ وہ بھی نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور امام جعفر صادق سے مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی تعلیمات حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ فنا و بقا، عزلت نشینی اور استغراق کے نظریات بھی دوسرے صوفیہ جیسے ہی تھے۔ یہاں کی خانقاہ کا نظام بھی دوسری خانقاہوں جیسا ہی تھا لیکن کچھ نظریات عام سنی مشائخ سے الگ تھے۔ وہ شیعوں کی طرح بارہ اماموں کے قائل تھے۔ وہ محرم مناتے اور اس دوران سیاہ کپڑے پہنتے تھے۔ تینوں خلفاء راشدین اور بعض دیگر اصحاب سے تبرا کا اظہار کرتے تھے۔ متعہ کو درست مانتے تھے۔ مگر اسی کے ساتھ جب ان کی محفل وعظ ہوتی تو امام غزالی، بایزید بسطامی اور جنید بغدادی سمیت دیگر صوفیہ کے ملفوظات و حکایات کا بیان بھی ہوتا تھا۔ عارفانہ غزلیں گائی جاتیں اور وجد و حال کا سماع بھی رہتا تھا۔ ان نظریات سے پتہ چلتا ہے کہ سید محمد نور بخش کے نظریات شیعیت سے متاثر تھے اور آگے چل کر اس سلسلے سے دوسرے سنی نظریات کو بھی نکال دیا گیا اور اسے پوری طرح شیعہ کر دیا گیا۔

سید شمس الدین نے کشمیر میں نور بخشی سلسلے کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کے ابتدائی حالات کی زیادہ جانکاری نہیں ملتی، مگر اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اچھے ڈھنگ سے ہوئی تھی اور وہ اچھے خطیب و عالم تھے۔ وہ نجیب الطرفین سید تھے۔ والد موسوی سید تھے اور والدہ قزوین کے ایک اچھے گھرانے سے تھیں۔ ہرات کے بادشاہ حسین مرزا بایقرا نے ان کی خوبیوں کو پہچانتے ہوئے انھیں سرکاری ملازمت میں رکھ لیا تھا۔ وہ سلطان حسین کی طرف سے سفیر بن کر ۱۴۸۰ء میں کشمیر آئے اور اپنے نظریات کا خفیہ طور پر پرچار شروع کیا، مگر جب یہاں کے علماء اور عوام کو پتہ چلا تو ان کی مخالفت شروع ہوگئی۔ وہ آٹھ سال تک کشمیر میں رہے اور ایک چھوٹے سے طبقے کو اپنا ہم

خیال بنانے میں کامیاب رہے۔ ہرات واپسی کے بعد ہرات کے بادشاہ حسین کو ان کے خیالات کو لے کر کچھ شبہ ہوا تو شمس الدین کو خطرہ محسوس ہوا اور سرکاری ملازمت چھوڑ کر رے میں شاہ محمد قاسم کے پاس چلے گئے۔ شاہ قاسم کے سمجھانے پر وہ دوبارہ کشمیر آئے اور اپنا کام شروع کیا۔ بعض روایتوں کے مطابق ان کے پہلے سفر کشمیر کے دوران بابا اسماعیل کبروی ان کے ہم خیال ہو گئے تھے، مگر بعد میں ان نظریات سے تائب ہو کر اپنے پرانے اعتقاد کے راستے کو اپنا لیا۔ انھیں شمس الدین نے وادی میں اپنا نمائندہ بھی مقرر کیا تھا اور ان کے ذمہ اپنے نظریات کی تبلیغ کا کام بھی سونپا تھا۔ مگر بابا اسماعیل کبروی کے الگ ہونے کے بعد یہ جگہ خالی تھی اور اسے دوبارہ پُر کرنے کی غرض سے وہ خود ہی کشمیر چلے آئے۔

انھیں وادی میں کچھ معاونین بھی مل گئے، جن میں سب سے اہم بابا علی نجار تھے، جنھوں نے اپنے تمام مریدین کو ان کے حوالے کر دیا اور دوسری اہم شخصیت تھی موسیٰ رینہ کی جو ایک بااثر رئیس تھا۔ اس نے خانقاہ کے لئے زمین فراہم کی اور روپئے، پیسے سے بھی مدد کی۔ یہ تمام ابتدائی کامیابیاں تھیں، مگر بعد میں کئی مشکلیں بھی آئیں اور مخالفت بھی زبردست ہوئی جس کے سبب شمس الدین کو یہاں سے نکل جانا پڑا۔ وہ یہاں سے نکل کر بلتستان چلے گئے جہاں اپنے مسلک کی تبلیغ کی اور کچھ بدھ باشندوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ دو مہینے قیام کے بعد وہ پھر سرینگر واپس آ گئے، کیونکہ اب موسیٰ رینہ خود کشمیر کا وزیر اعظم بن چکا تھا اور اپنے نظریات کی تبلیغ کے لئے سنہرا موقع تھا۔ سید شمس الدین نے جدوجہد کر کے اصحاب اقتدار میں سے بعض لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کا کام ان کے جانشینوں نے جاری رکھا۔ لیکن اس وقت تک ان کے نظریات کے ماننے والے بڑی تعداد میں پیدا ہو چکے تھے اور ان کے قدم مضبوط ہو چکے تھے۔ شمس الدین نے اسلام کی تبلیغ کا کام کیا اور مسلمانوں کی اصلاح کا کام بھی انجام دیا لیکن اسی کے ساتھ ان کی مخالفت بھی بڑے پیمانے پر ہوئی جس کا اہم سبب ان کے نظریات تھے۔

جب مرزا حیدر دوغلت کا عہد آیا تو نوربخشیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے مگر

اس کے انتقال کے بعد چک حکمران ہو گئے اور ایک بار پھر نور بخشیوں کو آزادی کے ساتھ اپنے نظریات اور عقائد کی تبلیغ کا موقع ملا۔ دھیرے دھیرے نور بخشیہ تحریک نے شیعیت کا روپ لے لیا اور جو نظریات شیعیت سے میل نہیں کھاتے تھے انھیں ہٹا دیا گیا۔ بعض نور بخشی سنی ہو گئے، اس طرح اس تحریک کا لگ بھگ خاتمہ ہو گیا۔ دور دراز علاقوں میں جو نور بخشی رہ گئے تھے وہ بھی مقامی آبادی کے زیر اثر اپنے نظریات سے دور ہو گئے۔

اس مضمون کی تیاری کے وقت درج ذیل کتابیں زیر نظر رہیں:

۱۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں (محبّ الحسن)

۲۔ تاریخ فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ)

۳۔ واقعات کشمیر

۴۔ تحفۃ الاحباب

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں
جلاسکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

اقبالؔ

غریقِ توحید اللہ آخوند ملا شاہ

آخوند ملاشاہ قادری بدخشی رحمۃ اللہ علیہ کا کشمیر کے صوفیہ میں ایک نمایاں مقام ہے۔آپ بدخشاں کے رہنے والے تھے اور ایک ذی استعداد عالم دین بھی تھے۔اکثر سوز وگداز اور وارفتگی کی کیفیت میں مبتلا رہتے تھے۔اسی حالت میں ہندستان کی طرف چل پڑے۔یہاں اپنے بیشتر ایام کشمیر میں گزارتے اور موسم سرما میں لاہور چلے جاتے، جہاں آپ کے پیرومرشد میاں میر لاہوری قیام پذیر تھے۔کم عمری سے ہی دل کا میلان طلبِ حق کی جانب تھا اور یہی طلب آپ کو کشمیر لائی تھی۔یہاں دامن کوہ کا پرسکون اور قدرتی ماحول آپ کے حسب حال تھا۔یہ یکسوئی کے ساتھ عبادت وریاضت اور مجاہدہ ونفس کشی کے لئے اچھی جگہ تھی۔تنہائی پسند تھے اور فقر وفاقہ مزاج میں شامل تھا لہٰذا نہ تو کبھی غلام وخدمت گار رکھتے اور نہ ہی کبھی ہانڈی چڑھتی۔یہاں تک کہ کبھی چراغ بھی روشن نہ ہوتا تھا۔

داراشکوہ وملا شاہ:

حضرت ملا شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کوہِ ماران کے دامن میں رہتے تھے۔ جب شہزادہ داراشکوہ نے آپ کی شہرت سنی تو اپنی بیوی کے ساتھ حاضری دینے آیا اور اظہار عقیدت کے طور پر ایک خوبصورت سی مسجد اور خانقاہ کی تعمیر کرائی۔ شہزادہ آپ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا اور آپ کے مجاہدے ونفس کشی کا قائل تھا لہٰذا اپنی بہن جہاں آرا کے ہمراہ آکر داخل سلسلہ ہوا۔ اپنے دورۂ کشمیر کے دوران شاہجہان بھی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر جبین عقیدت خم کرتا رہا۔ بادشاہ کی صوفیانہ مسائل پر ملاؔ کے ساتھ لمبی گفتگو ہوتی رہی، لیکن شہزادہ داراشکوہ اور اور شہزادی جہاں آرا تو آپ سے بے حد متاثر تھے۔ آپ کو بھی اپنے اس مرید باصفا سے بے حد امیدیں تھیں اور کہا کرتے تھے کہ یہ عزیز قادریہ سلسلے کو فروغ دے گا۔ تذکرہ نگاروں نے ملا شاہ قادری کی عبادتوں اور ریاضتوں کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ داراشکوہ کے مطابق ''میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ شروع میں آپ نے سات سال تک عشاء کی نماز سے صبح تک حبس نفس سے ذکر خفی کیا ہے۔'' ایک دوسری جگہ شہزادہ تحریر کرتا ہے ''تیس سال سے کچھ اوپر آپ نے ایک لحظہ اور ایک لمحہ بھی نیند نہیں کی۔''

ان عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ شہزادہ آپ کے تئیں کیسے جذبات رکھتا تھا۔ اسی طرح تذکرہ اولیاء پاک وہند میں ہے کہ ''سن بلوغ سے تاحیات آنکھ میں نیند نہیں آئی۔ زمین سے پشت نہیں لگائی۔''

طریقۂ اصلاح:

آخوند ملا شاہ قادری کا طریقہ کار بے حد آسان اور متاثر کن تھا۔ وہ اپنی باتیں دلیلوں اور ثبوتوں کے ساتھ کہتے تھے۔ اس لئے اکثر مخالفین اور بحث پر آمادہ افراد آپ کی باتوں کو مان لیتے تھے۔ آپ کی کوشش سے ہزاروں بددین دیندار بن گئے اور ان گنت مسافران راہ سلوک نے اپنی منزل تک رسائی پائی۔ شہزادہ داراشکوہ نے لکھا ہے کہ ''مسئلہ توحید میں مجھے سخت مشکل

درپیش تھی مگر بخوف حضرت سے عرض نہ کرتا تھا کہ ایک بار میں نے توجہ روح پرفتوح حضرت سید عالم کی طرف کی۔اسی وقت روح پاک مع خلفاء راشدین ظاہر ہوئی اور ارشاد کیا کہ اللہ جل شانہ' قادر ہے۔جس طرح چاہے قدرت اس کی متقاضی ہوتی ہے۔بندگان مومنین کو دیدار کراتا ہے۔اس جواب سے میری مشکل حل ہوئی۔جب بار دیگر خدمت میں حاضر ہوا،تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ اپنے مسئلہ کا جواب پایا؟ جس شخص نے جواب دیا میں نے ان کو اطلاع کی تھی۔"

ولی رام اور ملا شاہ:

حضرت ملا شاہ قادری کے ذریعے جن لوگوں نے راہ ہدایت پائی ان میں ان میں اہم ترین نام ولی رام کا ملتا ہے، جو شہزادہ داراشکوہ کے مصاحبوں میں سے تھے۔ذات کے کائستھ تھے اور امیر الامراء کا منصب رکھتے تھے۔شہزادہ کی صحبت سے میلان طبع تصوف اور فلسفہ وحدت الوجود کی طرف ہو گیا تھا۔جب ملا شاہ قادری کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عشق الٰہی دامن گیر ہوا۔قبول اسلام کے بعد مرید ہو گئے اور سب جاہ وجلال چھوڑ کر صوفیوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ولی اچھے شاعر تھے اور انکی شاعری میں بھی وحدت الوجودی رنگ چھایا ہوا ہے۔

مانہ آنِ خودیم ، آنِ توایم
بے نشانی تو مانشانِ تو ایم
ایں نشانہا نشانِ ذاتِ تواند
مظہرِ جلوهٔ صفاتِ تواند

نظریۂ وحدت الوجود اور ملا شاہ:

ملا شاہ قادری وحدت الوجود کا نظریہ رکھتے تھے اور اسکی جھلک ان کی پوری زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔وہ فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔رنگ وحدت ملاؔ کے کلام کو ممتاز کرتا ہے۔

حرف دیوانگی است در دلِ ما

چہ زند سرِدگر ازیں گلِ ما

دررہِ عشق آنکہ مارا کشت

غیرِ ماکس نبود قاتلِ ما

ماکہ جز حق نہ ایم ازعرفاں

پس چہ پرسی زحق وباطل ما

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

آنراکہ بجاست برسرِ ایماں جنگ

اومومن وزایمانِ من اوراصد ننگ

مومن نشود تاکہ برابر نشود

بابانگِ نماز، بانگِ ناقوس فرنگ

صلح کل کارویہ:

نظریۂ وحدت الوجود کے اثر سے انسان میں صلح کل کارویہ پیدا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ صوفیہ نے انسان کو مذہب، ذات، رنگ اور نسل کے خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا۔انسان انھیں عیال اللہ نظر آیا اور ساری مخلوقات کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا انھیں فرض اولین محسوس ہوا۔ملا شاہ قادری کا نظریہ بھی ایسا ہی تھا اور اسی پر ان کے مرید داراشکوہ نے بھی عمل کیا۔ملّا اکثر بے خودی کی کیفیت میں مبتلا رہتے اور کئی بار اسی عالم میں ان کی زبان پر ایسے اشعار جاری ہوجاتے جو اہل شرع کے نزدیک قابل گرفت تھے۔ایک بار انھوں نے کہا ؎ (نقل کفر کفر نہ باشد)

پنجہ درپنجۂ خدا دارم

من چہ پروائے مصطفیٰ دارم

علماء کشمیر نے اس شعر پر مواخذہ کیا اور ملاؔ کو واجب القتل قرار دے کر بادشاہِ وقت شاہجہاں سے حد شرعی جاری کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے کشمیر کے گورنر کے نام حد جاری کرنے کا فرمان بھی لکھ دیا مگر درمیان میں شہزادہ داراشکوہ آ گیا اور اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اتنا بڑا قدم اٹھانے میں جلد بازی نہ کی جائے۔ پہلے کسی بزرگ سے استفسار کیا جائے۔ شاہجہاں نے شہزادے کے مشورے کو قبول کرلیا اور حضرت میاں میر لاہوری سے دریافت کیا۔ میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ احوال کے تابع ملاشاہ کی زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں، جن سے پرہیز ضروری ہے، لیکن اس کی بنیاد پر اس کا قتل درست نہیں۔ بادشاہ نے حضرت میاں میر کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے ملاؔ شاہ کے خلاف قدم نہیں اٹھایا۔

سیاسی اثرات:

حضرت ملاؔ شاہ قادری ایک تارکِ دنیا تھے باوجود اس کے ان پر بھی سیاسی تبدیلیوں کے اثرات پڑے اور ایسا اس لئے ہوا کہ وہ شہزادہ داراشکوہ کے پیرومرشد تھے، وہ شہزادہ جو سلطنت کا مضبوط دعویدار تھا۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ شہزادہ داراشکوہ جو شاہجہان کا بڑا بیٹا تھا اور باپ کا محبوب بھی تھا، اپنے بھائی اورنگ زیب کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی ہوئی اور خود شاہجہاں قید وبند کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا۔ داراشکوہ کے خیرخواہوں پر بھی آفت آئی۔ کچھ قتل ہوئے اور کچھ گرفتار ہوکر قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ اب علماء نے ایک بار پھر ملاؔ شاہ قادری کے خلاف آواز بلند کی تو اورنگ زیب نے کشمیر کے گورنر کے پاس ملاؔ کی طلبی کا پروانہ بھیجا۔ اس وقت تک ملاشاہ بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے، لہٰذا گورنر نے بادشاہ کو لکھا کہ شیخ سفر کے لائق نہیں، بحالیٔ صحت کے بعد روانہ کیا جائے گا۔ اسی دوران ملاؔ نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر کچھ اشعار لکھے، جو اورنگ زیب تک بھی پہنچے۔ اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

صحنِ دلِ من چوں گلِ خورشید شگفت
کآمدِ حق و غبارِ باطل رفت
تاریخِ جلوسِ شاہِ حق آگہ را
ظل الحق (۱۰۶۹ھ) گفت، الحق ایں راحق گفت

ان اشعار نے اورنگ زیب کے دل کو بدل دیا اور اپنا پہلا حکم نامہ منسوخ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ ملا شاہ اب کشمیر کے بجائے لاہور میں قیام کریں۔ چنانچہ شیخ لاہور منتقل ہو گئے اور یہیں گوشہ نشینی کی حالت میں باقی زندگی گزاردی۔ یہاں لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم کرتے تھا۔ عام لوگ خلوت میں نہیں مل سکتے تھے۔ صرف خواص ہی مل سکتے تھے۔ آخری وقت میں فرمایا کرتے تھے ''اول و آخر من بہ غربت گزشت'' (الحمد للہ میرا آغاز وانجام مسکینی میں ہوا۔) موت سے قبل اپنے مرشد کے مقبرے کی زمین خرید لی اور یہیں دفن کرنے کی وصیت کی ۔اپنی تاریخ وفات خود کہی ''داد درتوحید ملا شاہ جان'' (۱۰۷۲ھ) بخار میں مبتلا ہو کر ۱۰/اکتوبر ۱۶۶۱ءکو لاہور میں انتقال ہوا۔ محلہ اسلام پورہ لاہور میں مدفون ہیں۔

❖○❖

اس مضمون کی جانکاریاں درج ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔ تذکرہ اولیاءِ کشمیر
۲۔ تذکرہ شعرائے کشمیر (حسام الدین راشدی)
۳۔ واقعاتِ کشمیر
۴۔ سکینۃ الاولیاء (شہزادہ داراشکوہ)
۵۔ تذکرہ اولیاءِ پاک وہند
۶۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندیہ
۷۔ رودِ کوثر (شیخ محمد اکرام)

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں

اقبالؔ

میدان تصوف کے تین شہسوار

وادیٔ کشمیر اصل میں وادیٔ تصوف ہے۔اس خطے کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں اولیاء اور صوفیہ کے قدم نہ پڑے ہوں۔ایک سے بڑھ کر ایک صوفی اور خدارسیدہ بزرگ اس سرزمین کی آغوش میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ان میں بعض شخصیات اپنی روحانیت اور علمی مشاغل کے سبب سے زیادہ ممتاز ہیں۔انھیں ممتاز افراد میں سے تین صوفیہ کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

مولانا جوہر نانت رحمۃ اللہ علیہ

آپ اپنے دور کے ممتاز صوفی اور عالم تھے۔کشمیر کے شرفاء میں شمار کئے جاتے تھے۔ نانت قوم سے تعلق کی وجہ سے یہ لفظ آپ کے نام کا حصہ بن گیا۔پوری زندگی تحصیل علم اور اشاعتِ علم میں گزار دی۔حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آنا جانا

تھا اورانھیں کے حکم سے بابا داؤ دخا کی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہو گئے، جہاں راہ سلوک اور طریقت کی تعلیم پائی اور زمانے میں یکتا ہوئے۔ بابا داؤ دخا کی علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد حاجی موسیٰ علیہ الرحمہ کی مریدی اختیار کی اور روحانیت کی تکمیل ہوئی۔ کشمیر کے معروف علمی ادارے مدرسہ سلطان قطب الدین میں مدرس کی حیثیت سے ایک طویل وقت گزارا مگر روزگار کے لئے اون کا کام کرتے تھے۔ توکل اور گوشہ نشینی کو کمال تک پہنچایا۔ حدیث کے فن سے بے حد لگاؤ تھا لہٰذا اس فن میں آپ کو درک بھی حاصل ہوا۔ آخری عمر میں حج کیا اور مکہ مکرمہ کے علماء حدیث سے سند واجازت پائی۔ مولانا علی قاری اور شیخ ابن حجر مکی رحمہما اللہ سے بھی استفادے کا موقع ملا۔

مولانا جوہر نانت رحمۃ اللہ علیہ انتہائی گداز قلب والے بزرگ تھے۔ آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز رہتی تھیں۔ خوف خدا ہمیشہ دل پہ طاری رہتا تھا۔ اس کیفیت کا اثر حاضرین پر بھی پڑتا تھا اور کئی بار آپ کی کیفیت دیکھ کر وہ بھی رو پڑتے تھے۔ درس وتدریس سے جو بھی وقت ملتا اسے عبادت وریاضت اور مجاہدہ ونفس کشی میں صرف کرتے۔ ۱۰۲۶ھ میں عام وبا آئی اور اسی میں انتقال ہوا۔ آپ کا مزار روضہ اخوند حسین خباز رحمۃ اللہ علیہ کے مشرق میں واقع ہے۔

بابا نصیب الدین غازی رحمۃ اللہ علیہ

آپ ابوالفقراء کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ چونکہ غرباء اور مساکین کی دستگیری فرمایا کرتے تھے اس لئے اکثر غریب اور مسکین لوگ آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے لوگ آپ کو ابوالفقراء کہنے لگے۔ کمسنی سے ہی آپ کو عبادت وریاضت کا شوق ہو گیا تھا اور ابتدا سے اللہ والوں سے دلی لگاؤ رہتا تھا یہی وجہ ہے کہ اپنے دور کے صوفیہ میں ممتاز حیثیت کے حامل ہو گئے تھے۔ حضرت بابا داؤ دخا کی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے پیر ومرشد تھے مگر ان کے علاوہ دوسرے صوفیہ سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ آپ کے اندر علم تھا اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ ان معنوں میں بھی آپ ایک اکیلے تھے کہ لوگوں کی اصلاح کے لئے ایک جگہ نہ ٹھہر کر سفر کرتے رہتے تھے۔ ان سفروں کا مقصد عوام کو اپنی تقریروں اور وعظوں سے فائدہ پہنچانا

تھا۔اس سے گاؤں اور قصبات کے عوام کو آپ سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا،لوگوں کی اصلاح ہوجاتی تھی اور شریعت وطریقت کی اشاعت بھی ہوتی تھی۔ان علاقوں میں عوام کی روحانی تربیت ہوتی تھی ،اسی کے ساتھ ساتھ مسجدوں اور مدرسوں کا قیام بھی عمل میں آتا تھا اور شرعی احکام کی ترویج واشاعت ہوتی تھی۔ باباصاحب کشف القبور اور کشف القلوب جیسی روحانی صفات کے حامل تھے، باوجوداس کے گوشہ نشینی پر جہد مسلسل اور عمل پیہم کو فوقیت دیتے تھے۔وادی کے گاؤں گاؤں اور دوردراز علاقوں تک صوفیانہ انقلاب کے اثرات کو پہنچانے میں آپ کا کردار بے حد اہمیت کا حامل تھا۔آج جو وادی کے دوردراز علاقوں تک تصوف کے اثرات نظر آتے ہیں اور یہاں کے باشندے اولیاء اللہ کے گردیدہ ہیں اس کا اہم سبب ایسے ہی اللہ والے بزرگ ہیں،جن کی زندگی کالمحہ لمحہ خدا کی مخلوق کے لئے وقف تھا۔

بابا نصیب الدین غازی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی شیخ شمس الدین بھی خاصانِ خدا میں سے تھے اور شیخ اسحٰق کے مرید تھے۔آپ اپنے بھائی کے انتقال کے بعد بھی کچھ دن باحیات رہے اور لوگوں کی اصلاح کی کوششوں میں لگے رہے۔دونوں بھائی بیج بہارہ گاؤں میں ایک ہی مقبرے میں دفن ہوئے۔بابا نصیب الدین غازی کا انتقال ۱۳رمحرم ۱۰۴۷ھ کو ہوا۔مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔

❖○❖

بابا داوٗد مشکوٰتی رحمۃ اللہ علیہ

بابا داوٗد مشکوٰتی رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے معروف اہلِ علم واہلِ عرفان میں سے ہیں۔آپ کو حکمتِ معانی وبیان کے ساتھ ساتھ شریعت کے علوم پر بھی دسترس حاصل تھا۔علم فقہ اور حدیث میں مہارت رکھتے تھے اور بے شمار حدیثیں سندوں کے ساتھ آپ کو یاد تھیں۔حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح آپ کو سندوں کے ساتھ پوری طرح حفظ تھی اسی لئے آپ کو مشکوٰتی کہا جانے لگا۔ظاہری علوم خواجہ حیدر چرخی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا جو اپنے عہد کے ایک معتبر عالم تھے اور علماء کے مرجع بھی۔روحانی علوم کے حصول کے لئے ابوالفقراء بابانصیب الدین

غازی رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کیا، جنھوں نے اپنے لائق وفائق مرید کی زبردست روحانی تربیت فرمائی۔ آپ اپنے پیرومرشد کے ساتھ سفروحضر میں رہتے تھے۔آپ کی خواجہ خاوند محمود رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دوستی تھی، اور آپ ہی کے ذریعے خواجہ صاحب اور بابا نصیب الدین کی دوستی ہوئی۔ بابا داؤد مشکوٰتی رحمۃ اللہ علیہ کی ملاشاہ قادری سے بھی اچھی دوستی تھی ۔ علمی اعتبار سے بھی آپ کا درجہ بلند تھا۔ فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور کئی کتابیں تحریر فرمائیں۔ ان کتابوں کے موضوعات الگ الگ ہیں مگر زیادہ تر تصوف کے موضوع پر ہیں۔ اسرار الابرار میں کشمیری مشائخ، سادات اور رشیوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح منہاج الریشی میں خصوصاً کشمیر کے رشیوں کا ذکر ہے۔ اسرار الاشجار آپ کی تحریر کردہ مثنوی ہے، جو خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی ،منطق الطیر کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ آپ کی زندگی علماء، فقراء اور اللہ والوں کی صحبت میں گزری اور لمبی عمر پاکر ۱۰۹۷ھ میں وفات پائی۔ سرینگر کے محلّہ گندر پورہ میں مزار ہے۔

اس مضمون کی جانکاریاں درج ذیل کتابوں سے لی گئی ہیں:

۱۔ تذکرہ اولیاء کشمیر

۲۔ تذکرہ علماء پاک و ہند

۳۔ تذکرہ اسلاف

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری وقبا پوشی وکلہ داری

اقبالؔ

صوفیٔ باکمال خواجہ شاہ نیاز نقشبندی

خواجہ شاہ نیاز نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا کشمیر کے صوفیہ میں ممتاز مقام ہے۔ کشمیر میں آپ کو عرف عام میں خوشا صاب کہا جاتا ہے، جو خواجہ صاحب کی تغلیط ہے۔ اسی نام سے سرینگر کا ایک محلّہ بھی موسوم ہے۔ خواجہ شاہ نیاز نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے والد خواجہ عبدالرحیم شیخ کمال رحمہ اللہ علیہ تاشقند سے کشمیر تشریف لائے تھے۔ آپ کا خاندان وہاں کا حکمراں تھا مگر ہندستان آکر شیخ کمال مغل حکمراں محمد شاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ شیخ کمال دنیاوی جاہ حشمت کے ساتھ ساتھ سلوک وطریقت میں بھی رہبر کی حیثیت رکھتے تھے۔ شاہ نیاز نے اپنے باکمال والد کی زیر نگرانی تصوف وسلوک کی تعلیم پائی۔ ظاہری علوم اور مادی دولت سے تو پہلے ہی مالا مال تھے، روحانی تربیت نے اور بھی درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ میاں ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کو حقیقت ومعرفت سے آشنا کیا۔ حضرت عبدالنبی مرجان پوری علیہ الرحمہ نے سندِ حدیث عطا کی،

اور شیخ محمد نعیم تارہ ملی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم البرکت عالم دین نے اپنی صحبت سے فیضیاب کیا۔اس کا یہ اثر ہوا کہ ہر قسم کے جاہ وحشمت کے باوجود آپ شریعت وطریقت دونوں کے پاسبان بن گئے۔بے حد سخی اور جوانمرد انسان تھے۔داد ودہش سے ایک دنیا فیضیاب ہوئی۔علماء اور طلباء سے لے کر عام شہری تک کو آپ نے فائدہ پہنچایا۔کئی بار کشمیر سے بخارا تک کا سفر کیا۔آپ کے ساتھ آپ کے مریدوں،شاگردوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم بھی سفر کرتا تھا ترکستان کے امراء، وزراء، حکام اور خود بادشاہِ وقت نے آپ کا استقبال کیا۔ترکستان کے ایک سفر کے دوران ایک انگریز کرنل ولیم مور کرافٹ کو آپ نے قید سے رہا کرایا۔یہ شخص جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔کرنل ولیم آپ کے لطف وکرم اور رحم دلی سے بے حد متاثر ہوا۔اس نے رہائی کے بعد راجہ رنجیت سنگھ کو خط لکھ کر شاہ نیاز رحمۃ اللہ علیہ کی مہربانیوں کا ذکر کیا اور آپ کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی۔راجہ نے آپ کے لئے ایک جاگیر مقرر کر دی مگر سکھ عہد کی سورش کی وجہ سے آپ کشمیر کو چھوڑ کر کابل چلے گئے۔جہاں ۱۲۴۵ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

شاعری:

خواجہ شاہ نیاز علیہ الرحمہ ایک عمدہ خوشنویس تھے اور آپ کی شہرت خطِ نستعلیق کے ایک بہترین خوشنویس کی بھی تھی۔اسی کے ساتھ طبیعت موزوں تھی،اچھے شعر کہتے تھے۔اپنے دور کے بہترین شاعروں میں گنے جاتے تھے۔آپ نے غزلیں اور رباعیات کہیں ہیں۔علاوہ ازیں ایک لمبی نظم 'چائے نامہ' کے عنوان سے تحریر کی ہے۔یہ کشمیری چائے کی تعریف میں ہے۔اچھے نثر نگار بھی تھے،مگر یہاں صرف شاعری کے کچھ نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔

تیزیٔ خنجر مژگاں تو بلی چیزی نیست
شوخیٔ نرگسِ فتاں تو بلی چیزی نیست
غمزۂ خونریز ولبت جاں دہ وزلفت صیاد
شوخِ من!ایں سروساماں توبلی چیزی نیست

میلِ دل بردنِ خوبانِ گلستاں داری
جلوۂ سروخراماں توبی چیزی نیست
از کہ آموختہ ای گردسرت می گردم
درغضب خندۂ پنہاں توبی چیزی نیست
شوخ چشمی مگر ازدست تو دل بردنیاؔز
آہ ایں گریۂ پنہاں توبی چیزی نیست

❑❖❑

برچشمِ زرتاب رخش، مژگانِ نمناکش نگر
بیتاب کرد آئینہ اش، برجانِ غمناکش نگر
ازبہرقتلِ عاشقاں آراستہ تیر و کماں
ابروے خونریزش ببیں، مژگانِ سفاکش نگر
بادیگراں گوید سخن ،دردیدہ بیند سوئے من
اندازِ دل دزدیش بیں، برہوشِ ادراکش نگر
دارد اگرچہ در جگر دروے زدلدارِ دگر
دل می برد ازیک نظر چشمِ ہوسناکش نگر
خوردہ است زخم کاریٔ ازخنجرِ نازت نیاؔز
چوں مرغِ بسمل دررہت افتادہ برخاکش نگر

رباعی

دیوانہ چشمِ پرخمارم کردی
آشفتہ زلف تابدارم کردی
آرام وقرار وصبر وطاقت بردی
ازیک نگہی تمام کارم کردی

'چائے نامہ' کے ابتدائی اشعار

چوں او زیبا نگاری در جہاں نیست

بہ عالم مثل او آرام جاں نیست

بود پیر وجواں مشتاق رویش

گدا و پادشہ در آرزو یش

نہالِ قد او در آب وگلہا

بہ رعنائی شدہ مقبو ل دلہا

بہار مرغزارِ آرزوہا

درختِ برگ وساز آبروہا

بود از سبزۂ خط خوشنما تر

زحسنِ سبزخوباں دلربا تر

خطااز خط سبزش خط کشیدہ

چوچینِ زلف اودر چیں ندیدہ

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئے ہے:

۱۔ تذکرہ اولیاء کشمیر

۲۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندیہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبالؔ

عارفِ خالق شاہ محمد صادق

جب عشق سکھاتا ہے انداز خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر انداز شہنشاہی

سید شاہ محمد صادق قلندر رحمۃ اللہ علیہ غریقِ بحر معرفت تھے۔ اکثر جذب وکیف اور بے خودی وسرشاری کے عالم میں رہتے تھے۔ اسی لحاظ سے آپ کو قلندر کہا جاتا تھا۔ آپ کا مشرب ومسلک عشق الٰہی تھا۔ سینہ سوز عشق سے جلتا رہتا تھا۔ عالم غیب کے اسرار واحوال کا دل پر انکشاف ہوتا رہتا تھا۔ بحر احدیت ونیستی میں اکثر ڈوبے رہتے تھے۔ عالمِ شریعت، حافظِ قرآن اور قرأتِ سبعہ کے ماہر تھے۔ میر محمد علی قادری علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور خواجہ خرد رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ تھے۔ خواجہ خرد پر اکثر استغراق اور سکر کی کیفیت طاری رہتی تھی، یہی حال شاہ محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ یہ استغراق کئی بار اتنا بڑھ جاتا کہ دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ ایسے میں شرعی

حدود اور قیود کا بھی خیال نہیں رہتا تھا مگر جب ہوش میں آتے تو انتہائی خشوع اور خضوع کے ساتھ مذہبی ارکان اور دینی فرائض کی ادائیگی کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت اس خوش الحانی کے ساتھ کرتے کہ سننے والے بے خود ہو جاتے تھے۔

استغراق کی کیفیت اس قدر ہوتی تھی کہ کبھی کبھی علماء بھی معترض ہو جاتے اور شریعت کی پابندی کا مطالبہ کرنے لگتے۔ ایک مرتبہ شیخ مراد ٹنگ علیہ الرحمہ نے دریافت کیا کہ صراط مستقیم کونسی راہ ہے اور شاہراہ کونسی ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ صحیح راہ شریعت کی راہ ہے اور شاہراہ رسول اکرم ﷺ کی راہ ہے۔ شیخ مراد ٹنگ نے پوچھا پھر آپ نے دوسرا راستہ کیوں اختیار کر رکھا ہے؟

قلندر موصوف نے جواب دیا معذور ہوں، مغلوب ہو جاتا ہوں، مجھ پر بے دین ہونے کا الزام نہ لگائیں۔ ابھی حضرت خواجہ بزرگ نقشبند مجھ پر ظاہر ہوئے اور فرمایا 'کب تک اس حال میں رہو گے؟ اس روز سے استغراق کی کیفیت ختم ہو گئی، مگر انتقال سے پہلے یہی استغراق دوبارہ شروع ہو گیا اسی مغلوبیت کے عالم میں انتقال ہوا۔

قاتلانِ خنجر تسلم را

ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

ذی قعدہ ۱۰۹۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ "شہِ دیں صادقای نقشبندی" مادۂ تاریخ ہے۔

شعر گوئی:

حضرت شاہ محمد صادق قلندر رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے مگر یہ اشعار بھی آپ نے ارادے سے نہیں کہے۔ جب آپ پر استغراق کی کیفیت طاری ہوتی تو زبان پر جاری ہو جایا کرتے تھے، جو خالص عارفانہ ہوتے تھے اور ان میں دنیا سے بے رغبتی کا اظہار ہوتا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ آمد زباغِ زندگانی چید ورفت

آمد و بر ہستی ملک جہاں خندید ورفت

از ازل صادق بہ دنیا میل آمیزش نہ داشت
چند روزے آمد و یارانِ خود آرا دید و رفت

❑❖❑

یکچند پی دانش و دفتر گشتیم کردیم حساب
یکچند پی زینت و زیور گشتیم در عہد شباب
چوں واقف ایں جہاں ابتر گشتیم نقش است بر آب
دست از ہمہ شستیم و قلندر گشتیم اینک دریاب

مندرجہ ذیل منقبت بھی انھیں کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

نیست بر لوحِ دلم نقشے سوائے نقشبند
المدد !یا خواجہ مشکل کشای نقشبند
سکۂ توحید در محروسۂ آفاق زد
شد بلند آوازۂ فقر وفنای نقشبند
از نفس احیایِ اعجازِ مسیحا می کند
می دہد دل زندگی جانم فدای نقشبند

❖○❖

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ واقعاتِ کشمیر

۲۔ تذکرہ اولیاء کشمیر

۳۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقت نقشبندیہ

۴۔ تذکرہ خواجہ باقی باللہ

احسان کرنے والے کو نگاہ میں رکھنا شکر ہے۔نہ کہ احسان کو نگاہوں میں رکھنا۔

(شبلی)

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہران کے مٹ گئے، آبادیاں بن ہوگئیں
سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہوگئیں

اقبالؔ

کشمیر کی تہذیب پر صوفیہ کے اثرات

کشمیر میں اسلام کی باقاعدہ اشاعت صوفیہ کے ذریعے ہوئی اور یہ اشاعت ہی یہاں ایک بڑے انقلاب کی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یہ ایک ہمہ جہت انقلاب تھا جس کی مثال دنیا میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک ساتھ رہنے والی دو قومیں ایک دوسرے کے اثرات سے بچ پائیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ مغلوب اور محکوم قومیں کشادہ دلی کے ساتھ غالب اور حاکم قوموں کے اثرات قبول کرتی ہیں۔ اس کی مثالیں بار بار ہمیں بھارت میں دیکھنے کو ملیں۔ جب یہاں مسلمانوں کا غلبہ ہوا تو ہندستانیوں نے ان کی تہذیب کو اپنا لیا اور ان کے لباس وغیرہ کا فخریہ طور پر استعمال کرنے لگے، یہی نہیں ان کے طرز تعمیر کو بھی اپنایا اور اسے اپنے مذہبی مقامات تک پہنچایا مندر جو خالص ہندوؤں کی مذہبی جگہ ہے وہاں بھی اسلامی

آرکٹکچر نظر آتا ہے۔ راجدھانی دلی میں حال ہی میں تعمیر ہونے والے اکشر دھام مندر میں بھی اسلامی آرکٹکچر کی جھلک ملتی ہے۔ یہ تہذیبی اثرات اتنے گہرے تھے کہ صدیاں بیتنے کے بعد بھی تھوڑے بہت باقی ہیں، لیکن جب مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اور انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کرلیا تو انگریزی زبان، لباس اور تہذیب ملک کے باشندوں کے لئے باعث فخر بن گئی۔ اس تہذیب نے اتنی گہرائی کے ساتھ یہاں جڑ پکڑا کہ آج انگریزوں کے ملک چھوڑے ہوئے ایک زمانہ بیتا مگران کی تہذیب، انکی زبان اور اوران کا بنایا ہوا ملک کا سسٹم اب بھی جوں کا توں قائم ہے۔ بالکل ایسا ہی کشمیر میں بھی ہوا، کہ جو حکمراں طبقے کی تہذیب تھی اسے یہاں کے عوام نے اپنالیا۔ یہ تہذیب صوفیہ کی بھی تھی جن کے اثر نے کشمیر کو اسلام اور تصوف سے روشناس کرایا تھا۔

جب کشمیر میں صوفیہ نے دین کی دعوت کا کام کیا تو ابتدا میں انھیں معمولی قسم کی روک ٹوک کا سامنا کرنا پڑا۔ جو پنڈت پہلے ہی سے سماجی اور سیاسی معاملات کے نگہبان تھے یا دوسرے لفظوں میں اقتدار میں حصہ دار تھے ان کے لئے یہ تبدیلی نا قابلِ ہضم تھی۔ جب انھوں نے یہاں ایک نئے مذہب کو پھیلتے دیکھا تو کچھ رکاوٹیں کھڑی کیں مگر صوفیہ نے ان رکاوٹوں کی پرواہ نہ کی اور اپنے کام میں لگے رہے، کیونکہ وہ اس کے لئے پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار تھے۔ جب برہمنوں نے دیکھا کہ مخالفت کا کچھ خاص اثر نہیں ہورہا ہے اور اس کے باوجود یہاں اسلام کی اشاعت ہورہی ہے تو انھوں نے بھی مخالفت کے بجائے مصالحت کا راستہ اپنایا۔ اسلامی مبلغین کے لئے یہ ایک بہتر موقع تھا انھوں نے اس رویے کا خیر مقدم کیا اور اپنے کام میں زیادہ دلجمعی سے لگ گئے۔

اسلام کا فروغ:

کشمیر میں اسلام کی اشاعت میں ایک خاص بات جو معاون ثابت ہوئی وہ تھی بدھ مت کے اثرات۔ یہاں بدھ مت ایک دور میں اپنا زبردست اثر رکھتا تھا مگر بعد میں شیو مت کے ماننے والوں کے اثرات بڑھنے لگے اور بدھ مت کا زور کم ہوا۔ بدھ مت کے اثر سے وادی میں

ذات پات کی بندھنیں ڈھیلی تھیں لہٰذا چھوت چھات بھی کم تھا۔ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں اسلام کی اشاعت میں ایک بڑی رکاوٹ یہ چھوت چھات کی لعنت بھی تھی۔ اس کے سبب لوگ اسلامی مبلغین سے دور رہتے تھے اور انھیں ناپاک سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے لئے ملیچھ کا لفظ استعمال ہوتا تھا مگر کشمیر میں یہ بات نہ تھی یہاں ذات پات کی بندھنیں صرف ہندوؤں میں تھیں اور ان کا زور بھی کم تھا لہٰذا جب صوفیوں نے ان تک اسلام کا پیغام پہنچایا تو اسے انھوں نے سنا اور اگر پسند آیا تو قبول کیا۔ وادئ کشمیر میں بہت تیزی سے اسلام پھیلا اور اس نے اپنے زبردست اثرات بھی مرتب کیے۔

فرقہ وارانہ اتحاد:

اسلامی مبلغین کا ایک طریقہ افہام و تفہیم اور گفتگو کا بھی رہا ہے۔ جب برہمنوں اور اسلامی مبلغین کے درمیان کی دوریاں ختم ہوئیں تو انھوں نے آپس میں گفت و شنید شروع کی اور ایک دوسرے کے افکار و خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس قدم نے اسلام کی اشاعت میں ایک اہم رول ادا کیا اور ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں تک پیغام کو پہنچانے میں اس سے مدد ملی۔ بدھسٹ اور ہندو عوام صوفیہ کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور عام طور پر مسلمان بھی ہندو جوگیوں اور سادھوؤں کی عزت کرتے تھے۔ اس سے یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور ایک دوسرے کے نظریات کو سمجھنے کی کوششیں کیں۔ دونوں کی قربت کا یہ اثر ہوا کہ عہد سلاطین میں وادی میں کبھی کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ پوری تاریخ میں ایک ایسے فساد کا ذکر ملتا ہے جو حسن شاہ کے دور حکومت میں ہوا تھا۔ مسلمان حکمرانوں کا رویہ بھی غیر مسلموں کے ساتھ منصفانہ تھا۔ کچھ زیادتیاں سکندر بت شکن کے زمانے میں ہوئیں جو اس کے نومسلم وزیر سوبہ بھٹ (سیف الدین) نے کیں مگر پھر اس کا تدارک اس کے جانشیں زین العابدین بڈشاہ نے کر دیا اس نے ہندوؤں کا خاص خیال رکھا اور ان کے حقوق کو تلف ہونے سے بچایا یہاں تک کہ ستی سے بھی پابندی ختم کر دی۔ عام طور پر یہاں کے ہندو اور مسلمان امن و امان سے رہتے تھے

اور ان کے درمیان اتفاق اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ دونوں آپس میں رشتے بھی کرتے رہتے تھے اور ایک دوسرے کے تیج تیوہاروں نیز خوشی اور غم میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محبّ الحسن (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و جامعہ ملیہ اسلامیہ) مختلف تاریخی شواہد کی بنیاد پر لکھتے ہیں:

''ہندو مسلمان میں شادی عام طور پر ہوتی تھی، مسلمان ہندو عورت سے شادی کرتے تو نہ صرف ان عورتوں کے نام باقی رہتے بلکہ وہ اپنے دھرم پر بھی قائم رہتیں۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کی عبادت گاہوں میں جاتے اور تیوہاروں میں شریک ہوتے۔ ہندو صوفیہ کی عزت و تکریم کرتے اور مسلمان سادھوؤں کو عزت کی نظر سے دیکھتے۔ صوفیہ ہندو جوگیوں سے مل کر مذاکرہ بھی کرتے۔ للہ وید اور نورالدین رشی کے عارفانہ گیت ہندو اور مسلمان دونوں کے قلوب کو یکساں طور پر گرماتے تھے۔''

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، صفحہ-۲۸۴)

اصل میں یہ وہ دور تھا جب اسلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا اور ایک دوسرے کے رشتہ دار دونوں مذاہب میں موجود تھے۔ ایک ہی خاندان کے کچھ لوگ مسلمان تھے تو بعض ہندو بھی تھے۔ مذہب تو بدل سکتا تھا مگر رشتہ داریاں ختم نہیں کی جاسکتی تھیں۔ اسلام نے ایک طرف تو اپنے عقائد و نظریات دیئے تو دوسری طرف صوفیہ نے انھیں زندگی کا مقصد بتایا اور اس طرح کشمیر کے باشندوں میں فکری انقلاب آ گیا۔

یہاں چونکہ اسلام اور تصوف دونوں ساتھ ساتھ پہنچے تھے لہٰذا عوام کا رجحان روحانیت کی طرف شروع سے رہا اور وہ صوفیہ و عارفوں کا احترام کرتے رہے۔ اسلام نے اگر انھیں ایک نظامِ حیات دیا تو صوفیہ نے انھیں مذہب کی روح سے آگاہ کیا۔ یہ تصوف کے ابتدائی اثرات تھے جو وادی کے باشندوں پر پڑے۔

صوفیہ کی تعلیمات نے یہاں کے معاشرے پر جو اثرات ڈالے وہ اتنے گہرے تھے کہ

ان کے اثر سے یہاں کا کوئی طبقہ نہیں بچ پایا۔اس بارے میں کئی حوالوں سے فروفیسر محب الحسن لکھتے ہیں:

''یون راج لکھتا ہے کہ' جس طرح ہوا درختوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے اور ٹڈیاں شالی کی فصل کو تباہ کردیتی ہیں، اسی طرح یونیوں نے کشمیر کے رسم ورواج کو برباد کردیا ہے اور کشمیر کی مملکت کو ملیچھوں نے ناپاک کردیا ہے۔' اسی طرح شری در نے بھی پرانی رسموں کے ختم ہونے اور ان کی جگہ نئی رسموں کے آجانے کی شکایت کی ہے۔اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ کشمیری عوام پر آنے والی زیادہ تر آفتوں کا سبب رسم ورواج اور طریقوں میں تبدیلی ہے۔ لیکن ان مذمت بھرے احتجاجوں کے باوجود ہندو سماج بیرونی افکار کو اپنائے بغیر نہ رہ سکا۔انھیں اثرات کے تحت ہندوؤں نے مسلمانوں کے اطوار اپنائے اور لباس پہنے اور کچھ نے تو گائے کا گوشت بھی کھانا شروع کردیا۔''

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، صفحہ-۲۹۰)

صوفیہ کی تعلیمات نے جو اثرات چھوڑے وہ ہمہ گیر تھے۔یہ اثر صرف ان پر ہی نہیں پڑے جنھوں نے اسلام قبول کیا بلکہ ان پر بھی مرتب ہوئے جنھوں نے اسلام سے دوری بنائے رکھا۔ذات پات کے بندھن کمزور ہوئے اور ستی جیسی ظالمانہ رسم کا دھیرے دھیرے خاتمہ ہوگیا۔انتہا یہ کہ کشمیری ہندوؤں میں ایک طبقہ ایسا بھی ابھرا جس نے بت پرستی ترک کردی اور ایک ان دیکھے خدا کو ماننے لگا۔

ہندومت کا اثر مسلمانوں پر:

ایک سماج میں رہنے والے افراد ایک دوسرے سے بہت کچھ لیتے اور دیتے ہیں۔ایسا نہیں ہوتا کہ ایک طبقہ ہی متاثر ہو اور دوسرے طبقے پر کوئی اثر نہ پڑے۔کشمیر میں جہاں ہندوؤں نے مسلمانوں سے اثرات قبول کئے وہیں مسلمانوں نے بھی کچھ ہندوؤں سے

اثرات لئے۔ چونکہ وہ نومسلم تھے اور صدیوں ایک مذہب کے پیروکار رہے تھے لہٰذا پوری طرح ان سے پرانے اثرات کو صاف کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان پر پرانے رسم ورواج کا اثر تھا اور بہت کچھ ان کے پرانے نظریات باقی تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ جو سلاطین باہر سے آئے تھے وہ بھی اس سماج کے اثر سے نہ بچ پائے جس میں وہ سو سال سے رہ رہے تھے۔ پروفیسر محبّ الحسن کی کتاب کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

''کشمیر کے سلاطین اگرچہ باہر سے آئے تھے لیکن ہندوؤں کے اعتقادات اور رسم ورواج کو اپنانے میں وہ اپنی مسلمان رعایا سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ یہ بات ناگریز تھی، کیونکہ سلطنت کی تاسیس کے سو برس بعد تک انھیں ایسے لوگوں کے درمیان رہنا پڑا تھا جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، اس کے علاوہ زیادہ تر سلاطین کی ہندو رانیاں تھیں، جو مشرف بہ اسلام ہونے کے باوجود اپنے پرانے طور طریقوں کو اپنائے رہیں، جس کا خاطر خواہ اثر ان کے شوہروں اور اولادوں پر پڑا۔ مسلمان رعایا کی طرح سلاطین بھی ہندوؤں کے تیوہاروں میں شریک ہوتے اور کچھ تو مندروں میں دیوتاؤں سے مدد کے لئے دعا مانگنے جاتے۔''

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، صفحہ-۲۹۲-۲۹۳)

صوفیہ عام طور پر اسلامی احکام پر کاربند رہتے تھے اور اسی کی تبلیغ واشاعت بھی کرتے تھے۔ ان کا کام عوام کی اصلاح کرنا بھی تھا۔ شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ نے وادی میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح کا بڑا کام کیا مگر ایک طبقہ نومسلم صوفیہ کا بھی ابھرا جو تھوڑے بہت ہندو یا بدھ اثرات رکھتا تھا۔ انھیں رشی کہا جاتا تھا۔ ان کے ذریعے بھی اسلام کی اشاعت کا بڑا کام ہوا مگر ان میں بعض صوفیہ ایسے تھے جو تصوف سے آگے بڑھ کر رہبانیت اپنائے ہوئے تھے۔ وہ سماجی زندگی پر ترک دنیا کو ترجیح دیتے تھے اور جنگلوں، غاروں میں عبادت کرتے تھے۔ مجرد رہتے اور گوشت وغیرہ سے پرہیز کرتے تھے۔

صوفیہ کے اثرات زبان پر:

کشمیر کی سرکاری زبان سنسکرت تھی اور عوامی زبان اس سے مختلف تھی۔ جب وادی میں اسلامی حکومت کا قیام ہوا تو بھی ایک مدت تک سنسکرت ہی سرکاری زبان رہی اور حکومت کے معاملات پنڈتوں کے ہاتھ میں رہے، مگر شہاب الدین کے عہد میں سنسکرت کی جگہ فارسی نے لے لی اور سرکاری زبان فارسی بن گئی۔ اس طرح عوام کا تعلق بھی دھیرے دھیرے فارسی زبان اور اور فارسی الفاظ سے ہونے لگا۔ کشمیر کے سفارتی اور تہذیبی تعلقات ایران اور وسط ایشیا سے بہت گہرے تھے مگر صوفیہ کی زبان فارسی تھی لہٰذا اسے ایک متبرک زبان ہونے کا فائدہ بھی حاصل ہوا۔ علاوہ ازیں اسلامی لٹریچر عربی کے بعد سب سے زیادہ فارسی زبان میں تھا لہٰذا اسلام اور روحانیت کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے بھی فارسی زبان کو جاننا ضروری تھا۔ یہ زمانہ فارسی کی ترقی اور اشاعت کے لئے انتہائی سازگار تھا۔ اس دور میں فارسی کے بڑے بڑے علماء اور شعراء پیدا ہوئے۔ خود صوفیہ میں بیشتر اچھے شاعر تھے اور ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ آج بھی محفوظ ہے۔ (اس کتاب میں بعض صوفیہ کے کلام کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔) ایک طرف جہاں فارسی زبان کو ترقی ملی وہیں مقامی زبانوں پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ اسے زبان کے ماہرین بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں۔

فارسی زبان کو صرف مسلمانوں نے ہی نہیں غیر مسلموں نے بھی پڑھا۔ خاص طور پر فارسی نہ جاننے کی وجہ سے جو برہمن سرکاری عہدوں سے محروم ہوگئے تھے انھیں سلطان زین العابدین بڈشاہ نے اس کے لئے سمجھایا اور انھوں نے اسے اپنا کر بڑے بڑے سرکاری عہدے حاصل کئے اور علمی کتابیں تحریر کیں۔

صنعت پر صوفیہ کے اثرات:

کشمیر میں آج کل جو بھی صنعتیں ہیں وہ صوفیہ کے ذریعے یہاں آئیں۔ شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سات سو صوفیوں کی جماعت آئی تھی جو مختلف فنون میں مہارت رکھتی تھی۔ انھوں نے یہاں کے لوگوں کو ان فنون کی تعلیم دی اور روزگار کا ذریعہ فراہم کیا۔ ان صنعتوں

اور دستکاریوں کو عہد سلاطین میں فروغ حاصل ہوااور ساری دنیا میں مقبولیت ملی۔ کشمیر کے کاریگروں نے ان فنون میں نئے نئے تجربے کیئے اوران کے فنون کے نمونے دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ سلطان زین العابدین کے عہد کے فنون پر پروفیسر محبّ الحسن لکھتے ہیں کہ:

> ''شال، ریشم اور کاغذ کے علاوہ کشمیر میں اونی کپڑے بھی بنتے تھے، جو آج کل کی طرح اس زمانے میں پائے داری اور گرمی کے لئے مشہور تھے۔ان کے علاوہ دریاں، تانبے اور پیتل کے برتن اور شیشہ کے برتن بھی بنتے تھے۔''

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، صفحہ-۳۰۱)

آج جس طرح کشمیری شالوں کی مانگ پوری دنیا میں ہے اسی طرح عہد قدیم میں بھی تھی۔ یہ اس دور میں بھی اکسپورٹ کی جاتی تھی اور امیروں، رئیسوں میں مقبول تھی۔ان کپڑوں اور برتنوں پر ہونے والی نقاشی میں جس طرز کا استعمال ہوتا ہے وہ ایرانی اور وسط ایشیائی ہیں۔ان اثرات کی ابتدا صوفیہ کے ذریعے ہوئی اور آج تک جاری ہے۔

محققین کا ماننا ہے کہ شال بنانے کی ابتدا شاہ ہمدان سید علی ہمدانی نے کشمیر میں کی تھی، کیونکہ ان کے دور سے پہلے اس صنعت کے شواہد نہیں ملتے۔اسی کے ساتھ اس میں جو نقش ونگار ہوئے وہ بھی خالص ایرانی اور وسط ایشیائی تھے۔ جب مغلوں نے کشمیر کو فتح کیا تو یہ صنعت عروج پر تھی۔

کشمیر میں ریشم کے کپڑے بننے کا فن صوفیوں کی آمد سے پہلے آچکا تھا مگر ان کے آنے کے بعد اس پر ایرانی اور وسط ایشیائی اثرات پڑے۔ان کے طرز میں تبدیلی آئی اور انتہائی نزاکت اور نفاست سے بھرے ہوئے ڈیزائن بننے لگے۔

صوفیہ کی سماجی خدمات:

صوفیہ مختلف قسم کی سماجی خدمات انجام دیتے تھے اور لوگوں کے دکھ درد میں کام آتے تھے۔ کشمیر میں جہاں صوفیہ نے خانقاہیں، مدرسے اور مساجد کا قیام کیا وہیں انھوں نے عوامی

فائدے کے لئے باغ، بغیچے بھی لگوائے۔ان باغوں سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔تاریخ فرشتہ اور تاریخ رشیدی کے مطابق رشیوں کی ایک عام عادت تھی کہ وہ جہاں بھی جاتے سایہ دار اور پھلدار درخت لگا دیتے۔ان میں شفتالو، خوبانی، سیب انگور اور بادام وغیرہ کے درخت ہوتے تھے۔بعض صوفیہ تو ایسے بھی تھے جو کھیتی باڑی کر کے گزر بسر کرتے تھے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں، مسکینوں پر خرچ کر دیتے تھے۔

برتنوں پر صوفیہ کے اثرات:

ساری دنیا میں کھانے پینے کے لئے برتنوں کا استعمال ہوتا ہے۔یہ مختلف شکلوں اور ڈیزائنوں کے ہوتے ہیں۔ان برتنوں پر قلعی بھی کی جاتی ہے۔قلعی کا فن برصغیر میں ایران اور وسط ایشیا سے آیا۔کشمیر میں بھی یہ وہیں سے آیا اور ادھر کے اثرات کے ساتھ آیا۔البتہ یہاں کے کاریگروں نے اس میں کچھ بدلاؤ بھی کیے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دھاتوں پر قلعی کا فن ہندوستان اور کشمیر میں ایران سے آیا تھا۔مسلمان کھانا پکانے اور کھانے کے لئے تانبہ کے برتن کا استعمال کرتے ہیں، اس لئے استعمال سے پہلے ان پر قلعی کرنا ضروری ہوتا ہے۔کشمیر میں لوٹے عام طور پر سرخ تانبے کے ہوتے ہیں۔ان پر نقش ونگار اور میناکاری اور قلعی ہوتی ہے۔ان کے دستے پیتل کے اور چینی اژدہے کے سر اور دم کی طرح ہوتے ہیں اور ان پر بنے ہوئے نقش ونگار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان پر ہندو آرٹ کا اثر باقی ہے۔چنانچہ کشمیر کے برتنوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وادی میں تین قدیم تہذیبیں یعنی ایرانی، چینی اور ہندو ایک دوسرے سے گلے ملیں، لیکن ایرانی تہذیب چینی اور ہندو تہذیبوں پر حاوی رہی۔''

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، صفحہ-۳۱۹-۳۲۰)

برتنوں اور دوسری استعمال کی اشیاء پر پڑنے والے اثرات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ صوفیہ نے وادی کی تہذیب پر کتنا گہرا اثر ڈالا۔ پروفیسر شمس الدین نے اپنے ایک وسط ایشیائی سفر کا ذکر اپنی کتاب 'خواجہ نقشبند اور طریقت نقشبندیہ' میں کیا ہے۔ انھوں نے اس سفر میں ان اشیاء استعمال کا بھی جائزہ لیا جو اس علاقے میں لوگوں کے استعمال میں صدیوں سے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ بالکل ایسی ہی چیزیں کشمیر میں بھی مستعمل ہیں۔ لباس اور برتن خاص طور پر ایرانی اور وسط ایشیائی انداز کے ہیں۔ یہ تمام اثرات صوفیہ کے ہیں جو ان کی تعلیمات اور عمل کے ذریعے عوام میں رائج ہوئے۔

لباس پر صوفیوں کے اثرات:

کشمیر میں جو لباس پہنا جاتا ہے وہ وہی ہے جو ایران اور وسط ایشیا میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ وادی میں یہ صوفیوں کے ذریعے پہنچا اور پھر یہاں کا روایتی لباس ختم ہوگیا۔ اب یہاں کا ہر طبقہ اسی کو استعمال کر رہا ہے، مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی اسی لباس کو پہن رہے ہیں۔ موجودہ دور میں انگریزی لباس کا رواج وادی میں بھی ہوا ہے مگر اب بھی پرانا اور روایتی لباس باقی ہے۔ یہ لباس عہد قدیم سے جاری ہے اور آج بھی اس میں بہت زیادہ بدلاؤ نہیں آیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''اونچے طبقے کا لباس وہی تھا جو عرب، ایران اور ترکستان کے دولت مند لوگوں کا تھا۔ شاید سلطان قطب الدین کے دور حکومت میں سید علی ہمدانی نے اس لباس کو رائج کیا اور سلطان سکندر کے زمانہ تک تو برہمنوں نے بھی اس کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ جسم کا نچلا حصہ ایرانی طرز کے چوڑے پائجامے (سراول) سے ڈھانپا جاتا، اوپر کے حصہ پر پوری آستین کی قمیص ہوتی اور قمیص کے اوپر چھوٹی سی صدری ہوتی، اوپر کے کپڑے کو چغہ کہتے، جو کہ ٹخنوں تک لٹکتا رہتا، چغہ میں لمبی اور ڈھیلی آستینیں ہوتی اور

کمر کے گرد کمر بند ہوتا، سر پر چست ٹوپی ہوتی جس پر کپڑا لگا ہوتا جو عمامہ کا کام کرتا۔ قاضی اور علماء سیاہ رنگ کا عمامہ پہنتے۔ تقریبوں میں ریشمی لباس پہنے جاتے اور سلاطین اپنے درباریوں کو ریشمی کپڑوں کی خلعت دیتے تھے۔ سلاطین اور امراء زیور بھی پہنتے تھے۔

بیرونی اثرات کے باوجود نچلے طبقے کا جو لباس ہے اس میں ازمنہ وسطیٰ سے تبدیلی نہیں پیدا ہوئی ہے۔ مرد منڈے ہوئے سر پر چست ٹوپی پہنتے، وہ جانگھیا نہیں پہنتے ۔ بلکہ ایک لمبا ڈھیلا ڈھالا اونی کرتا پہنتے جس کو پھیرن کہتے۔ یہ فارسی لفظ پیرہن کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ یہ گردن سے کمر تک کھلا اور ٹخنوں تک لٹکتا رہتا ہے اور کمر کے گرد پٹی کسی ہوتی، جوتے گھاس کے بنائے جاتے ۔ عورتوں کا لباس بھی وہی تھا۔ اس کے علاوہ سر بند بھی استعمال کرتیں اور اس کے اوپر ایک سیاہ دوپٹہ ہوتا جو سر سے کندھے اور پیروں تک چلا جاتا۔ مسلمان عورتوں کے سر کے لباس کو 'کسابا' اور ہندو عورتوں کے سر کے لباس کو 'ترنگا' کہتے جو ایک ٹوپی سے بندھا اور پیچھے سے ایڑی تک آتا ہے۔"

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، صفحہ-۲۸۰)

اوپر جس لباس کی تفصیل بتائی گئی وہ عہدِ وسطیٰ کا لباس تھا مگر آج بھی اس میں سے بیشتر باقی ہیں۔ کشمیر کے لباس کی خاص پہچان 'پھیرن' ہے۔ یہ فارسی کے لفظ 'پیرہن' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس لباس کو وادی میں رائج کرنے کا سہرا حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی اور اور ان کے ساتھیوں کو جاتا ہے۔ عوام نے ان صوفیوں کے لباس کو اپنایا اور کئی ایسی تاریخی روایتیں ملتی ہیں کہ صوفیاء نے خود بھی ہندوانہ لباس سے منع کیا۔ حضرت میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے والد کی وصیت کے مطابق کشمیر آئے اور بادشاہ کو ہندوانہ لباس پہنے دیکھا تو منع کیا۔ اس واقعے کا ذکر بعض کتابوں میں ملتا ہے۔

کھانا اور مشروبات:

کشمیر کی خاص غذا چاول ہے، کیونکہ اس کی پیداوار یہاں زیادہ ہوتی ہے۔ چاول کھانے کا رواج یہاں عہد قدیم سے چلا آرہا ہے یہاں لوگ چاول کو ابال کر یا صبح کو باسی کھاتے تھے، مگر صوفیہ کے اثر سے ایرانی کھانے کا رواج یہاں عام ہوا اور ایرانی انداز میں اسے پکایا جانے لگا۔

"ایرانی اثرات کے تحت مختلف قسم کے پلاؤ مثلاً زرد پلاؤ، ترش پلاؤ اور شیلا پلاؤ پکتا تھا۔ غریبوں اور دنیا سے کنارہ کش لوگوں کے لئے جو کا سادہ مناسب سمجھا جاتا۔ گوشت، مچھلی، انڈے اور سبزیاں قدیم زمانہ سے کشمیری کھانوں کا خاص جزو رہی ہیں اور مسلمانوں کے عہد میں انکی اہمیت قائم رہی۔ اسلام سے پہلے سور کا گوشت ہندوؤں میں عام طور سے کھایا جاتا تھا لیکن یہ نہیں معلوم کہ سلاطین کے عہد میں بھی کھایا جاتا تھا کہ نہیں۔ مرغ، بھیڑ، بکری اور مختلف چڑیوں کے گوشت عام طور پر کھائے جاتے تھے۔ گھوڑے کا گوشت بھی رغبت سے کھایا جاتا۔ گائے کا گوشت کھانے کا رواج مسلمانوں کی حکومت کے بعد شروع ہوا۔"

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، صفحہ-۲۸۱)

گائے کا گوشت کشمیر میں اب نہیں کھایا جاتا کیونکہ اس پر حکومت کی طرف سے پابندی عائد ہے مگر مسلم عہد حکومت میں اس کا رواج تھا۔ اس وقت بھیڑ، بکروں کا گوشت عام طور پر مقبول ہے۔ مرغ و ماہی بھی کھائے جاتے ہیں، مگر ایرانی اثرات کا ان کھانوں اور مشروبات کے ناموں سے پتہ چلتا ہے۔ کھانے، پینے کی چیزوں کے نام آج بھی فارسی میں ہیں، مثلاً 'گوشتابہ' ایک قدیم ایرانی ڈش ہے، جو کشمیر میں بھی بنائی جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف قسم کے پلاؤ اور بریانی نیز سالن ایرانی اثرات سے دور نہیں۔ کئی قسم کے ایرانی شربت بھی کشمیر میں بنائے جاتے ہیں جو ایرانی اثرات کا پتہ دیتے ہیں۔

کشمیری مصوری:

جس طرح ایرانی اور وسط ایشائی اثرات نے کشمیر کے دیگر شعبۂ زندگی پر اثر ڈالا اسی طرح مصوری پر بھی ڈالا۔ اکبر اور دوسرے مغل حکمرانوں کے درباروں میں بھی کئی کشمیری مصور تھے۔ ان مصوروں کی تصویروں میں بھی ایرانی اور وسط ایشیائی اثرات نظر آتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ انھوں نے صرف نقل اتار دی بلکہ انھوں نے کچھ جدت طرازی بھی کی۔ نفاست اور نزاکت ان تصویروں کی خصوصیت ہے۔ بعد میں کشمیری مصوروں نے مغل انداز کو بھی اپنایا اور اس میں بھی کچھ نئے تجربات کئے، لیکن اسی کے ساتھ مغل مصوروں نے بھی کشمیری انداز سے استفادہ کیا۔ کشمیری مصوری آج بھی اپنی گونا گوں خصوصیات کے سبب مشہور ہے۔

خطاطی:

کشمیر میں خطاطی کو ایک نئی زندگی ملی اور اس فن نے عروج کی منزلیں طے کیں۔ یہ فن صوفیہ کے ذریعے کشمیر میں داخل ہوا اور بعد میں کئی صوفیہ نے جو کہ اس فن کے ماہر تھے اسے پھیلانے میں مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ (صوفیہ کے تذکروں میں ان کے خطاط ہونے کا ذکر کر دیا گیا) یہاں کے بادشاہوں نے بھی اس کی سرپرستی کی۔ کئی خطاط اتنے مشہور ہوئے کہ وہ مغل بادشاہوں کی سرپرستی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور انھیں بادشاہوں نے خطابات سے نوازا۔ چک عہد کا مشہور خطاط محمد حسین تھا جو بعد میں مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کا ملازم ہوا اور بادشاہ نے اسے شیریں قلم کے خطاب سے نوازا۔

موسیقی:

کشمیر میں جو صوفیہ اور ان کے مریدین ایران و وسط ایشیا سے آئے، ان میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین بھی تھے۔ ان ماہرین میں موسیقی کے ماہر افراد بھی تھے۔ عہد سلطنت میں کشمیری سلطانوں کی علوم وفنون سے دلچسپی دیکھ کر بھی ماہرین فن نے ادھر کا رخ کیا۔ فن موسیقی کے لئے

زین العابدین بڈشاہ کا دور بہت سازگار تھا۔ بادشاہ خود موسیقی میں مہارت رکھتا تھا۔اس کے خاندان کے دیگر افراد اور کئی درباری بھی موسیقی کے ماہر تھے۔بادشاہ کو موسیقی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ آلات موسیقی کو سونے سے منڈھواتا تھا۔اس کی شہرت سن کر خراسان اور ایران کے علاقوں سے موسیقار کشمیر آئے۔اس طرح کشمیر کی موسیقی میں جہاں نئے نئے تجربے ہوئے وہیں بیرونی عناصر بھی شامل ہوئے۔بعض مورخوں کے مطابق بڈشاہ نے خود ایک راگ ایجاد کیا تھا۔ طبقاتِ اکبری کے مطابق 'سلطان زین العابدین ہر قسم کے علوم وفنون کا سرپرست تھا۔علم موسیقی میں وہ بڑا ماہر تھا، محمد الدین فوق لکھتے ہیں:

''بادشاہ موسیقی کا اس قدر دلدادہ تھا اور اس سے قدر مسحور ہو چکا تھا کہ جب کبھی وہ مطربوں سے خوش ہوتا تو ان کو بیش قیمت انعام واکرام دیتا اور ان میں جو زیادہ ماہر ہوتے ان کو درباری گویا مقرر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔لکھا ہے کہ مطربوں سے خوش ہو کر اس نے کئی مرتبہ ان کے آلات موسیقی سونے سے آراستہ کرادیئے،اور ان کو زر سے لبریز کرادیا۔صاحبِ وجیز التواریخ نے بھی بادشاہ کی سرود افزائی کا ذیل کے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔سلطان کو ساز وسرود سے بھی بہت رغبت تھی اور اس فن کو بھی خوب جانتا تھا اور راگ کی ماہیت کو خوب سمجھتا تھا۔ملا عودی اور ملا جمیل کہ علم موسیقی میں صاحبِ تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے بانی تھے،اس نے خراسان سے بلوائے اور انعامات سے سرفراز کیا۔''

(شبابِ کشمیر، صفحہ-۱۷۷)

یہ تو ایک بادشاہ کی موسیقی نوازی تھی، مگر ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ یہاں کی موسیقی پر صوفیانہ اثرات بھی کافی گہرے پڑے۔بادشاہوں کی سرپرستی تو صرف ان کے دور حکومت تک محدود ہوتی تھی مگر صوفیہ نے موسیقی کو ایک تقدس کا مقام عطا کیا۔اسلام کے علماء کا بڑا طبقہ موسیقی کو حرام قرار دیا تھا مگر اس کے باوجود صوفیہ موسیقی کو روحانی لذت کے حصول کا ذریعہ سمجھتے رہے اور

علماء کی مخالفت کے باوجود وہ سماع کی محفلیں منعقد کرتے رہے۔ کشمیر کے بیشتر صوفیہ بھی سماع کے قائل تھے اور ان کی خانقاہوں میں محفلیں ہوتی رہتی تھیں۔ شاہ ہمدان سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ بھی صوفیہ کی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، جو سماع کی قائل تھی۔ ظاہر ہے جب وہ خود سماع کے قائل تھے تو موسیقی کے ماہرین بھی ان کے ساتھ کشمیر آئے ہونگے۔ ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ سماع کے قائل نہیں تھے لہٰذا انھوں نے حکومت سے موسیقی پر پابندی کی سفارش کی تھی اور سکندر بت شکن کے عہد میں ہر قسم کے ساز پر پابندی تھی۔ صرف فوجی باجے ہی بج سکتے تھے، لیکن دوسرے صوفیہ سماع کو پسند کرتے تھے اور خانقاہوں میں ایک الگ قسم کی موسیقی پروان چڑھی، جسے 'صوفیہ کلام' کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کشمیر کی صوفی موسیقی ہے۔ اس موسیقی میں صرف صوفیانہ کلام ہی گائے جاتے ہیں اور اس کلام کی خاص مقبولیت بھی ہر دور میں رہی ہے۔ صوفیہ کے آستانوں پر پروان چڑھنے والی یہ موسیقی ہی کشمیر کی کلاسیکی موسیقی مانی جاتی ہے۔ اس بارے میں پروفیسر محبّ الحسن لکھتے ہیں:

> ''کشمیر کی کلاسیکی موسیقی 'صوفیہ کلام' کے نام سے مشہور ہے، جو فارسی موسیقی سے مستعار ہے۔ اس میں ۵۴ سُر ہیں، جن میں سے کچھ تو ہندستانی راگوں کی طرح ہیں اور ان کے نام بھی ہندستانی ہیں، جیسے بھیرویں، للت اور کلیان اور دوسروں کے نام ایرانی نام ہیں، جیسے اصفہانی، دوگانہ، پنج گاہ، عراق، راست فارسی اور سہ گاہ۔ جن تالوں کا عام رواج ہے، وہ سہ تال، نیم روز، دور خفیف اور ترکی ضرب ہیں۔ یہ تال ہندستانی تالوں سے مختلف ہیں۔ ان کے بول بھی مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ ہندستانی کلاسیکی موسیقی کے برخلاف صوفیانہ کلام کورس میں گایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کشمیری موسیقی اپنا جواب نہیں رکھتی۔''

(کشمیر سلاطین کے عہد میں، ۳۲۹)

تاریخی حوالوں سے ایسا لگتا ہے کہ کشمیری صوفیہ کی خانقاہوں میں ہندستانی اور ایرانی

موسیقی کو ملا کر ایک ایسی موسیقی کی تخلیق کا تجربہ کیا گیا جو اپنی گونا گوں خوبیوں کے لئے آج بھی بے مثال ہے۔ یہی موسیقی آج کشمیر کی پہچان ہے اور اسی کو یہاں کی کلاسیکی موسیقی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہاں راگ، راگنیوں کے نام فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں ملتے ہیں۔ ابوالفضل کے حوالے سے محمد الدین فوق لکھتے ہیں:

''ایرانی راگنیاں جو کشمیر کے سازندوں اور مطربوں نے اختیار کرلیں، حسب ذیل بتائی جاتی ہیں۔ ساگا، راست کشمیری راست، چراغ، عراق، نوا، ریحانی، شاہ نواز، نوروز نے روز اور زنگور۔''

(شبابِ کشمیر، صفحہ-۱۷۷)

غرضیکہ صوفیہ کے ذریعے جو موسیقی ترتیب پائی وہ ان کے نظریات اور خیالات کی طرح لاجواب تھی۔ انھوں نے اس خطے کو صرف علم وادب اور صنعت وحرفت ہی نہیں دیا بلکہ فنونِ لطیفہ سے بھی نوازا۔

فن تعمیر:

کشمیر میں صوفیہ نے جس طرح دیگر شعبہ ہائے حیات کو متاثر کیا اسی طرح فن تعمیر کو بھی متاثر کیا۔ یہاں پہلے سے لکڑی کی عمارتوں کا رواج تھا مگر صوفیہ کی تحریک کے بعد اس میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان کی خانقاہیں تعمیر ہوئیں اور مسجدیں بھی تعمیر کی گئیں۔ بعض صوفیہ کے مقبرے بنائے گئے۔ بادشاہوں نے اپنے مزاج کے مطابق محلات، مساجد ومقابر کی تعمیر کیں۔ کشمیر میں صوفیہ کی آمد سے قبل دوسرے مذاہب کی عبادت گاہیں تھیں، مگر ان کی تعمیر کا انداز مساجد کے لئے مناسب نہیں تھا۔ مسجدوں میں اجتماعی عبادت کی جاتی ہے لہٰذا یہاں بڑی بڑی عمارتوں کی ضرورت تھی، جن میں زیادہ سے زیادہ لوگ سما سکیں، اسی طرح خانقاہوں کے لئے بھی بڑی عمارتوں کی ضرورت تھی جہاں کثیر تعداد میں مریدین کا اجتماع ہو سکے۔ ان تمام ضرورتوں کے پیش نظر بڑی عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی۔ ان عمارتوں کی تعمیر خواہ جیسی ہو مگر ان پر ہونے والے نقش

ونگار ایرانی اور وسط ایشیائی طرز کے تھے، جو صوفیہ کے ساتھ ہی کشمیر میں آئے تھے۔ اس وقت کشمیر میں 'خانقاہِ معلیٰ' اور 'ہمدانی مسجد' سمیت کئی دوسری عمارتیں اپنی طرز تعمیر کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ان عمارتوں میں ایرانی اور وسط ایشیائی انداز بہت واضح ہے۔ اسی طرح کچھ دوسری عمارتیں بھی اپنی طرز تعمیر میں انفرادیت رکھتی ہیں۔

کشمیر ایک ایسا خطہ زمین ہے جسکی ہر چیز پر کسی نہ کسی روپ میں صوفیہ کی جھلک مل جاتی ہے۔ صوفیہ نے اس علاقے کو جتنا متاثر کیا کسی دوسرے علاقے کو نہیں کیا۔ انھوں نے یہاں ہمہ جہتی اثرات ڈالے جو آج بھی نظر آتے ہیں۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں

۲۔ شبابِ کشمیر

۳۔ تاریخِ فرشتہ

۴۔ حضرت خواجہ نقشبند اور طریقت نقشبندیہ

۵۔ آئینِ اکبری

عشق فقیہہ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اقبالؔ

اقبال کے افکار پہ تصوف کے اثرات

عالمی شہرت یافتہ شاعر و فلسفی علامہ اقبال کا تعلق ایک کشمیری برہمن خاندان سے تھا، جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے آباء و اجداد کشمیر سے سیالکوٹ آ کر بس گئے تھے اور یہیں ۱۸۷۳ء میں اقبال کی پیدائش ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مشن اسکول میں پائی اور پھر کالج میں داخل ہو گئے۔ عربی، اردو اور فارسی کی تعلیم مولوی میر حسن سے حاصل کی۔ اقبال کو فلسفہ سے خاص لگاؤ تھا لہٰذا انگلینڈ کی کیمبرج یونیورسیٹی پہنچ کر انھوں نے فلسفے کی پڑھائی کی۔ لندن یونیورسیٹی میں چھ مہینے تک عربی کا درس بھی دیا اور یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کرنے کا موقع انھیں ملا۔ انھوں نے ایرانی فلسفے پر ایک کتاب تحریر کی جس پر جرمنی کی ایک یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ اقبال ۱۸۸۰ء میں یورپ سے بھارت لوٹے اور لگ بھگ ڈھائی سال تک کالج میں پڑھانے کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ کالج چھوڑنے کے بعد ان کی توجہ بیرسٹری کی طرف گئی۔

شاعری کی ابتدا:

اقبالؔ ابھی اسکول میں زیر تعلیم تھے کہ ان کے اصلی جوہر چمکنے لگے اور طبیعت خود بخود شاعری کی طرف راغب ہونے لگی۔ ابتدائی کلام داغؔ دہلوی کو اصلاح کی غرض سے بھیجا کرتے تھے۔ شاگردی کا یہ سلسلہ بذریعہ ڈاک جاری رہا۔ اردو اور فارسی شاعری کے خمیر میں صوفیانہ عناصر شامل ہیں، لہٰذا ان کا مطالعہ کرنے والا خود بخود اثر میں آجاتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری پر بھی صوفیانہ اثرات ابتدا ہی سے آ گئے تھے۔ وہ مولانا جلال الدین رومی کو بے حد پسند کرتے تھے۔ رومؔی کے علاوہ بھی انھوں نے دیگر فارسی کے شاعروں کو پڑھا تھا لہٰذا تصوف کے اثرات ان کی شاعری پر بہت نمایاں ہوئے۔

جب لاہور کے گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم تھے تو مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ عمر تو محض ۲۳ رسال تھی مگر افکار و خیالات اتنے بلند تھے کہ اساتذہ شعراء کی نظریں آپ پر پڑنے لگیں۔ ایک مشاعرے میں جب یہ شعر پڑھا

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے

قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

تو اس دور کے بزرگ شاعر مرزا ارشد گارگونی تڑپ اٹھے اور کہنے لگے میاں صاحبزادے! سبحان اللہ، اس عمر میں یہ شعر۔

اقبالؔ کی شہرت:

اقبالؔ ابھی کالج میں تھے کہ ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی تھی۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں آپ شریک ہونے لگے تھے۔ ۱۸۹۹ء کے جلسے میں آپ نے 'نالۂ یتیم' پڑھی تو سامعین کی آنکھیں بھیگ گئیں، پھر 'ہمالہ' اور 'ہندستاں ہمارا' جیسی قومی نظمیں آپ نے پڑھیں اور حاضرین نے پسند کیا۔ انھیں دنوں آپ کا کلام ماہانہ 'مخزن' لاہور میں شائع ہونے لگا تھا۔ یورپ سے واپسی کے بعد کچھ دن تک انھوں نے اردو میں شاعری کی پھر فارسی کی جانب متوجہ ہو گئے اور پوری

زندگی فارسی میں شاعری کرتے رہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں پھر وہ اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ فارسی کے ذریعے اپنے افکار کو دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ انھیں فارسی زبان شاعری کے لئے زیادہ موزوں بھی لگتی تھی اور اب ان کی شاعری کا جو انداز تھا اس کے لئے یہ زبان مناسب تھی۔

اقبالؔ اور تصوف:

اقبالؔ نے یورپ سے واپسی کے بعد نظم 'شکوہ' لکھی جو بے حد مشہور ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب اٹلی نے ترکی سے ترابلس چھین لیا تھا۔ اسی دوران بلقان کی عیسائی ریاستوں نے بھی ترکی سے بغاوت کردی تھی۔ ان واقعات وحالات نے اقبالؔ کے ذہن ودل کو جھنجھوڑ ڈالا تھا اور نتیجہ کے طور پر ایک درد بھرا نغمہ شاعر کے لب پر جاری ہوگیا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں جب یہ نظم پڑھی گئی تو محفل میں آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ سنائی نہ پڑتا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑی تو انھوں نے فارسی میں 'اسرار خودی' تحریر کی۔ اس نظم میں انھوں نے عزلت وگوشہ نشینی کی مخالفت کرتے ہوئے حرکت اور عمل کی ترغیب دی نیز زندگی کو زندہ دلی کے ساتھ جینے کا پیغام دیا۔ اقبالؔ کے ان خیالات سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اقبالؔ تصوف کے مخالف ہیں، حالانکہ ایسا بالکل نہیں تھا۔ وہ نہ صرف صوفیانہ خیالات کے علمبردار تھے جس کا ثبوت ان کی شاعری میں بکھرا پڑا ہے بلکہ وہ خود کو مولانا رومیؔ جیسے صوفی کا روحانی مرید بتاتے ہیں۔ اقبالؔ کا خاندان صوفیہ کے اثر سے ہی اسلام کے سائے میں آیا تھا لہٰذا تصوف کے اثرات سے ان کا دور رہنا قرینِ قیاس نہیں۔ صوفی اور تصوف کے تعلق سے ان کے خیالات کا اندازہ ان کے اشعار سے ہوتا ہے ؎

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ فرما نازنینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انھیں خلوت گزینوں میں

اقبالؔ نے نہ صرف صوفیانہ خیالات اپنی شاعری میں پیش کئے ہیں بلکہ وہ خود بھی صوفیاء کے ارادت مند نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تصوف میں رہبانیت کی آمیزش اور تصوف کے نام پر بے عملی کی مخالفت کی ہے۔ اقبالؔ نے کئی جگہ صوفیانہ لب ولہجہ اختیار کیا اور ان کے یہاں بھی صوفیانہ عقائد کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

آخری شعر کو دوبارا پڑھئے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے سامنے راہِ طریقت ہے مگر اسی کے ساتھ وہ شریعت کا بھی لحاظ رکھتے ہیں، کیونکہ صوفیہ شریعت کو جسم اور طریقت کو اس کی روح سمجھتے ہیں۔ اقبالؔ تصوف کے اتنے بڑے حامی ہیں کہ ان کے دور میں جو صوفیانہ روایتیں کمزور پڑنے لگی تھیں، اس پر بھی وہ طنز کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ کہتے ہیں۔

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

مرید سادہ تو رورو کہ ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق
کچھ ایسا ہی طنز ان کا شیخ حرم پر بھی ہے۔
یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر ودلقِ اویس و چادر زہرا

اقبالؔ کا تصوف:

دراصل اقبالؔ تصوف کو اس کی ابتدائی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں، جہاں فقر وفاقہ ہے مگر اسی کے ساتھ شہنشاہی بھی اس فقر کے قدموں کی دھول بنتی ہے۔ خود رسول اکرم ﷺ کی زندگی بھی انھیں کیفیات سے عبارت تھی۔ اقبالؔ بندۂ مومن کو بھی انھیں اوصاف کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
عطارؔ ہو، رومیؔ ہو، رازیؔ ہو، غزالیؔ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
نہ تخت تاج میں نہ لشکر وسپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے
فقر کے ہیں معجزات، تاج وسریر وسپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکی عقل وخرد

فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب ونگاہ
علم فقیہ و کلیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
علم کا موجود اور، فقر کا موجود اور
اشہد ان لا الہ اشہد ان لا الہ

اقبالؔ تصوف کے پرجوش حامی ہیں، لیکن وہ تصوف کا بے روح جسم نہیں چاہتے۔ وہ صوفیہ کے اس دور کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں، جہاں صوفی کے ساتھ روشن ضمیری بھی ہوا کرتی تھی۔

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب ونظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

اقبالؔ صوفیہ کے فغانِ صبح گاہی کو تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان کی توجہ ہر جگہ سے سمٹ کر فقط اللہ کی طرف مبذول ہونی چاہئے تب اس کے اندر روحانی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ وبو میں
خرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ہو میں

عشق اور اقبال:

عشق تصوف کی بنیاد ہے اور اقبال اسے مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرودِ انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اقبال ورومی:

اقبال نے فلسفہ کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھا تھا اور ان کی نظر دنیا کے فلسفیوں، شاعروں اور عالموں کے علمی ذخیروں پر بھی تھی۔ انھوں نے جس طرح مغرب کے فلسفیوں اور اہل علم کو پڑھا تھا، اسی طرح مشرق کے اربابِ فکر ونظر کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ انھیں جس شخص کے نظریات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا جلال الدین رومی تھے۔ رومی اپنے دور کے عالمِ باعمل اور صوفئ بے بدل ہیں۔ اقبال کے افکار وخیالات پر رومی کے افکار وخیالات کا بہت زیادہ اثر ہے، لیکن رومی کی اصل شناخت تب قائم ہوئی جب ان کی ملاقات شمس تبریزی سے ہوئی۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

یعنی جس رومی کو دنیا نے سر اور آنکھوں پہ بٹھایا وہ صوفی رومی تھا۔ وہ صوفی جو فقر،

غیرت، فعالیت، ترقی اور تعلیماتِ قرآنی کا حامی تھا۔ اقبالؔ کی نظر میں اصل تصوف یہی ہے۔ وہ منفی تصوف کے قائل نہیں، جو فقر تو ہے مگر اسی کے ساتھ ناداری، آرام طلبی، بے کاری، سستی اور بے توجہی بھی ہے۔ رومیؔ کی طرح اقبالؔ بھی انسان کو مجبور اور بے دست و پا نہیں سمجھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان حرکت و عمل اور جدوجہد میں آزاد ہے، البتہ بعض مسائل میں وہ مجبور اور پابند ہے۔ اقبالؔ، رومیؔ کو بے حد احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اچھے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ وہ کئی جگہ انھیں پیر رومیؔ اور خود کو مرید ہندی کہتے ہیں۔ ایک نظم 'پیر و مرشد' ہے، جس میں 'پیر' مولانا روم ہیں اور مرید علامہ اقبال۔ مولانا روم جیسے صوفی نے اقبال کو نہ صرف اپنے نظریات سے متاثر کیا بلکہ فن میں بھی متاثر کیا۔ اقبال کی بیشتر معروف مثنویاں مولانا کی پسندیدہ بحر، بحر رمل مسدس محذوف میں ہیں۔ اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، بندگی نامہ، جاوید نامہ، مثنوی مسافر اور پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، ان سبھی مثنویوں میں اقبال مولانا کے آہنگ سے بہت نزدیک نظر آتے ہیں۔

روحِ رومیؔ پردہ ہا را بر درید
ازپس کہ پارۂ آمد پدید

الغرض اقبالؔ کے افکار و نظریات پر تصوف کے اثرات بہت نمایاں ہیں، البتہ وہ تصوف کے نام پر رہبانیت، سستی، بے کاری اور آرام طلبی کے خلاف ہیں۔ صوفیانہ نظریات ان کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں اور صوفیاء کا مقام و مرتبہ بھی ان کی شاعری میں بہت بلند نظر آتا ہے۔

اے امامِ عاشقانِ درد مند
یاددارم ازتو ایں حرفِ بلند
خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
ازکجا می آید ایں آواز دوست

قوت ایمانیہ کے ساتھ کسی چیز کو اپنے سامنے دیکھنا یقین کہلاتا ہے۔

(قشیری)

آنی وفانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

اقبالؔ

کشمیری برہمن شعراء کے کلام میں رنگِ تصوف

کشمیری برہمن ہر دور میں حکومت کے اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ تھے لہٰذا پورے ملک میں پھیل گئے اور مختلف پیشوں سے جڑ گئے۔ وہ جہاں بھی رہے اپنی علمی قابلیت کی بنیاد پر نمایاں حیثیت کے مالک رہے۔ انھوں نے ہر جگہ تعلیم کو ترجیح دی اور اسی بنیاد پر انھوں نے منفرد مقام بنایا۔ کشمیر میں چونکہ ہر طرف تصوف کا دور دورہ تھا لہٰذا کشمیری برہمن بھی خود کو اس کے اثر سے دور نہ رکھ سکے اور وہ جہاں بھی گئے اسے ساتھ لیتے گئے۔ ان کی اولاد پر بھی اس کے اثرات ہوئے، یہاں تک کہ جن کی پیدائش وادی سے باہر ہوئی اور جنھوں نے کبھی وادی کشمیر دیکھا بھی نہیں ان پر بھی تصوف کے اثرات نظر آئے۔ اگر انھوں نے شاعری کی تو ان کا کلام بھی عشق و عرفان میں ڈوبا نظر آیا۔ کشمیری برہمن شاعروں کے ہاں تصوف کا رنگ بہت نمایاں ملتا ہے۔ ایسے شعراء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہاں چند شاعروں

کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

برہمنؔ:

چندر بھان برہمنؔ فارسی کا پہلا صاحبِ دیوان ہندو شاعر تھا۔ اسی کے ساتھ وہ اردو کا بھی پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ عام طور پر ولیؔ دکنی کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر سمجھا جاتا ہے، لیکن ولی کی پیدائش، برہمنؔ کی موت کے چند سال بعد ہوئی تھی۔ برہمنؔ مغل حکمراں شاہجہاں کا میر منشی یا وزیر اعظم تھا۔ وہ شہزادہ داراشکوہ کا اتالیق بھی تھا اور عہد شاہجہانی میں نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ اس دور کے تذکرہ نگار برہمن کا تذکرہ بے حد احترام سے کرتے ہیں۔ وہ اسے سلیم الطبع، صوفی مشرب اور صلح کلی ہندو قرار دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ فارسی اور سنسکرت کا زبردست عالم اور بے مثال نثر نگار و شاعر بھی تھا۔ برہمنؔ کی تحریریں تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کی شخصیت پر بھی گہرے صوفیانہ اثرات تھے۔ مورخین کے مطابق اس کی طبیعت میں سوز و گداز تھا، جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں تر رہتی تھیں۔ وہ پریشان حال لوگوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہزادہ داراشکوہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس کی شاعری کو پسند کرتا تھا۔ اس کی چند کتابوں کا ذکر تاریخی کتابوں میں ملتا ہے، جن میں سے بعض کے نام ہی صوفیانہ قسم کے ہیں۔ جیسے مجموعۃ الفقراء اور تحفۃ الانوار وغیرہ۔

برہمنؔ نے غزلیات، رباعیات اور قطعات کہیں۔ اس کا پورا کلام اسلامی تخیل اور صوفیانہ رنگ سے مزین ہے۔ عشق کی واردات، محبت کی کیفیات اور تصوف کی منازل کا ذکر برہمنؔ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ کئی جگہ وہ امیر خسروؔ کا ہم مزاج نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے؎

بانیٔ خانہ و بت خانہ و مئے خانہ یکیست
خانہ بسیار و لے صاحبِ ہر خانہ یکیست

برہمنؔ کا ایک اور شعر کچھ تذکروں میں ملتا ہے

مراد لے است بکفر آشنا کہ چندیں بار

بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد منش صوفیوں جیسے برہمن کے خیالات تھے اور یہی رنگ اس کی شاعری پر بھی چڑھا ہوا تھا۔ عہد شاہجہانی کی ایک مستند تاریخ ''عمل صالح'' میں لکھا ہے کہ 'اگر چہ وہ صورت سے ہندو ہے مگر اسلام میں دم مارتا ہے'۔ ایک محقق کے مطابق 'دیوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ برہمن فارسی و اسلامی تخیل میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق کی کیفیات، محبت کی صعوبتیں، تصوف کی منزلیں، وحدت الوجود کے مراحل، برہمن کے کلام میں اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح باقی شعراء کے کلام میں۔

برہمن اگر چہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے مگر اس کا اردو کلام بہت کم دستیاب ہو سکا ہے۔ جو اشعار مل سکے ہیں، ان میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کا فرق واضح نہیں، جیسے

یہ نہ جانو کہ مری آنکھ سے آنسو ٹپکا

نشتر عشق لگا ہے تو یہ لوہو ٹپکا

ہم ہیں جو تیرے عشق کو سمجھے ہیں زندگی

اے حسن یار دیکھ لے پہچان لے ہمیں

نسیم :

پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام اردو کے معروف شعراء میں سر فہرست ہے۔ ان کا تعلق کشمیر سے ترک وطن کر کے لکھنو میں بس جانے والے ایک ایسے خاندان سے تھا جس میں علم وفن کا چرچا تھا۔ نسیم ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے اور صرف ۳۲ رسال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ مگر ان کا نام مثنوی 'گلزار نسیم' کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا۔ یہ مثنوی اردو زبان کی شاہکار ہے اور اس میں قصہ گل بکاؤلی کو منظوم شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ مثنوی کے علاوہ نسیم نے غزلیں بھی کہیں۔ اگر چہ انھوں نے میدان تصوف کو اپنی جولان گاہ نہیں بنایا مگر ان کے کلام میں تصوف کی

جھلکیاں ملتی ہیں۔ان کے اشعار دیکھیں۔

روحِ روانِ جسم کی حالت میں کیا کہوں
جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

اس شعر میں جسم کی بے ثباتی پیش کی گئی ہے۔صوفیہ کے ہاں علائقِ دنیا سے کنارہ کشی کا تصور ایسے ہی خیالات کی وجہ سے ہے۔وہ دوسری جگہ کہتے ہیں

جب نہ جیتے جی کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

کیفیؔ:

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے تصوف کے مضامین کو خاص طور پر اپنے کلام میں جگہ دی۔کیفیؔ کا خاندان مغل بادشاہ فرخ سیر کے زمانے میں کشمیر چھوڑ کر دلی آبسا اور یہیں ۱۸۶۶ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ان کے آباء واجداد حکومت کے اہم ترین عہدوں پر فائز رہے۔کیفیؔ نے روایتی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بھی حاصل کئے اور فارسی و سنسکرت پر عبور حاصل کیا۔ان دونوں زبانوں کے خزانوں سے انھوں نے اکتساب فیض کیا اور شاید یہی سبب رہا کہ تصوف اور وحدانیت کا رنگ ان کی شاعری پر چڑھ گیا۔عام طور پر ان کی شاعری میں روحانی، اخلاقی اور ناصحانہ مضامین ملتے ہیں۔ان میں روحانی رنگ تمام رنگوں پر غالب ہے۔ان کا انداز ملاحظہ ہو

وہ جلوہ ہو عیاں دیر و حرم کیا ذرے ذرے میں
جو تیری ذات ہی اک پردۂ حائل نہ بن جائے
کبھی بحر محبت سے نہ بیڑا پار ہو اس کا
فرازِ موج طوفاں ہی جسے ساحل نہ بن جائے

جو ازخود رفتہ راہِ عشق میں ہیں ہو نہیں سکتا
کہ منزل ان کے حق میں دوریٔ منزل نہ بن جائے
تمہیں ہو رازدارِ عشق بس اب چپ رہو کیفی
فسانہ اک جہاں کا وارداتِ دل نہ بن جائے

کیفی کے ہاں حسن حقیقی کی جلوہ سامانیاں ملتی ہیں اور وہ حظ نفس و عشق مجازی سے گریزاں ہیں۔ عشق حقیقی ان کا سرمایہ ہے اور وہ اسی میں وارفتہ نظر آتے ہیں۔ وہ اس وارفتگی میں اس منزل تک جا پہنچتے ہیں، جہاں عاشق و معشوق کی تمیز مٹ جاتی ہے ؂

رفتہ رفتہ مٹ گئی معشوق و عاشق کی تمیز
عشق کی سب مشکلیں اس طرح آساں ہو گئیں
جلوہ بے پردہ تھا فرطِ شوق نے ڈالی نقاب
یہ نگاہیں مضطرب ہو کر پریشاں ہو گئیں
کس قدر رم شیوہ ہیں کیفی ادائیں حسن کی
چھائیں عالم پر کبھی، سینے میں پنہاں ہو گئیں

آزار:

پنڈت تربھون ناتھ زتشی آزار کا خاندان عہد مغلیہ میں کشمیر سے دہلی آبسا تھا۔ یہیں ۱۸۷۱ء میں ان کی پیدائش ہوئی اور لاہور میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ انھوں نے فارسی، اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی مہارت حاصل کی۔ اوائلِ عمری میں شمیم اور پھر آزار تخلص کرنے لگے۔ ایام طالب علمی میں ہی داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے۔ صاف ستھری زبان میں شاعری کی جو دبستانِ داغ کی خصوصیت ہے۔ ابتدا میں داغ کے انداز کو اپنایا مگر بعد میں انفرادی اسلوب اختیار کیا۔ علمی اعتبار سے ان کا مقام بلند تھا۔ مطالعہ وسیع تھا اور اہل علم کی محفلوں میں ان کی حیثیت ایک

تسلیم شدہ مفکر اور دانشور کی تھی۔ صوفیانہ مسائل پر ان کی خاص نظر تھی اور تصوف کی منازل ان کی نگاہوں میں تھیں۔ تصوف کا رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہے ؎

اٹھا جو روئے صنم سے نقاب محمل کا
فلک پہ پھیکا پڑا رنگ ماہِ کامل کا
خلش جگر میں وہ پیکاں کی، درد وہ دل کا
وہ لب پہ آہ وفغاں وہ تڑپنا بسمل کا
ہے دل میں جلوہ فگن اپنے وہ شہ خوباں
بہت بلند ہے رتبہ اس اجڑی محفل کا

چکبستؔ:

پنڈت برج نرائن چکبستؔ کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تھا۔ یہ خاندان لکھنو میں مقیم تھا۔ چکبستؔ کی پیدائش فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔ قدرت نے انھیں زندگی سے بہت کم حصہ عطا کیا مگر انھوں نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا۔ وہ گویا اپنے ہی اس شعر کی تفسیر بن گئے ؎

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگ شباب
اب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

چکبستؔ کے خاندان میں علم وفن کا چرچا تھا لہٰذا اردو شعر سخن سے ان کا لگاؤ فطری تھا۔ انھوں نے پہلے غزلیں کہیں مگر بعد میں رجحان نظم کی طرف ہو گیا۔ ان کی شاعری میں اخلاقی مضامین کی کثرت ہے۔ حب الوطنی کے نغمے بھی ملتے ہیں، اسی طرح کہیں کہیں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے تصوف کو مکمل طور پر شاعری میں جگہ نہیں دی مگر وہ سوالات ان کے ہاں بھی نظر آتے ہیں جو صوفیوں کے ہاں ملتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

اگر کون ومکاں اک شعبدہ تھا اس کی قدرت کا
تو اس دنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا

ان کے اس شعر میں وہ بحث نظر آتی ہے جو صوفیہ کے ہاں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسئلے پر صدیوں تک چلی ہے۔

صوفیہ کے ہاں زندگی سے بیزاری اور اور موت کی طلب گاری کا رجحان رہا ہے، بقول حضرت آسی غازیپوری ؎

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
آج کی رات ہے اس گل سے ملاقات کی رات

چکبست کے ہاں بھی یہ صوفیانہ مضمون ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

ملا:

چکبست کی طرح آنند نارائن ملا بھی اچھے شاعر تھے مگر انھوں نے تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا۔ باوجود اس کے تصوف کے مضامین ان کی شاعری میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ ان کا خاندان بھی کشمیر سے نقل وطن کر کے کلکتہ ہوتے ہوئے لکھنو آیا تھا۔ ملا قانون کے پیشے سے جڑے ہوئے تھے اور فارسی وانگریزی فلسفے پر ان کی گہری نظر تھی۔ اقبال کی شاعری کا مطالعہ کیا تھا، اس لئے جگہ جگہ غیر دانستہ طور پر اقبال کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ نظموں سے ابتدا کی اور پھر غزلوں کی طرف آ گئے۔ یہ غزلیں اگر چہ عاشقانہ ہیں مگر کئی جگہ ان پر تصوف کا رنگ بھی چڑھا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہر اک خواب تمنا نقش باطل ہوتا جاتا ہے
ترا ارماں ہی اب ارماں کا حاصل ہوتا جاتا ہے

یہ ربطِ عشق خود اک حدّ فاصل ہوتا جاتا ہے

جو پردہ اٹھتا جاتا ہے وہ حائل ہوتا جاتا ہے

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ بھی ایسے کشمیری شاعروں کی بڑی تعداد ہے، جنھوں نے کلی یا جزوی طور پر تصوف کے مضامین کو اپنایا۔ ظاہر ہے یہ اسی ماحول کا اثر تھا جس کا غلبہ کشمیر میں دیکھنے کو ملتا ہے اور جس کے تذکرے سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔